

جاسوسی دنیا

21- شاہی نقارہ

22- خون کا دریا

23- قاتل سنگریزے



پیش رس

”شاہی نقارہ“ ملاحظہ فرمائیے۔

کچھ دن ہوئے ایک دوست نے کہا تھا کہ پیش رس میں کتاب کے بارے میں لکھنے کی بجائے اس صفحے پر ”قسمت“ کا حال بتایا کرو۔ کتاب کی اشاعت بھی بڑھ جائے گی۔ میں نے کہا مجھے یہ ”وڈیا“ نہیں آتی۔ کہنے لگے ذہانت کو کام میں لاؤ۔ میں نے کہا نہیں بھائی! میرے بس کاروگ نہیں ہے۔ بولے ”اچھا میں تمہاری رہنمائی کرتا ہوں۔ اعلان کرو کہ اس کتاب پر نظر پڑتے ہی سب سے پہلے جس جانور کا خیال آئے اس کا نام، اپنے نام اور پتے کے ساتھ ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم آپ کو آپ کی آئندہ زندگی کے سارے احوال بتا دیں گے۔“

میں حیرت سے ان کی شکل دیکھتا رہا۔ میری دشواری سمجھ کر زور سے ہنسے اور بولے ”میاں ہر شخص آئندہ زندگی سے متعلق طرح طرح کے ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔ تمہارے بھی کچھ ہوائی قلعے ضرور ہوں گے۔ ان ہی پر نظر رکھتے ہوئے اچھی اچھی پیش گوئیاں کرتے چلے جانا۔ بس ایک تکنیکی نکتہ سمجھ لو۔ وہ یہ کہ کسی کو پانی سے محتاط رہنے کی ہدایت کر دینا اور کسی کو آگ سے۔ کراچی کا باشندہ ہو تو صرف ایک ہی ہدایت کرنا کہ پیدل سڑک پار کرنے کی جرأت کبھی نہ کرے۔ اس طرح تمہاری غیب دانی کی بھی دھاک بیٹھ جائے گی اور صفحہ بھی بھر جائے گا۔“

آپ کی کیا رائے ہے؟

والسلام

ابن صفحہ

کنواری ہرنی

صبح چار بجے سے بارہ بجے تک کی دوڑ دھوپ کے بعد بمشکل تمام ایک ہرنی ہاتھ لگی تھی اور اب وہ اسے ادھیڑ نے میں مشغول ہو گئے تھے۔ نوکروں نے لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگادی اور وہ جلد سے جلد اسے ادھیڑ کر آگ میں ڈال دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس معاملے میں سب کے سب اتناڑی تھے۔ کسی ذبح کئے ہوئے جانور پر سے کھال الگ کرنا آسان کام۔ نہیں ہے اور پھر ایسی صورت میں اور زیادہ دشواری آپڑتی ہے جب کھال کو صحیح و سلامت اتارنے کا مسئلہ درپیش ہو، سرجنٹ حمید نے جو سارا اہتمام دیکھا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ حالانکہ اس نے صبح کو بڑا گہرا ناشتہ کیا تھا۔ مگر جنگل کی دوڑ دھوپ میں اس کی افادیت دو گھنٹے سے زیادہ قائم نہ رہ سکی تھی اور تقریباً دو گھنٹے سے اس کی آنتیں غالب کا ”حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں“ والا شعر یاد کرنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ ان تین دنوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا تھا جس میں اس نے بھوک کی شکایت کی ہو۔ شکار میں یوں بھی تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن جب فریدی جیسے آدمیوں کا ساتھ ہو تو یہ تھوڑی بہت تکلیف مصیبتوں کا پہلا بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ شکار کے سلسلے میں اس کا مقولہ تھا کہ شکار کا مطلب روزمرہ زندگی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ لہذا اگر شکار میں بھی آرام و آسائش برقرار رہے تو پھر فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ اگر شکار میں بھی پکا پکایا کھانا سامنے آ گیا تو پھر جیسے گھر ویسے شکار گاہ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کھانے پینے کی چیزوں میں کافی، چائے شکر، دودھ کے ڈبے اور کچھ دوسرے لوازمات کے علاوہ کسی اور چیز کی اجازت نہیں دی تھی۔ صرف حمید اپنے ساتھ مچھلیوں کے دو تین ڈبے چھپا کر لایا تھا جس میں سے وہ صرف ایک

ہی استعمال کر لیا تھا کہ فریدی کی نظر بڑگی اور اس نے بقیہ کو دریا برد کر دیا اور حمید نے اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا تھا۔ کیونکہ اس میں بھی سر اسراپنا ہی نقصان تھا۔

شکار یوں کی پارٹی آٹھ دس آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں کچھ فریدی کے دوست تھے اور ان کے علاوہ دو تین نوکر۔ وہ اپنے ساتھ دو تین چھوٹی چھوٹی چھولہ اریاں لائے تھے جن کے نیچے رات بسر کی جاتی تھی ورنہ دن بھر تو سر پر کھلا ہوا آسمان ہوتا تھا۔ چونکہ بارش کا زمانہ تھا اس لئے دھوپ تو شاذ و نادر ہی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی ہوا تبدیل ہو جاتی اور اتنا شدید جس ہو جاتا کہ انہیں اپنی قمیض تک اتار بھیجی پڑتی اور یہ سمجھتے کہ اب موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی۔ مگر جب تھوڑی سی بوند باندی کے بعد بادل پھٹنے لگتے تو ان کی جان میں جان آتی وہ لوگ دراصل آبادی سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر پڑے ہوئے تھے۔ اگر سچ موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی تو کہیں پناہ ملنی مشکل تھی۔ بھلا کیوں اس کی چھولہ اریاں کب تک بارش سنبھالتیں۔

آج بھی صبح ہی سے بارش کے آثار تھے۔ لیکن پچھلے تجربات کی بناء پر وہ اس کی طرف سے کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے۔ ان میں صرف حمید ہی ایک ایسا تھا جس نے کبھی اس مسئلے پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت تو یہ سوچنے میں صرف ہوتا تھا کہ اگر اتفاق سے شکار نہ ملا تو کیا ہوگا۔ پرندے بھی نہ ملے تو رات کیونکر گزرے گی۔ کیا صرف کافی یا چائے پی پی کر بھوک بھلائی جاسکتی ہے؟ اسے فریدی کے ساتھ شکار میں اکثر بڑے تلخ تجربات ہوئے تھے۔ اس کا ایک خطبہ حمید کو بُری طرح کھلتا تھا۔ وہ یہ کہ وہ ہمیشہ پرندوں یا جانوروں کو ہوشیار کر دینے کے بعد ان پر گولی چلاتا تھا۔ لہذا اکثر ایسا بھی ہوتا کہ دن بھر جھک مارنے کے باوجود وہ ایک پرندہ بھی شکار نہ کر پاتے اور پھر روکھی روٹیاں چائے یا کافی میں ڈبو ڈبو کر کھاتی جاتیں۔ آج بھی وہ کئی پرندے شکار کر لیتے لیکن فریدی کی جدت طرازیوں سے ناکام رہے اس نے دو نالی بندوق سنبھال رکھی تھی۔ پہلے وہ ایک ہوائی فائر کر کے پرندوں کو اڑا دیتا پھر ان پر فائر کرتا۔ اتفاق سے آج اس کی ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔ اگر اشرف نے ایک ہرن نہ مار لیا ہوتا تو پھر چائے اور خشک روٹیوں کی نوبت آ جاتی۔

حمید جانتا تھا کہ فریدی کے ساتھ رہ کر تفریح بھی زحمت بن جاتی ہے اس لئے وہ احتیاطاً مچھلیوں کے شکار کا سامان بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔ مگر اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہئے کہ اس علاقے میں

اسے ایک بھی ایسا تالاب یا پوکھرنہ مل سکا جہاں وہ مچھلیاں پھنسا سکتا۔ قریب ہی ایک ندی تھی مگر کسی تیز رفتار ندی میں اول تو مچھلیاں لگتی ہی نہیں اور اگر اتفاق سے ایک آدھ لگی بھی تو وہ اکثر اپنے ساتھ ڈور اور چرخی بھی لے جاتی ہے۔ حمید نے دو تین بار اس ندی میں شکار کھیلنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک کانٹا اور ایک بنسی کھودینے کے بعد بقیہ پر اسے کافی رحم آیا اور اس نے اس کا خیال ہی ترک کر دیا۔

اس وقت بھی وہ مچھلیوں ہی کے متعلق سوچ رہا تھا اور اس کے ساتھی ہرن کی کھال اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فریدی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنی رائفل کا معائنہ کر رہا تھا۔ حمید سوچنے لگا کہ کھال اتارنے کے بعد اس کے ٹکڑے کئے جائیں گے اور اس میں تقریباً ایک گھنٹہ ضرور لگے گا۔ دفعتاً اس کو ایک تدبیر سوچھ گئی۔

”ارے بھائی صاحب کیا تم لوگوں کے عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“ وہ بیٹھے بیٹھے ہنکارا۔

”کیوں؟“ اشرف بھنویں تان کر بولا۔

”دیکھتے نہیں ہو کہ یہ مادہ ہے۔“

”تو پھر....!“

”اور اس کے تھنوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے ایک بار بھی نیچے نہیں دیئے۔“

حمید نے محققانہ انداز میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو۔“ شاہد بولا۔

”نور اپیٹ چاک کر دو اس کا۔“

”چند ہیں آپ ایتھے خاصے۔“ اشرف نے کہا اور پھر کھال اتارنے میں مشغول ہو گیا۔

”میں کہتا ہوں ناورنہ تمہارے فرشتے بھی اس کا گوشت نہ کھائیں گے۔“

”کیوں....!“

”اگر کچلی کا پتہ پھٹ گیا تو سارا گوشت کڑوا ہو جائے گا۔“

”پتہ کیسے پھٹ جائے گا۔“ ساجد نے کہا۔

”شکار کی دم بنے ہیں۔“ حمید منہ بگاڑ کر بولا۔ ”کبھی اور بھی شکار کھیلا تھا۔ میاں صاحب

زاوے کسواری ہرنی کو ذبح کرنے کے بعد فوراً ہی اس کی کچلی باہر نہیں نکال لی جاتی تو پتہ خود بخود

بھٹ جاتا ہے۔“

فریدی کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ حمید نے اُسے آنکھ ماردی۔

”تو پھر....!“ نعیم نے پوچھا۔

”پیٹ چاک کر کے کھجی نکال بھیجگو۔“ حمید نے کہا۔

”کھال نہ خراب ہو جائے گی۔“ شاہد نے پوچھا۔

”پھر وہی ڈیوٹ پن کی باتیں۔ کیوں کیا پانی بھرنے کا مشینہ بناؤ گے؟“

”نہیں تو....!“

”پھر پیٹ چاک کر دینے میں کیا مصیبت ہے۔“

فریدی پہلے تو حمید کو گھور تارہا پھر چپکے سے اٹھ کر کھسک گیا۔

”نہیں کھال خراب ہو جائے گی۔“ اشرف نے کہا۔

”پھر وہی اناڑیوں جیسی باتیں۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”نہیں نہیں یاد کیا کر رہے ہو۔“ اشرف نے کہا۔

لیکن حمید نے اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ہرنی کا پیٹ چاک کر دیا۔

”ٹھہرو.... ٹھہرو۔“ اس نے اس کے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر اس کی آنتیں کھینچتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے زرخٹی کاٹ کر کھجی کی واڑ باہر نکال لی اور اسے ہاتھ میں لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں....؟“ نعیم نے اسے سوالیہ انداز میں کہا۔

”اسے پھینک آؤں....؟“ حمید نے کہا۔

”گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔“ اشرف بھنا کر بولا۔

”یار اناڑیوں سے خدا ہی بچائے! اگر مجھے یہ معلوم ہو تاکہ اس سے پہلے کبھی تمہیں ہرن

وغیرہ کا شکار کھینے کا اتفاق نہیں ہوا تو ساتھ لانے پر کبھی رضامند نہ ہوتا۔“

”کیا بیک رہے ہو۔“

”ارے یہ کنواری ہرنی کی کھجی ہے۔“ حمید نے دانت پیس کر کہا۔

”تو پھر....!“

”پہلے بخار آئے گا اور پھر کوڑھ تک ہو جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں اور اگر بالکل ہی

کنواری ہرنی ہوئی تو اس سے بھی بدتر حالت ہو سکتی ہے۔“

”ہم نے تو کبھی نہیں سنا۔“ نعیم نے کہا۔

”تم نے یہ بھی نہ سنا ہو گا کہ ہرنی بھی کنواری ہوتی ہے۔“

”کیوں فضول کہتے ہو۔“

”آخر تمہیں کس طرح یقین دلاؤں۔“ حمید نے بظاہر زچ ہو کر کہا۔

”فریدی سے پوچھیں گے۔“ ساجد بولا۔

مگر فریدی پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ اس نے حمید کی نیت بھانپ لی تھی۔ لہذا وہ نہ تو حمید کی

طرف سے بُرا بننا چاہتا تھا اور نہ دوسرے دوستوں کی طرف سے۔

”آپ جائیں جہنم میں۔“ حمید نے جھٹک کر کہا ”اگر ایک آدھ بار پیار پڑ گیا تو کہاں لادے

پھریں گے۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا اچھولدار یوں کے پیچھے آیا اور یہاں جوتے اتار کر پنچوں کے بل جو دوڑ

لگائی تو سر کندوں کی کھانیوں ہی میں آکر دم لیا۔

پھر اس نے جلدی جلدی خشک لکڑیاں چنیں اور ان میں آگ لگا کر کھجی کی واڑ اس پر رکھنے ہی

جارہا تھا کہ ایک چیل نے کسی طرف سے چھینا مارا اور کھجی کی واڑ اس کے ہاتھ سے صاف نکال لے

گئی۔ حمید کے منہ سے بے اختیار ایک موٹی سی گالی نکلی اور وہ اس کے پیچھے دوڑا۔

سیر ڈیڑھ سیر کا وزن چیل کے بس کاروگ نہیں گا۔ تھوڑی ہی دور جانے کے بعد کھجی کی

واڑ اس کے پنچوں سے چھٹ پڑی اور حمید شکاری کتے کی طرح اس کی طرف چھینا لیکن اس بار اس

کی امیدوں پر باقاعدہ طور پر اوس پڑ گئی۔ کھجی کی واڑ کسی چوپائے کے تازہ کئے ہوئے گوہر میں

لتھڑی پڑی تھی۔

چیل سامنے ہی ایک درخت پر بیٹھی شاید اس مال غنیمت پر دوبارہ قبضہ کرنے کے امکانات

پر غور کر رہی تھی۔

حمید نے بھنا کر ایک بڑا پتھر اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک

کر پلٹا اور پھر اسے فریدی کی طر آئیز مسکراہٹ کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے خون کی حدت اور زیادہ

بڑھادیا کرتی تھی۔

فریدی نے اس کی طرف را انقل بڑھائی۔

”کیا ہے.....!“ حمید جھلا کر بولا۔

”پرنندوں پر پتھر چلانا ظلم ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”پتھر تو صرف ان بچوں پر چلائے جاتے ہیں جو کسی سنجیدہ بزرگ کے پیچھے تالیاں بجانے چلتے ہیں۔“

”آپ چاہتے کیا ہیں۔“ حمید نے بگڑ کر کہا۔

”تمہیں سمجھا بھلا کر واپس لے جانا..... کیا تم نے بچپن میں نانی اماں سے نہیں سنا کہ چیل کو مارنے سے کانوں میں درد ہوتا ہے۔“

”خدا کی قسم.....!“

”کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ بیٹھنا۔“ فریدی اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”آؤ چلیں شاہش.....!“

”نہیں جاؤں گا۔“

”اچھا جی.....!“ فریدی نے اس کی گردن پکڑ لی۔ ”دھوکے باز! مکار..... ان بے چاروں کو الو بنا کر کلبی لے اڑے تھے۔ فرزند من! کنواری ہرنی کی کلبی کوئی شادی شدہ چیل ہی ہضم کر سکتی ہے۔“ گردن تو چھوڑی۔ ”حمید نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”شامت منڈلا رہی ہے، تمہارے سر پر۔“

”شامت نہیں موت کہئے۔“ حمید نے جل کر کہا۔ ”آپ کے ساتھ تفریح بھی عذاب بن جاتی ہے۔“

”آگے بڑھو..... آگے۔“ فریدی اسے دھکا دیتا ہوا بولا۔ ”ابھی تو وہاں تمہاری بنے گی۔“

”خدا کی قسم کہئے گا نہیں کسی سے۔“ حمید نے پلٹ کر کہا۔

”کیوں؟“

”اب بتاؤں کیوں..... کیوں..... کیوں.....!“ حمید جھنجھلاہٹ میں تقریباً ناچتا ہوا بولا۔

”چلتے ہو..... یا ایک کندہ رسید کروں۔“ فریدی نے را انقل کی تالی پکڑ کر کندہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ادھر اشرف نے اپنی انگلی کاٹ لی تھی اور چھری پھینک کر الگ جا کھڑا ہوا تھا۔ فریدی

اور حمید کو آتے دیکھ کر اس نے کنواری ہرنی کی کلبی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”بھی مجھے ہرنوں کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن یہ کیا! کیا انگلیاں کاٹ لیں۔ یا تم لوگوں سے ایک ہرنی کی کھال نہیں ادھیڑی جاتی۔“

”اچھا بھئی حمید! سبھی جانتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ لگے بغیر کوئی کام ٹھیک نہیں ہو گا۔“

حمید نے فریدی کو گھور کر دیکھا اور پھر ہرنی پر ٹوٹ پڑا۔

”ارے کھال.....!“ اشرف چیخا۔

”ہات تمہاری کھال کی ایسی تھیں۔“ حمید چیخ کر بولا۔ ”یہاں بھوک کے مارے حال پتلا ہے

اور آپ کو کھال کی پڑی ہے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھال کے پر نچے اڑا دیئے اور کئی جگہ سے کھال کے ساتھ گوشت

بھی ادھیڑ ڈالا۔ جب کھال الگ ہو گئی تو ایک نوکر بولا۔

”حضور کھال کھینچنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔“

”جی..... تو اب تک..... کہاں مرے ہوئے تھے آپ۔“

”پچھلی ناگوں کی کھال نکالنے کے بعد اسے الٹا اٹھا کر کھال کھینچ لی جاتی ہے۔“

”بس دقان ہو جاؤ۔“ حمید جھلا کر بولا۔ ”ورنہ میں یہی سلوک تمہارے ساتھ کروں گا۔“

”ارے صاحب آپ لوگ خود ہی تو بھڑ گئے تھے ورنہ ہم لوگ ساتھ کس لئے آئے ہیں۔“

نوکرنے کہا۔

”اچھا تو اب اس کے ٹکڑے کرو۔“ حمید دانت پیتا ہوا بولا۔ ”ورنہ تھوڑی دیر بعد آکر کہو

گے کہ ٹکڑے کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہرن کو اپنے اوپر سوار کرنے کا موقع بخشا جائے۔“

حمید چھری پھینک کر الگ ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد نوکروں نے ہرنی کے ٹکڑے کر دیئے اور انہیں نمک لگا کر بھونا جانے لگا۔

حمید بے چینی سے اپنی جگہ پر پہلو بدل رہا تھا۔

”یار تمہاری بھوک بھی قیامت ہے۔“ اشرف بولا۔

”میں تمہاری طرح مر بیض تو ہوں نہیں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

بھوک تو قریب قریب سبھی کو لگ رہی تھی۔ اس لئے بات زیادہ نہیں بڑھنے پائی۔

جب وہ لوگ کھانے کے لئے بیٹھے تو ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ فریدی انہیں اپنے

انگلینڈ کے تجربات بتا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے لے کر ایسٹ انڈیا کے گھریلو قبیہ خانوں تک کے حالات بتائے۔

”اور جناب نے کیا سیکھا۔“ نعیم نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”بوسہ لینے کے پچاس نئے طریقے۔“ حمید اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی ہڈی کو نہایت انہماک سے چھوڑتا ہوا بولا۔

یہ بات اس نے اتنی سنجیدگی سے کہی تھی کہ فریدی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ لیکن حمید اس بُری طرح اس ہڈی سے بھڑا ہوا تھا کہ اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

”اور یہ کہ اگر....!“ وہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”انگلینڈ میں کسی لڑکی کے سر پر پنجہ مریم کی پتیاں رکھ کر اس کا بوسہ لے لو تو وہ قطعی بُرا نہیں مانتی۔“

”کیا بکواس ہے۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔

”تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”تو پھر گنوا چلوں تمہاری حماقتیں۔“ فریدی نے کہا۔

”غپ اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔“

”اچھا....!“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”تو کیا یہ غپ ہے کہ ایک ٹائٹ کلب میں ایک

عورت نے....!“

فریدی نے بات پوری نہیں کی تھی کہ حمید نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اشرف کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ذرا آپ کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔“

”ہاں تو کیا ہوا تھا۔“ اشرف نے حمید کی بات اڑا کر فریدی سے پوچھا۔

”ہوایہ کہ اس بد تمیزی سے نہ کھاؤ کہ دوسروں کو قے ہو جائے۔“ حمید نے کہا۔

”ہمارے ڈان ڈوان حمید صاحب نے.... ایک عورت کو مدعو کیا۔“

”نعیم! یاز تم نہ ہوئے۔“ حمید نے پھر بیچ ہی سے بات اڑادی۔ ”کتنا شاندار استقبال ہوا ہے

فریدی صاحب کا کہ واہ وا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے آفیسر تو گویا بچھے جا رہے تھے۔“

”اور وہ عورت نشے میں بُری طرح دھت تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ دھت کیا بلا ہے۔“ حمید نے پھر ہاتھ پیر مارے۔ ”دھت دھت.... دھت....“

”ہاہاہاہ۔“

”بیٹے حمید خاں نے اسے اور پلا دی۔“ فریدی رومال سے ہاتھ صاف کر کے سگار سلگاتا ہوا بولا۔

”اور کھائیے نا۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”بس اتنا ہی۔“

”اور جب اسے بہت زیادہ چڑھ گئی تو....!“

حمید نے پھر ہلڑ بچا کر اسے آگے نہ کہنے دیا۔

”یار تم سب اور کھاؤ....! ابھی اور کھاؤ.... کھاؤ نا.... ارے اشرف تم بھی کھا چکے ہو۔“

”تو پھر اس نے....!“

اب حمید نے باقاعدہ حلق پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فریدی پھر بولا۔

”تو پھر اس نے حمید کا گریبان پکڑ لیا۔“

”گریبان پکڑ لیا۔“ اشرف نے قہقہہ لگایا۔

”نہیں گاڑیہاں پکڑ لیا اور اپنے گھر چلی گئی۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”کیا شاندار غپ

ہے.... کیا کہنا۔“

”اور پھر وہ....!“

”کیا آپ خواہ مخواہ....“ حمید بھنا کر بولا۔

”کیوں بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہو۔“ اشرف نے کہا۔

”تم کیوں کود رہے ہو۔“ حمید اس پر پلٹ پڑا۔

اور پھر دونوں میں باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہو گئی اور فریدی اٹھ کر ایک چھوٹا اندر چلا گیا۔

بدقت تمام بقیہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر لیا۔

”تو اس سے کیا ہوتا ہے بات مجھے ہی معلوم ہو جائے گی۔“ اشرف نے کہا۔

”یار تم خود ہی کیوں نہیں بتا دیتے۔“ شاہد نے حمید سے کہا۔

روایتی کتا

اور پھر سب کے سب حمید کی جان کو آگئے۔

”یار کیوں خواہ مخواہ بھیجا چاٹ رہے ہو تم لوگ۔“ حمید زچ ہو کر بولا۔

پھر چیخ چیخ کر فریدی کو آوازیں دینے لگا۔

”بھی کوئی خاص بات نہیں۔“ فریدی نے چھو لدا ری سے سر نکال کر کہا۔ ”اس عورت نے حمید سے شادی کی درخواست کی تھی۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ اشرف بُرا سامنہ بنا کر بولا۔ ”تو اس پر اتنی اچھل کود کیوں چار ہے تھے۔ نہیں کوئی اور بات معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی نے کوئی جواب دیئے بغیر پھر اپنا سر اندر کھینچ لیا۔

”جناب والا....!“ حمید دانت پیس کر بولا۔ ”یقیناً کوئی اور بات ہے اور آپ اس بات کو سننے کی تاب نہ لاسکیں گے۔“

انہوں نے پھر اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔

”اچھا تو سنو....!“ حمید بھنا کر بولا۔ ”تم اس عورت سے بھی بدتر معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ بابا میرا پیچھا چھوڑو۔ تم سب بھی میرے باپ ہو۔“

چھو لدا ری میں فریدی کے قہقہے کی آواز سنائی دی اور وہ باہر نکل آیا۔

”وہ سالی تو خیر نشے میں تھی.... مگر یہ.... کم بخت۔“

”خیر بھی سنو....!“ فریدی سگار کا کش لے کر بولا۔

”جی بس آرام کیجئے۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔ ”میں خود....!“

اس نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ یک بیک بڑی بڑی بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں اور وہ سب بے ساختہ چھو لدا ریوں کی طرف بھاگے۔ تقریباً پانچ منٹ تک بہت تیزی سے بوندیں گرتی رہیں پھر دھوپ نکل آئی اور سب سے پہلے حمید نے بوکھلا کر اپنی قمیض اتار پھینکی۔ ہوا قطعی بند ہو گئی تھی۔ بھیگی ہوئی زمین سے انجرات نکلتے معلوم ہو رہے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اس جس میں اچھی لگنے کے بجائے گراں گزر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ سب نے اپنی قمیضیں اتار پھینکیں اور چھو لدا ریوں سے باہر نکل آئے۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑے موجود تھے اس لئے کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں۔ باہر بھی انہیں سکون نہ ملا اور وہ پھر چھو لدا ریوں میں آگئے اور تھوڑی دیر بعد پیٹ بھرے مگر مچھوں کی طرح اونگٹنے لگے۔ نہ جانے

وہ کب تک سوتے رہے اور جب آنکھ کھلی تو سب سے پہلے انہیں بارش کا شور سنائی دیا۔ یا شاید اسی شور ہی کی وجہ سے وہ جاگ پڑے تھے۔

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا ریلہا چھو لدا ریوں میں در آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی زمین سے بستر اٹھا کر واٹر پروف تھیلوں میں بھرنے شروع کر دیئے۔

”یہ تو برسنے والا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ فریدی نے پر تشویش انداز میں کہا۔

”مگر مجھے تو یہ لڈو بانٹنے والا ہی جان پڑتا ہے۔“ حمید نے منہ سکڑ کر کہا۔ وہ اپنے جوتے اتار کر کیوناس کے تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے پتلون کے پائینچے موڑ کر پنڈلیوں تک چڑھائے۔

آہستہ آہستہ چھو لدا ریاں بھی ٹپکنے لگیں۔

”اب کیا ہو گا....؟“ کسی نے کہا۔

پھر وہ فریدی کی تجویز پر اس اسٹیشن وگن کی طرف بھاگے جس پر وہ سامان سمیت یہاں تک پہنچے تھے۔ اندر گھس کر انہوں نے کھڑکیوں کے شیشے گرا دیئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ نوکروں اور دیہاتی رہبر نے ایک گھنی شاخوں والے برگد کے درخت کے نیچے پناہ لی۔

”سارا مزہ کر کر اہو گیا۔“ اشرف بولا۔

”حیرت ہے کہ تم لوگ بے سرو سامانی سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔“

فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔ ”لطف تو اس وقت آتا جب یہ موٹر بھی نہ ہوتی۔“

”تو بسم اللہ!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”راستہ یہ ہے۔ باہر تشریف لے جائیے۔ لطف ہی لطف بکھرا پڑا ہے۔“

وہ سب ہنس پڑے اور فریدی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

”ایسے ہی موقعوں پر صحیح معنوں میں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔“ فریدی نے مڑ کر حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حمید پھر بھنا کر بولا۔ ”مجھے یاد پڑتا ہے کہ پچھلی برسات میں ایک مینڈک نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔“

”ضرور کہا ہو گا.... راز کی باتیں اپنوں ہی سے کہی جاتی ہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا اور حمید بُرا سامنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

بارش تھمنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے اور اندھیرا تھا کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہے پھر دفعتاً حمید نے کہا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ کیا ساری رات اسی طرح گزر جائے گی۔ اگر شروع ہی میں چل پڑے ہوتے تو اس وقت ہم کسی گاؤں ہی میں پناہ لے سکتے تھے۔“

”بھئی تو مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح بارش ہوگی۔“ فریدی نے کہا۔
حمید نے کوئی جلی کٹی کہنے کے لئے منہ بنایا ہی تھا کہ نوکر دوڑتے ہوئے اسٹیشن دینگن کی طرف آئے۔

”صاحب! ندی بڑھ رہی ہے۔“ دیہاتی راہبر ہانپتا ہوا بولا۔

”کیا!....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”جی ہاں! تھوڑی دیر بعد یہاں قدم جمانا دشوار ہو جائے گا۔“

”تب تو بھی اکھاڑو چھو لدریاں۔“

”میں تو ہر گز نہیں جاؤں گا۔“ حمید پھیل گیا۔

”کیا بکتے ہو۔“ فریدی جھلا کر بولا۔

”واہ زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع پہلی بار نصیب ہوا ہے۔ میں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔“

فریدی کچھ اور کہے بغیر دینگن سے اتر گیا اور چھو لدریاں اکھڑوانے میں نوکروں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی حمید کے علاوہ سب اتر آئے اور وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا پائپ پیتا رہا۔

بھینگے ہوئی چھو لدریاں دینگن میں رکھی جانے لگیں۔ حمید نے ایک طرف ہٹنا چاہا لیکن فریدی کے اشارے پر ایک چھو لدری اس پر پھینک دی گئی۔ وہ بے اختیار چیخ کر سامنے والی سیٹ پر جاگرا۔

بڑی خیریت یہ ہوئی کہ اس چھو لدری میں کسی نوکر نے ہاتھ لگا رکھا تھا ورنہ حمید اس کی بوٹیاں نوج لیتا۔ پھر بھی اسکے منہ سے بے تحاشہ ایسے الفاظ نکلنے لگے جن کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔

”کیا فضول نائیں نائیں لگا رکھی ہے۔“ فریدی نے اُسے ڈانٹا۔

”جہنم میں..... لگ.....!“

”شٹ اپ!.....!“

”خیر کبھی دیکھ لوں گا!....!“ حمید بے بسی سے بولا۔

”اس تفریح میں تمہارا بھی حصہ تھا۔“ فریدی نے کہا اور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نوکر بھی اندر آگئے اور دیہاتی راہبر فریدی کے برابر بیٹھ گیا۔ دینگن چل پڑی۔

اس دوران میں بوندوں کا زور کم بھی ہوا اور پہلے سے زیادہ بھی لیکن تار نہیں ٹوٹا۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی تھی۔ فریدی راہبر کے بتائے ہوئے راستوں پر دینگن کو لئے جا رہا تھا۔ لیکن دو ایک جگہ اس کی ہچکچاہٹ پر اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

”بھئی تم بھولتے تو نہیں۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”نہیں صاحب۔“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”خدا کرے تم بھول ہی رہے ہو۔“ حمید دانت پر دانت جھا کر بولا۔

لیکن وہ سب کچھ اس طرح بدحواس تھے کہ انہوں نے حمید کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ سبھی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ان پر اچھی طرح واضح ہو گئی کہ راہ بتانے والا خود ہی بھٹک گیا ہے۔ اس آندھی اور طوفان میں اس کے امکانات پہلے ہی سے موجود تھے۔ شکار گاہ میں آتے وقت وہ ندی کے کنارے آئے تھے، لیکن واپسی میں یہ چیز قطعی ناممکن تھی کیونکہ ندی کا پاٹ کافی بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے سے ایک تیز بہنے والی ندی تھی اور اس وقت تو اس کا پانی دور دور تک پھیل رہا تھا۔

دفعتاً فریدی نے گاڑی روک دی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔

”کیوں بھی کیوں!“ کسی نے کہا۔

”آگے نالہ معلوم ہوتا ہے کیا آواز نہیں سن رہے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایسی صورت میں آگے بڑھنا بھی خطرناک ہے۔“

”اور پیچھے ہٹنے میں بھی اللہ میاں کا دیدار نصیب ہو سکتا ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔
”بس دابنے یا بائیں سے نکل چلئے۔ اللہ نے چاہا تو بیڑا کھوکھرا پار ہے۔“

”شٹ اپ!....!“

حمید نے قہقہہ لگایا اور سب کو اس کی بے وقت کی شہنائی کھلنے لگی۔

فریدی نے وگین گھمائی ہی تھی کہ دفعتاً دیہاتی رہبر نے رکنے کے لئے کہا۔
ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دور ایک عمارت سی دکھائی دی۔

”شاید ہم یہ راج نگر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“ رہبر نے کہا۔ ”لیکن نالہ۔ یہاں واقعی ایک نالہ پڑتا ہے۔“

”نالہ کس قسم کا ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”معمولی سا۔“ رہبر نے کہا۔ ”ہم آسانی سے پار کر سکیں گے۔“

”کہیں پناہ بھی مل سکے گی۔“ اشرف نے پوچھا۔

”کیوں نہیں! نواب صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”کون نواب صاحب۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نواب صولت مرادیدہ راج نگر کے جاگیردار۔“

”اب کہاں جاگیردار ہیں۔“ نعیم منہ بنا کر بولا۔

”نہ ہوں گے۔“ رہبر نے کہا۔ ”مگر اب بھی پورا قصبہ انہیں کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اسی

قصبے پر منحصر نہیں۔ قرب وجوار کا سارا علاقہ اب تک ان کی مٹھی میں ہے۔“

”ہو گا بھی ہو گا۔“ فریدی کھڑکی کھول کر نیچے اترتا ہوا بولا۔ یہاں پانی ٹنوں سے اونچا تھا۔

اس نے اندر سے اپنی رائفل اٹھائی اور اس کے کندھے سے زمین ٹوٹتا ہوا ہیڈ لائٹس کی روشنی

میں آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر وہ اچانک کمر کمر پانی میں نظر آنے لگا۔ غالباً اس وقت نالے

میں تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ نالہ پار کر کے پھر کنارے کی طرف لوٹ آیا۔

”چلو اترو۔۔۔!“ اس نے انہیں پکار کر کہا۔ ”لائٹ آف کر دو۔“

نو کروں کے علاوہ اور سب اتر پڑے۔ پھر وہ بھی نارنج کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔

”ڈرو نہیں چلے آؤ۔“ فریدی نے کہا۔

نالہ پار کر جانے کے بعد وہ دیہاتی رہبر کے پیچھے چلنے لگے۔ بوندیں اب بھی پڑ رہی تھیں۔

مگر زیادہ تیز نہیں تھیں۔ البتہ ہوا کے جھونکے تند ہوتے جا رہے تھے۔ سناٹے میں جھونکوں کی

شائیں شائیں کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ چلتے رہے۔ دفعتاً قریب ہی کہیں سے

کسی کتے کے رونے کی آواز سنائی دی اور رہبر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے چاروں طرف نارنج کی

روشنی ڈالنی شروع کی اور پھر فریدی کی طرف مڑا۔

”صاحب یہ تو۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔

”ہم پھر غلط آگئے۔“

”عجب آدمی ہو تم۔“ فریدی نے جھلا کر کہا۔ ”ابھی ابھی تم نے کسی قصبے کا نام لیا تھا۔“

”جی وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن وہ سنئے۔“ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔

”کیا سنوں۔“

”کیا آپ کچھ نہیں سن رہے ہیں۔“ رہبر نے حقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

”کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے تم نے۔“

”حضور۔۔۔۔ یہ سنئے۔۔۔۔ یہ آواز۔“

”کیوں؟ یہ کسی شیر یا بگڑے ہوئے ہاتھی کی آواز تو نہیں۔ صرف کتے کی ہے اور وہ بھی بے چارہ

دور رہا ہے۔“

”مگر صاحب یہ معمولی کتا نہیں ہے۔“ رہبر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

”چلو چلو آگے بڑھو۔“ فریدی نے بیزاری سے کہا۔ ”میں کتوں کے متعلق تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“

”صاحب چاہے گردن کاٹ ڈالے میں تو ادھر سے ہرگز نہ جاؤں گا۔“

”کیوں بھی آخر کیوں۔“ فریدی نے زچ ہو کر کہا۔ ”اس وقت بھی ہمارے پاس چھ رائفلیں

ہیں۔ ہم نہایت آسانی سے اسے ختم کر دیں گے۔“

”رائفلیں۔“ رہبر خوفزدہ آواز میں ہنسا۔ ”جو کتا سینکڑوں برس سے زندہ ہو۔“

”کیا آپ نے سرداریدہ راج کی گڑھی کے کتے کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا۔“

”اے تو سناؤ نا بابا جلدی کرو! ورنہ اگر پھر بارش تیز ہو گئی تو ہم سب جہنم رسید ہو جائیں

گے۔“

”وہ زمین پر نہیں ہے۔“ رہبر نے کہا۔ ”اس کی آواز اوپر سے آتی ہے اور وہ جب بھی روتا

ہے ندی میں باڑھ ضرور آتی ہے اور ندی کے کنارے بے ہوئے گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔“

فریدی نے ایک پر زور تہقہہ لگایا اور ساتھ ہی کتے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

”صاحب خدا کے لئے۔“ راہبر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہاں کوئی اس کا مضحکہ اڑائے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی خبیث روح ہے۔“

”شش آگے چلو۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے خیال پڑتا ہے کہ میں اس سے پہلے بحر اس کے متعلق کچھ سن چکا ہوں۔“

”تو دوسری ہی طرف سے چلے نا۔“ حمید نے جھلا کر کہا

”نہیں محترم آپ اس معاملے میں قطعی دخل نہ دیجئے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا اور سب لوگ ہنس پڑے۔ لیکن راہبر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی پھر فریدی حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آپ خواہ مخواہ مری جا رہی ہیں۔ یہاں کئی مرد آپ کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ گھبراہٹ نہیں۔“

حمید نے ہنسا کر اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہے۔ وہ سالی گڑھی میں آگے چلا ہوں۔ گویا کہ مجھے الو کا ٹھہر بچتے ہیں۔“

فریدی اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر راہبر سے مخاطب ہو گیا۔

”تو تم ہمیں اس گڑھی ہی کی طرف لے جا رہے ہو۔“

”صاحب بس مجھے تو معاف ہی رکھئے۔“

”عجیب ڈرپوک آدمی ہو۔“

”اس معاملے میں ہمارے باپ دادا بھی ڈرپوک ہی تھے۔ لوگ دن کے وقت ادھر سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔“

”ہم تمہیں باندھ کر لے چلیں گے۔“ حمید آگے بڑھ کر بولا۔

”یوں تو آپ مجھے یہیں قتل کر کے دفن بھی کر سکتے ہیں۔“ راہبر نے بے بسی سے کہا۔

”نہیں نہیں بھائی، ہم زبردستی نہیں کرتے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم چلو رانا

کر واپس جا سکتے ہو۔“

”واپس اکیلے.... یہ ظلم ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”تم نے ناک میں دم کر دیا۔“ فریدی نے جھلا کر کہا۔ ”نہ الٹا چلتے ہو اور نہ سیدھا۔“

”تو حضور کترا کر نکل چلے نا۔ آپ لوگ بھی کافی بھیکے ہوئے ہیں۔“

فریدی کچھ سوچنے لگا۔ کتے کے رونے کی آواز پھر آئی اور راہبر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

فریدی اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”کون کون چلے گا میرے ساتھ۔“

”یار ہٹاؤ بھی۔“ اشرف بولا۔

”خدا کے لئے اس حال میں تو طبیعت کو قابو میں رکھو۔“ شاہد نے کہا۔ ”ہم لوگ تھک کر

چور ہو گئے ہیں اور اگر جلدی ہی بھیکے کپڑے نہیں اتار ڈالتے تو شاید بیمار بھی پڑ جائیں۔“

”میں تو کہہ رہا ہوں کہ تم لوگ جاؤ۔“

”بعض اوقات بڑی الجھنوں میں ڈال دیتے ہو۔“ اشرف نے جھلا کر کہا۔

”سب بے کار ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ آپ

بچپن ہی سے موت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ مگر موت ہے کہ منہ لگانے پر تیار

ہی نہیں ہوتی۔ تم لوگ جاؤ ورنہ ساری رات یہیں کھڑے کھڑے گزر جائے گی۔“

تھوڑی دیر تک سب کے سب کھڑے جھمناتے رہے۔ آخر فریدی پھر بولا۔

”غضول وقت نہ برباد کرو ورنہ زیادہ رات گزر جانے پر کسے جگاتے پھر دو گے۔ میں کسی

ناراضگی کے تحت نہیں کہہ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔“

”تم لوگ جاؤ۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔ ”میں بھی سرنگامی آدمی ہوں۔ بھوتوں کی مردم شناری

میں مجھے بھی فریدی صاحب کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔“

”کیا عورتوں کی طرح جلی کٹی سارے ہو۔“ فریدی نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”تم میرے

ساتھ نہیں جا سکتے۔“

تھوڑی دیر تک بحث ہوتی رہی اور پھر حمید کے علاوہ اور سب راہبر کے ساتھ ایک طرف

روانہ ہو گئے۔

”تم بھی جاؤ۔“ فریدی نے تیز لہجے میں کہا۔

”نہیں جاتا۔“

فریدی تاریکی کی روشنی میں آواز کی سمت چل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کسی بہت بڑی

عمارت کے کھنڈر نظر آنے لگے جن میں کئی بڑے بڑے مینار تھے۔ ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ کتے کے رونے کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

فریدی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس وقت بارش بالکل ختم گئی تھی اور مینڈکوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی وہ آواز.... اس روایتی کتے کی آواز اس شور پر حاوی تھی۔ وہ دونوں اس چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے قلعے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ لکھوری اینٹوں کی مضبوط دیواروں کے آثار اب بھی قائم تھے اور کہیں کہیں تو دیوار اپنی اصلی جسامت کے ساتھ اب بھی اپنی پائیداری کے افسانے سنارہی تھی۔

کتے کے رونے کی آواز کہیں قریب ہی سے آئی اور حمید بے ساختہ چیخ اٹھا۔

”خدا کی قسم اوپر ہی سے آ رہی ہے۔“ اس کا ہاتھ ایک طرف اٹھا ہوا تھا اور پھر پس منظر میں صرف مینڈکوں کا شور جاری رہا۔ فریدی نارنج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور اینٹوں کے ڈھیر حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ کئی اونچے اونچے مینار تھے جن میں سے دو ایک اچھی حالت میں بھی تھے۔ دفعتاً ہوا کا ایک جھونکا آیا قریب ہی کوئی دیوار گری اور کتا پھر رونے لگا۔ فریدی نارنج سمیت تیزی سے پلٹا اور روشنی کا دائرہ ایک مینار کے نچلے حصے سے پھسلتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ آواز یقیناً سی مینار پر سے آتی تھی۔ سر جٹ حمید اس کے قریب آ گیا۔

”یہ لکلیا.... کیا.... محام.... رہے۔“

”شش.... ڈرپوک۔“ فریدی اس کا شانہ تھپتھا کر مینارے کی طرف بڑھا۔

آواز پھر سنائی دی اور حمید ایک دبی سی چیخ کے ساتھ اچھل کر فریدی سے ٹکرا گیا۔

”اوپر سے.... اوپر سے....!“ وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

فریدی نارنج کی روشنی میں مینارے کے نچلے حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا قطر سات آٹھ فٹ سے کسی طرح کم نہ رہا ہوگا۔ ایک جگہ دروازے کے آثار بھی معلوم ہوئے۔ لیکن اب وہاں اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ فریدی نے ایک بار پھر نیچے سے اوپر تک روشنی ڈالی۔

”بظاہر کوئی ایسا راستہ نہیں معلوم ہوتا۔“ وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

”جس سے کسی کتے کے گھسنے کے امکانات ہوں۔“

”گھسنے کے امکانات!“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”عقل کے ناخن لیجئے وہ سینکڑوں

سال سے....!“

”ہشت....!“

فریدی نے جبک کر ایک پتھر اٹھایا اور اسے ہاتھ میں لے کر تولنے لگا۔ جیسے ہی مینارے کے اوپر ہی حصے سے آواز نکلی اس نے وہ پتھر اوپر کی طرف پھینکا۔ کھٹا کے کی آواز آئی۔ پتھر نشانے پر بیٹھا تھا۔ لیکن کتے کی آواز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

”یہ کیا کرنے لگے۔“ حمید نے پوچھا۔

فریدی جواب دینے کے بجائے پھر پتھر اٹھانے کے لئے جھکا۔

اس بار پھر اس نے آواز نکلتے ہی پتھر چلایا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر حمید کی طرف مڑ

کر بولا۔

”کتا نہیں ہے.... آؤ چلیں.... پھر دیکھیں گے.... ارے تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے....

الو کہیں کے۔“

”کیا معاملہ ہے۔“

”جو کچھ بھی ہو لیکن.... کتا.... ارے۔“ فریدی نے جست لگائی لیکن قریب ہی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کی زد سے نہ بچ سکا۔ سر جٹ حمید کی چیخ سناٹے میں دور تک لہراتی چلی گئی۔ کتا پھر مکر وہ اور خوفناک آواز میں رونے لگا۔

جان پہچان

ہوش آتے ہی فریدی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب سر نہ اٹھا سکے گا۔ کچھ دیر قبل پیش آیا ہوا واقعہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا اور اس نے زمین پر چٹ لیٹے ہی لیٹے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ زرد رنگ کی دھندلی روشنی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی کنویں میں پڑا ہو۔ لکھوری اینٹوں کی دیواریں ایک دائرے کی شکل اس کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ پھر دفعتاً اسے حمید کا خیال آیا وہ ایک جھپٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کتوں کی تیزی سے گردش کرنے لگا ہو۔ زمین میں عجیب طرح کی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔

ایک بار پھر اس نے سنبھالا لیا اور تھیر آئینہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے تو اینٹوں کے ڈھیر میں ہونا چاہئے تھا پھر..... یہ..... کیا..... اس کنویں کی تہہ بالکل خشک اور کسی کمرے کے فرش کی طرح صاف و خشک بھی..... کیوں؟ وہ بے تحاشہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے حید کو دیکھا، جو تھوڑے ہی فاصلے پر پڑا۔ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے بھی سر ہی میں چوٹ آئی تھی اور کچھ خراشیں پیروں میں بھی تھیں۔ فریدی اس پر جھک گیا۔ وہ ابھی تک بیہوش تھا۔ وہ کئی منٹ تک اس پر جھکا رہا پھر دفعتاً سیدھا کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سر میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ کھڑا ہونا دو بھر ہو رہا تھا اور نقاہت کا یہ عالم تھا جیسے وہ عرصے سے بیمار ہو۔ دفعتاً اسے اس روشنی کا خیال آیا۔ زرد رنگ کی دھندلی روشنی وہ بے اختیار اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ سترہ اٹھارہ فٹ کی بلندی پر بنے ہوئے درجوں میں اندر کی طرف چراغ روشن تھے جنہیں وہ پہلے نہیں دیکھ پایا تھا اور اب اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے چراغ خود بخود ریگ کر باہر آ گئے۔ فضا میں معلق انسانی کھوپڑیوں میں سے روشنی کی لوائیں پھوٹ رہی تھیں اور اسی طرح کی چراغندہ پھیلی ہوئی تھی جیسے ان میں چربی جل رہی ہو۔

فریدی کے جسم کے سارے روئیں کھڑے ہو گئے اور ماتھے پر پسینے کی منہنی بوندیں پھوٹ آئیں۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور دیوار سے ٹک کر ان چراغوں کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا، جو آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔

اور پھر ایک عجیب سا قہقہہ سنائی دیا جو کسی خونخوار جانور کی غراہٹ سے مشابہ تھا۔ ایک طویل قہقہے سے اس باؤلی کی دیواریں تک جھنجھٹا اٹھی تھیں، سامنے کے درجے سے ایک چمکدار چمک چمک کرتی ہوئی نکلی اور اوپر کی طرف پرواز کر گئی۔ قہقہہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب ایک دوسری طرح کی آواز باؤلی میں گونج رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہیں کوئی رچھہ اپنے پیروں پر تھو تھنی رکھے خرخر، خرخر کر رہا ہو۔

فریدی کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا۔ ریو اور موجود تھا۔ اس نے اس کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی نظریں اس درجے کی طرف اٹھ گئیں۔ جن سے چند لمبے پشتر چمکدار اڑی تھیں۔ دو خونخوار آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ انگاروں کی طرح دکھتی ہوئی آنکھیں اور پھر وہی غراہٹ سے ملتا چلتا ہوا قہقہہ سنائی دیا۔ فریدی نے ریو اور والا ہاتھ بلند کیا لیکن نہ جانے کدھر

سے ایک بڑی سی چمکادڑ نے اسی ہاتھ پر جھپٹا مارا اور ریو اور زمین پر آ رہا۔

فریدی اس چمکادڑ کی طرف جھپٹا۔ اس نے ریو اور کو زمین پر گرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو سر میں شدید تکلیف تھی اس پر اس قسم کے واقعات! وہ سمجھا شاید چمکادڑ ریو اور کو جھپٹ کر لے گئی۔ چمکادڑ اپنے پر پھنپھٹاتی ہوئی اس کے سر پر چکر لگا رہی تھی۔ دفعتاً فریدی کو ان روشن کھوپڑیوں کا خیال آیا جو آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آ رہی تھیں۔ وہ پھر تیزی سے دیوار کی طرف چلا گیا اور اس سے ٹکرا کر اوپر دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے ایک تھیر آمیز چیخ نکل گئی۔ اس کا ریو اور اوپر چلتی ہوئی کھوپڑیوں کے درمیان جھول رہا تھا اور وہ کھوپڑیاں نیچے آنے کے بجائے ریو اور سمیت اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔

قہقہہ کی غراہٹ پھر سنائی دی۔ اس بار وہ ایک دوسرے درجے سے آتی معلوم ہو رہی تھی اوپر جا کر وہ کھوپڑیاں پھر چاروں طرف بنے ہوئے درجوں میں ریگ گئیں۔

خونخوار آنکھیں پھر دکھائی دیں حالانکہ وہ کافی بلندی پر نظر آ رہی تھیں۔ لیکن فریدی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتری آ رہی ہوں۔ پھر ایک خوفناک شکل دکھائی دی۔ سیاہ کھنکھالوں کے ڈھیر میں خوفناک آنکھیں انگاروں کی طرح دکھتی ہوئی آنکھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی تاریک دیرانے میں دو چراغ جل رہے ہوں۔ فریدی کا سر ایک جھٹکے کے ساتھ دیوار سے جالگا۔ یہ اس کے زخمی سر پر دوسری چوٹ تھی۔ اسے ایک بیک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گہرے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔

نہ جانے وہ کب تک بے ہوش رہا اور ٹھیک اس وقت جب اس کا ذہن آہستہ آہستہ غنودگی کی سطح پر آ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل والی قہقہہ نما غراہٹ اس کے کانوں میں گونجی اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹا دیا ہو۔ آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا غبار چھٹا جا رہا تھا اس کا ہاتھ بے اختیار سر کی طرف گپا انگلیاں زخموں کی بجائے کسی نرم چیز سے ٹکرائیں اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

اس نے خود کو ایک سلیقے سے سجائے ہوئے کمرے میں پایا۔ اس کے نیچے ایک نرم اور ستھرا بستر تھا اور سامنے ہی فانوس میں کانوری شمعیں روشن تھیں۔ ایک معمر اوروجہہ آدمی اس پر جھکا ہوا تھا جس کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نظر آرہے تھے۔ قریب ہی ضخیم اور اشرف دکھائی

دیئے۔ فریدی نے پھر اٹھنا چاہا لیکن اس پر جھکے ہوئے آدمی نے اس کے سینے پر ہولے سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لیٹے رہئے.... لیٹے رہئے۔“

”میں کہاں ہوں۔“

”آپ قطعی محفوظ ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ زخم خطرناک نہیں ہیں۔ لیکن آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”حمید کہاں ہے؟ کیسا ہے۔“ فریدی نے اشرف سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے۔“

”کہاں ہے۔“ فریدی نے اپنے سینے پر رکھا ہوا ہاتھ اٹھا کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”دوسرے کمرے میں.... لیکن آپ لیٹے رہئے۔“

”ہشت.... میں بالکل ٹھیک ہوں.... مجھے حمید کے پاس لے چلو۔“

فریدی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر دفعتاً اشرف کی طرف مڑ کر بولا۔

”ہم لوگ کہاں تھے؟“

”کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ معمر آدمی فریدی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”جو ہونا تھا.... سو ہو گیا۔“

فریدی اسے گھورنے لگا۔ پھر اشرف کو مخاطب کر کے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”آپ کی تعریف....!“

”اوہ آپ....!“ ارشد نے خاکسارانہ انداز میں کہا۔ ”آپ.... آپ نواب صاحب۔“

”مجھے صولت مرزا کہتے ہیں۔“ معمر آدمی نے کہا۔

”اوہ....!“ فریدی نے اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگوں

کی وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔“

”نہیں.... کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن آپ لیٹ جائیے۔“

”میں اپنے ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ مجھ پر اعتماد کیجئے۔“ نواب صولت مرزا مسکرا کر بولا۔

فریدی چپ چاپ لیٹ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے اشرف سے پوچھا کہ وہ دونوں انہیں کہاں ملے تھے۔

”تم دونوں ایک گری ہوئی دیوار کی بلے میں دبے پڑے تھے۔“ اشرف نے کہا۔

فریدی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تحیر آمیز انداز میں اشرف کو گھورتا رہا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر دفعتاً پوچھ بیٹھا۔

”میرا کوٹ کہاں ہے۔“

اشرف نے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں اس کا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔

”ریوالور ہے اس میں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں....!“

”اوہ....!“ فریدی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ پھر لیٹ گیا۔

وہ پراسرار باؤلی اور اس کا ڈراؤنا ماحول۔ کیا وہ سب خواب تھا۔ فریدی انتشار میں مبتلا ہو گیا۔

وہ خوفناک چہرہ جلتی ہوئی معلق انسانی کھوپڑیاں۔ قہقہہ نما غراہٹ آخر یہ سب کیا تھا۔ پہلی بار وہ

یقیناً ایک گرتی ہوئی دیوار کے پلیٹ میں آکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ لیکن دوسری بیہوشی؟

کیا وہ سچ محض خواب تھی؟ وہ سوچتا رہا اور اس کے ذہن نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ سب حقیقت تھی۔

لیکن پھر! پھر وہ گری ہوئی دیوار کے بلے میں دوبارہ کس طرح پھنسنے لگا۔ وہ ریوالور جسے وہ

کھوپڑیاں اپنے ساتھ اڑا لے گئی تھیں اس کے جیب میں دوبارہ کس طرح آیا؟ کیا وہ شیطانی

کتا....؟ لیکن وہ اس کے آگے نہ سوچ سکا۔ کیونکہ مافوق الفطرت چیزوں کی اس کی نظروں میں

کوئی اہمیت نہ تھی۔

”کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ہمیں بلے کے ڈھیر سے نکالا تھا۔“ فریدی نے

اشرف سے پوچھا۔

”ہاں بھئی....!“

صولت مرزا بڑے غور سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر ایک

پر خیالی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لیکن آپ کو میرے متعلق کیسے معلوم ہوا۔“

”تمہارے دوستوں نے بتایا۔ اچھا میاں کمال بس چپ چاپ سونے کی کوشش کرو۔ حالانکہ زخموں میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔“

”میں سونے سے پہلے اپنے زخمی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بھئی بڑے ضدی ہو! اچھا چلو.....!“

صوت مرزا نے فریدی کو سہارا دے کر اٹھایا اور پھر وہ اس کمرے میں آئے جہاں حمید ایک مسہری پر گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ اس کا سر بھی سفید پیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فریدی کو دیکھتے ہی اس نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا اور صوت مرزا گہرا کر فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ آپ اس مینار کی چوٹی پر ہوں گے۔“ حمید نے فریدی سے کہا اور فریدی صوت مرزا کی طرف مڑ کر بولا۔ ”مطمئن رہئے اس کا دماغ خراب نہیں ہوا۔“

پھر وہ مسہری کے قریب پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ صوت مرزا نے بھی ایک میز کے کونے پر ٹک کر حمید کے چہرے پر خیال انداز میں نظریں جمادیں۔ حمید کافی کی پیالی ٹی پائی پر رکھ کر اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

”میرے نوکر کہاں ہیں۔“ فریدی نے نعیم کی طرف مڑ کر پوچھا۔

”سب آگئے ہیں اور گاڑی بھی۔“ نعیم نے جواب دیا۔

”تو تم بخیر ت ہو۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”بد قسمتی سے۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔ ”خدا نے چاہا تو اب کی صفایا ہو جائے گا۔“

انتہائی سنجیدہ ماحول ہونے کے باوجود بھی شاہد اور اشرف بے ساختہ ہنس پڑے۔

”تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا۔“ فریدی نے مسکرا کر پوچھا۔

”عینک نہیں تھی ورنہ ضرور دیکھتا۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔“ صورت مرزا نے کہا۔

”قبلہ نواب صاحب۔“ حمید نے دھوئیں کا بڑا سا بادل چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک

میری ذات کا تعلق ہے۔ میں مر جانے کی حد تک سنجیدہ ہو چکا ہوں۔“

”بھول جائیے۔ سب کچھ بھول جائیے۔“ نواب صوت مرزا معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”جوانی کا خون اکثر غلط راستوں پر بھی لے جاتا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے کہا۔

”مجھے آپ کے دوستوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ وہاں کس لئے گئے تھے۔“ صوت مرزا مسکرا کر بولا۔ ”یہ آپ کا غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ کوئی دن میں بھی ادھر جانے کی ہمت نہیں کرتا۔ مگر خیر شاید آپ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔“

فریدی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ صوت مرزا ہی کی زبانی کچھ اور بھی سننا چاہتا ہو۔

”ہمارے قصبے کے تین مچلے جوان“ صوت مرزا پھر بولا۔ ”اسی خط کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک تو کچھ دن بیمار رہ کر چل بسا اور بقیہ دو آج تک صبح الدماغ نہیں ہو سکے۔“

”اوہ.....!“ فریدی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کب کی بات ہے۔“

”پانچ سال قبل کی بات۔ وہ تینوں اس کتے کا راز معلوم کرنے گئے تھے۔“

”پھر.....!“

”دوسرے دن صبح ان کھنڈروں میں بے ہوش پائے گئے۔“

”تو کیا یہ حقیقت ہے کہ اس کی آواز سا لہا سال سے سنائی دیتی ہے۔“

”میں نے تو اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے۔“ صوت مرزا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ”بس

اب آرام کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں تو اگر یہ بات ہے تو کم از کم آپ بھی اسے بچپن ہی سے سنتے آئے ہوں گے۔“

”ہاں بھئی میں صبح سب کچھ بتا دوں گا مجھے باتوں میں بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ تم بالکل اپنے باپ کی طرح جھکی معلوم ہوتے ہو۔“

”کیا آپ ان سے واقف ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بیٹے تم ہمیں بھول گئے ہو..... لیکن ہم نہیں بھولے۔“

”ارے بھئی نواب عزیز الدین خان میرا لنگوٹیا یاد تھا..... آکسفورڈ میں ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔“

”انہیں یقین نہیں آرہا ہے۔“ حمید دفعتاً سر اٹھا کر بولا۔ ”کیونکہ یہ اس وقت ملکہ الزبتھ کے ساتھ دعوت اڑا رہے تھے۔“

”تو ابھی تم زندہ ہو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا اور حمید بھٹکا کر اٹھ بیٹھا۔

”سنئے جناب! جہنم میں گیا آپ کا ایڈونچر۔ میں اب کسی مزید حماقت کے لئے تیار نہیں۔“

”چپ چاپ شور نہیں کرتے۔ بس اب تو بارہ بج رہے ہیں۔“ فریدی نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”مذاق میں مت نالئے۔ ہم صبح ہی صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ مجھ میں بھوتوں سے لڑنے کی تاب نہیں۔“

”بھوت.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کیسے بھوت..... پاگل ہوئے ہو، ایک بھیگی ہوئی دیوار تھی، جو ہوا کا تیز جھونکا برداشت نہ کر سکی اور بس۔“

”تو پھر وہ مینار پر رونے والا کتا میرا چچا رہا ہوگا۔“

”بہت ممکن ہے وہی ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اشرف کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”بھئی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم دونوں گری ہوئی دیوار کے بلے میں دبے ہوئے تھے۔“

اشرف اکتا کر بولا۔

”کیا وہاں قریب ہی کوئی باؤلی بھی تھی۔“

”باؤلی کیا.....!“ اشرف نے پوچھا۔

”پاگل عورت کو کہتے ہیں۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ بھی جاہل ہیں۔“ فریدی منہ سکڑ کر بولا۔ ”باؤلی ایک قسم کا کنواں ہوتا ہے جس میں نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں ہوتی ہیں اور پانی کی سطح سے تھوڑی ہی اونچائی پر درختے اور برآمدے بنے ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ایسے کنوئیں گرمیوں کے زمانے کی عیاشیوں کے لئے بنوائے جاتے تھے۔“

”نہیں ہمیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دکھائی دی تھی۔“ اشرف نے کہا اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ حالانکہ ہم تعداد میں تھے اور نواب صاحب

”میں نے یہ بھی سنا ہے۔“ فریدی نے نواب صولت مرزا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کہ جب بھی وہ کتا روتا ہے قریب کی ندی میں باڑھ آجاتی ہے اور اس کے کنارے بے ہوئے گاؤں بہہ جاتے ہیں۔“

”قطعی درست ہے۔ ابھی ابھی میری لاریاں جنگ پور کے مصیبت زدگان کو لے کر یہاں آئی ہیں۔ تھوڑی دیر قبل میں بھی وہیں تھا۔ آدھے سے زیادہ گاؤں بہہ گیا ہے۔ تین بچے ڈوب گئے ہیں۔ اپنے بچپن سے اس قسم کے واقعات دیکھتا آرہا ہوں۔ اچھا ابھی اب تم لوگ آرام کرو۔ مجھے ان بچاروں کا بھی انتظام کرنا ہے اور ہاں..... ڈاکٹر نے تم دونوں کو صرف سیال چیزیں استعمال کرنے کے لئے کہا ہے۔ چائے..... کافی یا دودھ۔“

صولت مرزا اپنے نوکروں کو کچھ ہدایت دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

”اب بتاؤ.....!“ فریدی نے حمید کو مخاطب کیا۔

حمید کوئی جواب دینے کے بجائے ٹی پائی پر رکھے ہوئے ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اشرف کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

”تم لوگ وہاں کس طرح پہنچے تھے۔“

”ہم دوسری طرف سے گھوم کر یہاں پہنچے۔“ اشرف سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ نواب صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ شاید جنگ پور کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے گئے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں نوکروں کو ہدایت دے گئے تھے کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں کوئی پناہ لینے کے لئے آئے تو اسے ساری آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ لہذا ان کے نوکر پہلے تو ہمیں سیلاب زدہ سمجھے لیکن جب ہم نے انہیں پوری بات بتائی تو انہوں نے ہمارے لئے معقول انتظام کر دیا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے تک ہم تمہارا انتظار کرتے رہے۔“

”خیر.....!“ فریدی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بلے میں دبے ہوئے تھے۔“

”تم آخر بار بار اس کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو۔“ اشرف نے کہا۔

بھلا دیوار میں دب کر بھی زندہ رہنے کی کیا ضرورت تھی۔“
”کیوں فضول ٹائیں ٹائیں بچا رکھی ہے۔“

”فضول ٹائیں ٹائیں۔“ حمید ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ ”یہ فضول ٹائیں ٹائیں ہے....
ارے یہ فضا.... ضو.... ل....!“

دفعۃً اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ داہنی طرف کے ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور
ایک انتہائی حسین لڑکی شب خوابی کے لبادے میں بلوس کھڑی انہیں غمناک انداز میں دیکھ رہی
تھی۔ اس کے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر انیس یا بیس سے کسی طرح زیادہ نہیں
معلوم ہوتی تھی۔ فریدی کھڑا ہو گیا۔

”میں تم لوگوں کے لئے مغموم ہوں۔“ لڑکی نے مضطرب آواز میں کہا۔
”کوئی ایسی بات نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ہمارے زخم معمولی ہیں۔ البتہ آپ کی
ہمدردی کا شکریہ۔“

”تم میں سے فرقوس کا بیٹا دوسرے کون ہے۔“ لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
فریدی اور حمید گہرا کر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے۔
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے تھیرا آمیز لہجے میں کہا۔
”اوہ شاید تمہیں غموں نے پاگل کر دیا ہے۔ تم دونوں زخمی ہو۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ زفورس...
میرا زفورس تمہارے لئے لڑ رہا ہے۔ وہ تمہارے دشمنوں کو شکست دے کر ایک دن زفورس واپس
آئے گا۔ مجھے دیکھو.... میں خود یہاں اسیر ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایک دن زفورس مجھے اس
قید سے رہائی دلائے گا۔ کئی دنوں سے میرے کچھ سپاہی یہاں آتے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں
ہیں۔ کئی دن یہاں شب خون ضرور ماریں گے۔“

”محترمہ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔
لڑکی کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”ٹھیک ہے مجھے غلط فہمی ہی ہوئی ہے۔ تم بھی انہیں میں سے معلوم ہوتے ہو جنہوں نے
مجھے قید کر رکھا ہے۔ میں یہ سمجھی تھی کہ شاید تم نے رومنوں کے خوف سے یہ بھیس اختیار کیا ہے۔“
”آپ کو کس نے قید کر رکھا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

کے نوکروں کے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ لیکن خوف کے مارے سب کا حال پتلا تھا۔ میرا خیال
ہے کہ اگر خود نواب صاحب چلنے پر آمادہ نہ ہو گئے ہوتے تو ان کے نوکروں کو کوئی طاقت اس
وقت ان کھنڈروں میں نہیں بھیج سکتی تھی۔“

”ابھی بس....!“ حمید پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”ساری دنیا میں وہی تمیں مار خاں بیٹے ہیں۔ ایک
میں اور دوسرے آپ۔“ اس نے مضحکہ خیز انداز میں فریدی کی طرف اشارہ کیا۔

پراسرار لڑکی

”تم ابھی تک سوئے نہیں۔“ فریدی بولا۔
”آپ لوگ جھک ماریے۔ ہم تو چلے۔“ اشرف اٹھتا ہوا بولا۔ ”نہ جانے کس کی صورت
دیکھ کر گھر سے چلے تھے۔“

”آئینہ دیکھا ہو گا۔“ حمید آنکھیں بند کئے ہوئے بڑبڑایا۔
دروازہ کھلا اور ایک نوکر ہاتھوں پر ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا جس میں گرم دودھ کا
جگ اور دو گلاس تھے اس کے بعد ایک دوسرا نوکر اندر آیا اور اس نے اشرف وغیرہ سے کھانے
کے لئے کہا۔ وہ لوگ اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔
”کیوں بھی تمہیں دودھ چاہئے۔“ فریدی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے تو خواہش
نہیں۔“

”میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔
نوکر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر حمید نے دو گلاس صاف کر دیئے۔
نوکر استغہامیہ انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔
”مجھے دودھ نہیں چاہئے۔“ فریدی بولا۔ ”اگر کافی تیار ہو تو لاؤ.... ورنہ نہیں۔“
”تیار ہے حضور۔“ نوکر قدرے جھک کر بولا اور ٹرے اٹھا کر چلا گیا۔

حمید دوبارہ پائپ سلگا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر فریدی کو دیکھتا رہا پھر بڑبڑاتا ہوا لیٹ گیا۔ ”پتہ
نہیں کون آلو کا پٹھہ ڈاکٹر تھا جس نے صرف دودھ کی اجازت دی ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر

اس عمارت کے مالکوں نے۔ میں ساہا سال سے غلامی کی زندگی بھر کرتی آرہی ہوں۔ میں اس عمارت سے باہر نہیں نکلنے پاتی.... کاش! میرا زفورس یہاں جلد سے جلد پہنچ جائے۔ مجھے اپنے باغ کے گلاب بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے اس معبد کی یاد بہت پڑتی ہے جہاں سنگ مرمر کی غنیم سیرھی آسمان کی طرف اپنے بازو اٹھائے اسیل مرغوں کی قربانیاں قبول کرتی ہے۔ مجھے اپنے نخل کے عظیم الشان درتچے یاد آتے ہیں جن پر شاداب شاہوں کی سرخیاں رنگ مارا کرتی ہیں اور محل کے نیچے بہتے ہوئے دریا میں طلائی کشتیاں تیرتی ہیں۔ مجھے اپنے دو سیاہ رو غلام یاد آتے ہیں جو میری لئے رنگ رنگ کی ننھی ننھی مچھلیاں پکڑ کراتے تھے اور میں انہیں شیشے کے بڑے بڑے مرتبانوں میں ڈلوادیتی تھی۔ مجھے میرا زفورس بہت یاد آتا ہے جس کے بازوؤں میں فولادی مچھلیاں چلتی تھیں جس کے فراخ سینے پر سر رکھ کر میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ فریدی اور حمید حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ شاید وہ لڑکی انہیں اُلو بنا رہی ہے۔

”آپ کس زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔“ حمید نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔
”مصر.... ہائے میرا مصر.... میں تجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”مصر....!“ فریدی چونک کر بولا۔ وہ غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں مصر....!“ لڑکی کی آواز سے دبا دبا سا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ ”ایک دن تم سب غلام بنا لئے جاؤ گے۔ شاید تمہیں ہمارے جنگجو آدمیوں کا تجربہ نہیں۔ وہ جن کے نیزوں کی انیاں سورج کو آنکھیں دکھاتی ہیں وہ جن کی ڈھالوں پر خونخوار عقابوں کی تصویریں ہیں۔ وہ جنہوں نے رومنوں اور یونانیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ وہ جنہوں نے سلونیو جیسے جلال و جبروت والے کی آنکھیں نکال کر کتوں کے سامنے ڈال دی تھیں۔ وہ اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ان دیواروں کو پیس ڈالیں گے جنہوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔“

لڑکی خاموش ہو گئی۔ اسی دور ان میں دوسرے کمرے سے دو عورتیں آگئیں تھیں۔ ان میں سے ایک معمر تھی اور دوسری کسن جس کی عمر پندرہ یا سولہ کے قریب رہی ہوگی۔

”باجی! باجی!....!“ کسن لڑکی نے آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑا اور وہ یک بیک پلٹ پڑی۔

”تم دونوں میری بوٹیاں نوپنے کے لئے آگئیں۔“

”جیلہ....!“ معمر عورت نے اسے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔“

وہ اسے دوسرے کمرے میں کھینچ لے گئی اور کسن لڑکی نے شرماتے ہوئے انداز میں فریدی سے کہا۔

”آپ لوگ کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ یہ اس وقت ہوش میں نہیں تھیں۔“

قبل اس کے فریدی کچھ کہتا وہ بھی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

فریدی اور حمید تھوڑی دیر تک حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر حمید بولا۔
”کیا شامت ہے۔“

فریدی کچھ بولنے ہی والا تھا کہ نوکر کافی کی ٹرے لے کر آ گیا۔ اس نے فریدی کی کرسی کے قریب بی پائی کھسکا کر ٹرے رکھ دی۔

”ابھی یہاں ایک پاگل عورت گھس آئی تھی۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”پاگل عورت...!“ نوکر چونک کر بولا اور پھر پرتشویش انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔
”شاید وہ مصر کی رہنے والی ہے۔“

”اوہ....!“ نوکر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ منجھلی سرکار ہوں گی۔“

”منجھلی سرکار۔“ فریدی نے کہا۔ ”یعنی نواب صاحب کی منجھلی لڑکی۔“

”جی حضور....!“

”تو کیا وہ کچھ پیار ہیں۔“

”جی ہاں.... کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

فریدی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”ہم لوگ تو بری طرح ڈر گئے تھے۔“ فریدی پیالی میں کافی اٹھاتا ہوا بولا۔

نوکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا وہ بہت پڑھتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”کسن وہ صورت سے تو پیار نہیں معلوم ہوتی۔“

”جی صاحب۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”تین سال سے۔“

”تو تمہیں ان کی بیماری کے متعلق نہیں معلوم۔“

”نہیں صاحب۔“

”کیا وہ کبھی مصر میں بھی تھیں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”ہمارے نوکر تو.... ہماری ایک ایک بات جانتے ہیں۔“ فریدی پیالی رکھ کر نوکر کی طرف

دیکھتا ہوا بولا۔

”جی صاحب۔“ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔

”اور تم اپنی منجھلی سرکار کی بیماری کے متعلق بھی نہیں جانتے۔“ فریدی نے دھیرے سے کہا۔

نوکر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آخر وہ آہستہ سے بولا۔

”ان پر کسی جن کا سایہ ہے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور نوکر کو رخصت کر دیا۔

”ارے باپ رے باپ۔“ حمید بوکھلا کر اٹھتا ہوا بولا۔ ”سارے جن بھوت پریت یہیں اکٹھا

ہو گئے ہیں۔ شامت فلا بازیاں کھاتی دکھائی دیتی ہے۔ خدا را نکل بھاگئے۔ یہاں سے.... میں ان

چیزوں سے نہیں لڑ سکتا جو دکھائی نہ دیں۔ رہے آپ... تو آپ تو ہوا سے لڑنے کی خاصی مشق

بہم پہنچا چکے ہیں۔“

”شٹ اپ....!“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

”میں تو منج چل دوں گا۔“

”بکو اس ہے.... تمہیں یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ میں اس کتے کو مینار سے نکال کر پالنے کا ارادہ

رکھتا ہوں۔“

”ارے تو پالئے نا۔“ حمید دانت کٹکٹا کر بولا۔ ”منج کس پٹھے کے آلو.... آلو کے پٹھے نے کہا

ہے۔ لیکن میں رک نہیں سکتا۔“

”خیر تمہاری کھیاں بھی رکیں گی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ انہیں چاہے روکے چاہے مار ڈالے۔ لیکن مجھے تو بخشنا ہی پڑے گا۔“

فریدی کرسی سے اٹھ کر اس کی مسمری پر جا بیٹھا۔

”اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید اچھل کر ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔

”میں نے اتنی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”بس بس مجھے زیادہ گھنے کی کوشش نہ کیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”ارے باپ رے باپ اس کے

جنگجو سپاہی۔“

”بہر حال تم جا نہیں سکتے۔“

”میں رد مال سے اپنا گلا گھونٹ لوں گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے کوئی اچھی سی وصیت ضرور چھوڑ جانا۔“

”بخدا میں عاجز آ گیا ہوں۔ گلو خاصی کے لئے موت کے علاوہ کچھ اور نہیں دکھائی دیتا۔“

”تو پھر مر ہی جاؤ، تجھ پر تکلیف معقول کر دی جائے گی۔“

حمید کوئی جواب دیئے بغیر لیٹ گیا۔

فریدی اسے خوفناک باؤلی کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ

حمید کو بزدل نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ مافوق الفطرت چیزوں پر کچھ نہ کچھ یقین رکھتا

ہے اگر اسے باؤلی والی بات معلوم ہو گئی تو وہ کسی طرح نہ رک سکے گا۔ اس کا ذہن ان متحرک اور

معلق کمپوزیوں میں الجھتا ہوا تھا اور وہ عجیب و غریب اور خوفناک درندہ۔

اس دوران میں کئی بار اس کا ذہن نواب صاحب کی منجھلی لڑکی کے پراسرار رویے کی طرف

بھی منتقل ہوا لیکن وہ اس کے متعلق کچھ زیادہ سوچنے پر تیار نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں ساری علامتیں

کئی ذہنی مرض کی پائی جاتی تھیں۔ البتہ وہ اس کے متعلق وضاحت سے جانتا چاہتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر

تک بیٹھا بیٹھا خیالات سے الجھتا رہا پھر جانے کے لئے اٹھا۔

”کہاں چلے....!“ حمید نے پوچھا۔

”تم سوئے نہیں.... میرا بستر شاید اس کمرے میں ہے۔“

”جی نہیں.... قطعی نہیں.... میں اس بھوت گھر میں تنہا نہیں رہ سکتا؟“

”عجب احمق ہو۔“

”آپ مجھے عجیب اُلو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں.....!“

”کیا بکواس ہے..... ایک لڑکی سے ڈرتے ہو۔“

”پاکل لڑکی..... کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ حمید جھلا کر بولا۔ ”کیا آپ کو نوکر کی بات یاد نہیں۔“

”جی ہاں۔“ فریدی نے منہ سکڑ کر کہا۔ ”اس پر کسی جن کا سایہ عاطفت ہے اور آپ اتنے

گنوار ہیں کہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ مجھے خواہ مخواہ تنگ مت کرو۔“

”میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ میں قطعی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“

”ارے احمق تو آدمی ہو کر جنوں سے ڈرتا ہے۔ تف ہے۔ تجھ گدھے پر۔“ فریدی جھلا کر

بیٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اندر اتنی بوڑھی روح سسک رہی ہے۔“

”اس وقت اگر آپ مجھے گدھے کے بجائے جرنلٹ بھی کہہ دیں تو میں بُرا نہ مانوں گا۔“

حمید نے مسکرا کر کہا۔

”بکو مت.....!“ فریدی آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

حمید سمجھ گیا کہ وہ اب نہیں جائے گا۔

”آپ یہاں مسہری پر آجائے۔ میں کرسی پر سو جاؤں گا۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں جی..... سوئیے۔“ فریدی نے آنکھیں بند کر لیں۔

حمید چپ چاپ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ فریدی کو آوازیں دیں لیکن وہ

سوچا تھا۔

حمید نے لاکھ کوشش کی کہ وہ بھی سو جائے لیکن نیند نہ آئی۔ وہ پُر اسرار لڑکی اس کے ذہن

پر بُری طرح چھائی ہوئی تھی۔ اس کی خواب ناک آنکھیں، سپاٹ چہرہ، عالم تحریر میں بار بار جھپکتی

ہوئی پلکیں۔ گفتگو کرتے وقت اعضاء کی غیر مانوس سی جنبش..... یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے

اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔ دفعتاً اس کی نظریں اس دروازے کی طرف اٹھ گئیں جس

سے وہ داخل ہوئی تھی۔ وہ یک بیک اٹھ بیٹھا اور پنچوں کے بل چلتا ہوا دروازے کی چٹنی گرا کر پھر

مسہری پر لوٹ آیا۔

وہ دن چڑھے تک سوئے رہے۔ فریدی نے آنکھ کھولتے ہی سب سے پہلے نواب صولت

مرزا کو دیکھا جو قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بھئی کمال میاں تم واقعی اپنے باپ کی نقل ہو۔“ اس نے کہا۔ ”بھلا اس کرسی پر سونے کی

کیا ضرورت تھی۔“

”اوہ..... اور اصل میں باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔“

”میں نے منع کیا تھا تا کہ زیادہ باتیں نہ کرنا۔ خیر یہ بتاؤ کہ طبیعت کیسی ہے۔“

”میں بالکل اچھا ہوں..... حمید..... او حمید۔“

”بھئی سونے دوتا..... اسے کیوں جگاتے ہو۔“

حمید کھڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

صولت مرزا تھوڑی دیر تک ان سے ان کے زخموں کی کیفیت معلوم کرتا رہا پھر اٹھ کر چلا

گیا۔ وہ دونوں ضروریات سے فارغ ہو کر باہر آئے۔ صولت مرزا کے طویل و عریض مکانات

کے برآمدے اور کمرے پناہ گزینوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ خود دوڑ دوڑ کر ان کی دیکھ بھال

کر رہا تھا۔ فریدی اور حمید کو دیکھ کر وہ ان کی طرف چلا آیا۔

”بھئی تم لوگوں نے ناشتہ کیا یا نہیں۔“

”ابھی نہیں..... ہم یوں بھی دیر سے ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”دیکھو یہ تمہارا گھر ہے کسی قسم کا تکلف نہ کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو کہہ دینا

کیونکہ میں بُری طرح مشغول ہوں ورنہ خود ہی دیکھ بھال رکھتا۔“

”اوہ! آپ اس کی فکر نہ کیجئے گا“ فریدی نے کہا۔ ”ہم خود آپ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے

آئے ہیں۔“

”نہیں بھئی نہیں..... تم آرام کرو۔“ نواب صاحب نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”اوہ.....

ٹھیک یاد آیا۔ تم ابھی تک لڑکیوں سے نہیں ملے۔ آؤ..... آؤ..... میں کچھ اتنا زیادہ مشغول رہا کہ

ان سے تمہارا تذکرہ تک نہ کر سکا۔ شکلیہ تمہاری بہت مداح ہے۔ تمہارے بہترے کیسوں کی

رپورٹوں کے تراشے اس نے اکٹھے کئے ہیں۔ اکثر کہتی ہے کہ بہت خوفناک آدمی ہوں گے۔ ہا ہا

لیکن تمہاری مسکین صورت دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوگی۔“

حمید ہنسنے لگا۔ لیکن پھر دفعتاً سنجیدہ ہو گیا۔ غالباً اسے بچپنی رات والی لڑکی یاد آگئی تھی۔

فریدی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم اشرف وغیرہ کا خیال رکھنا۔ انہوں نے بھی ابھی ناشتہ نہ کیا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ حمید کی جان میں جان آئی۔ ”مجھے انہیں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ہم نے ہی تو انہیں شکار کی لئے مدعو کیا تھا۔ انہیں اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔“

فریدی کے ہونٹوں پر تسخر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور حمید اس کا مطلب سمجھ کر جھنجھپ گیا۔

نواب صاحب فریدی کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی طرف مڑے اور حمید اپنے ساتھیوں کے کمروں کی طرف چل دیا۔

راہ میں صولت مرزا نے ایک نوکر کو روک کر لڑکیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈائینگ روم میں ہیں۔

”ارے بھی شہریوں کو ناشتہ پہنچایا نہیں۔“

”جی ہاں۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”اور آپ لوگوں کے متعلق آپ سے پوچھنا تھا۔“

”میرے خیال سے تو اب ڈاکٹر کو کھانے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ صولت مرزا نے فریدی سے پوچھا۔

”قطعی نہیں.... میرے خیال سے رات ہی کسی خاص پرہیز کی ضرورت نہیں تھی۔“

”خیر آؤ بھی۔“ صولت مرزا نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

متعدو کمروں سے گزرتے ہوئے وہ ڈائینگ روم میں آئے جہاں رات والی دونوں لڑکیاں اور تیسری عورت بیٹھی تھی۔ کچھ بچے بھی تھے۔ وہ سب انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”لو بھی شکلیہ....!“ صولت مرزا نے چھوٹی لڑکی کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں ایک بہت ہی خوفناک آدمی ملاؤں۔“

تینوں مستفسرانہ انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگیں۔

”انسپکٹر احمد کمال فریدی۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”ارے....!“ شکلیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا اور صولت مرزا ہنسنے لگے۔

”تم سمجھتی تھیں بڑا خوفناک آدمی ہوگا؟ بیٹھو بھی بیٹھو۔“ اس نے فریدی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ شکلیہ ہے۔ یہ جیلہ اور یہ عقیلہ!“

فریدی کی توجہ کا مرکز زیادہ تر منجھلی لڑکی جیلہ بنی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حد درجہ چڑچڑی ہے، ہونٹ سکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ابروؤں کے درمیان ایک ابھری ہوئی شکن تھی جو اس کے سینکے مزاج کی غمازی کر رہی تھی۔ ابروؤں میں ایک خاص قسم کا تناؤ تھا جس کا خوش مزاجی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا تھا.... لیکن....

فریدی سوچ میں پڑ گیا۔ پچھلی رات کو تو اس کے چہرے کے خطوط بڑے دلآویز معلوم ہو رہے تھے، سبک اور حسین ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی نشہ انگیز تھر تھراہٹ تھی۔ ماتھے پر وہ بد نما سلوٹ بھی نہیں تھی۔ ابروؤں میں سینکے پن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

”تو یہ وہی کمال میاں ہیں، جو عزیز چچا کے ساتھ آیا کرتے تھے۔“ بڑی لڑکی عقیلہ بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ بچپن کی بہتری باتیں یاد نہیں رہ گئیں۔“ فریدی نے کہا۔

”اس کی شکایت ہی نہیں۔ زمانہ ہی نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا۔“ عقیلہ اس کی طرف چائے کی پیالی اور پیسٹریوں کی طشتری کھسکاتی ہوئی بولی۔ ”جب تک عزیز چچا زندہ رہے برابر آنا جانا ہا اس کے بعد سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ اللہ بخشنے عزیز چچا بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔“

فریدی کا دم گھٹنے لگا۔ اسے گھریلو قسم کی باتوں سے اختلاف ہونے لگتا تھا۔

عقیلہ اپنی چھوٹی بہن کو مخاطب کر کے بولی۔ ”اور سنو! عزیز چچا نے انہیں بارہ سال کی عمر میں انگلینڈ بھیج دیا تھا اور پھر دس سال تک ان کی شکل نہیں دیکھی۔ حکم تھا کہ ایم۔ اے پاس کرنے سے قبل ہندوستان نہیں آسکتے۔“ پھر وہ فریدی سے پوچھنے لگی۔ ”آخر تمہیں اس انسپکٹری میں کیا مزاج ملتا ہے اول تو میرے خیال سے تمہیں ملازمت کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اگر کرنی ہی تھی تو کسی بڑی جگہ پر گئے ہوتے اتنی تعریفیں تمہاری اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں اور ابھی تک وہی انسپکٹر کے انسپکٹر۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”بات یہ نہیں۔“ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل اپنی ہی ضد کی وجہ سے اب تک انسپکٹر ہوں، بڑے عہدے حاصل کر لینے کے بعد کام کا موقع نہیں ملتا۔“

”بالکل وہی عزیز چچا کی سی باتیں۔“ عقیلہ مسکرا کر بولی اور صولت مرزا کی طرف دیکھنے لگی۔

”ٹھیک ہے وہ حضرت بھی آئے دن ایک نئے خط میں بتلا رہے تھے۔ کبھی جنوبی امریکہ

تشریف لے جا رہے ہیں۔ ربڑ کی کاشت کی تربیت حاصل کرنے کے لئے اور کبھی مصر اور وجہ پوچھو تو مسکرا کر کہیں گے کیوں نہ ایک بار اہرام مصر کی زیارت کر لی جائے۔ اچھا ابھی اب تم لوگ بیٹھو میں تو چلا۔“

صولت مرزا چلا گیا۔ فریدی بار بار جیلہ کی طرف دیکھ لیتا تھا جو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ البتہ شکیلہ اسے کبھی کبھی پر اشتیاق انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بھی اس سے گفتگو کرنے کے لئے بے چین ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ جیلہ کچھ اکتائی سی نظر آرہی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر چلی ہی گئی۔

”تمہارے زخموں کا اب کیا حال ہے۔“ عقیلہ نے پوچھا۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تم ہو۔ ابا جان کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ بتاتے۔ آخر تم یہ راج نگر ہی کی طرف کیوں چلے گئے تھے۔ نوکروں نے شاید تمہارے آدمیوں سے سنا تھا کہ تم اس شیطانی کتے کا پتہ لگانے گئے تھے۔“

”بات تو یہی تھی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”تو تم اسی طرح اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہو۔“

”ویسے میں بڑا ڈرپوک آدمی ہوں لیکن ایسی باتوں کا پتہ لگانے کو دل چاہتا ہے۔“ فریدی نے سگار نکالتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں یہاں سگار پیوں تو کوئی ہرج تو نہیں۔“

”بھلا اس میں ہرج کی کیا بات۔“ عقیلہ شکیلہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

”شکریہ۔“ فریدی سگار کا کونہ توڑ کر اسے ہونٹوں میں دباتا ہوا بولا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بیک بیک کہنے لگا۔ ”جیلہ صاحبہ نے سچ سچ رات مجھے ڈرا دیا تھا۔ بہر حال میں اس مذاق سے دیر تک محظوظ ہوتا رہا۔“

”مذاق۔“ دفعتاً عقیلہ کے چہرے پر اداسی کی گہری تہیں جم گئیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مذاق نہیں تھا۔“

”مذاق نہیں تھا۔“ فریدی کے لہجے میں مصنوعی حیرت تھی۔

”مذاق نہیں تھا۔“ عقیلہ دھیرے سے بولی۔ ”یہ ہماری ایک پرانی بد نصیبی ہے اس پر گیارہ

حال کی عمر سے اس قسم کے دورے پڑتے ہیں۔“

”دورے....!“

”ہاں دورے.... وہ اپنے ہوش میں نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ قصبے کے ایک ایک فرد کو اس کی اطلاع ہو گئی ہے۔“

”یہ دورے پڑنے کس طرح سے ہیں۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں پوچھا۔

”بس سوتے سوتے اٹھ بیٹھتی ہے اور اس قسم کی باتیں کرنے لگتی ہے جیسی تم پچھلی رات سن چکے ہو۔“

”اور انہیں اپنی پچھلی زندگی بالکل یاد نہیں رہتی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.... وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔ ہم سے کہتی ہے کہ تم نے مجھے کیوں قید کر رکھا ہے۔“

”اور پھر وہ اسی حالت میں دوبارہ سوتے بغیر ہوش میں نہ آتی ہوں گی۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں؟ کیا تم اس مرض کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔“

”یونہی تھوڑا بہت! علاج کس قسم کا ہو تا رہا۔“

”سب کچھ کرتے تھک گئے ہیں۔ ملک کے نامور ڈاکٹروں سے مشورے لئے گئے۔ لیکن

سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ جب تک مرض کی وجہ نہ معلوم ہو مرض لا علاج ہے۔ بھلا بتاؤ،

ہم اس کی وجہ کیا جانیں۔“

”ہوں....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”یہ ایک ذہنی مرض ہے وہ یا تو خود بخود جائے گا یا

پھر.... کیا ان کی شادی ہو گئی ہے۔“

”نہیں.... اور یہی ہماری سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔ یہ بات سارے اعزہ میں مشہور ہو گئی

ہے کہ جیلہ پر جن آتے ہیں۔ لہذا کہیں سے بات ہی نہیں آتی۔“

”مجھے آپ لوگوں سے ہمدردی ہے۔“ فریدی متاسفانہ انداز میں بولا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں

کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہیں۔“

”انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں۔ مجھے تو انگریزی آتی نہیں۔ اس نے ایف اے تک پڑھا

ہے۔ وہ دن بھر لائبریری میں گھسی رہتی ہے۔ اس وقت بھی وہیں کسی موٹی سی کتاب میں ڈوبی

ہوئی ہوگی۔“

فریدی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ عقیلہ کا دس سالہ لڑکا جاوید بگل بجاتا ہوا گھس آیا۔

”جاوید یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ عقیلہ نے اسے ڈانٹا۔

”ممی!....!“ ہم مارچ کر رہے ہیں۔ لفٹ رائٹ.... لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ وہ زمین پر پیرو مارنے لگا۔

”شکیلہ ذرا پکڑ.... اس سو رو کو۔“

جاوید بگل بجاتا ہوا باہر گیا۔

”ممی.... ہم بھی بگل لیں گے۔“ ایک پانچ سالہ بچی اس پر لد کر ٹھٹھکنے لگی۔

”غصہ و راتی ہے کہ ابا جان بھی اس سے دبتے ہیں۔“ عقیلہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

”ورنہ ڈاکٹروں نے اسے پڑھنے لکھنے کے لئے منع کر رکھا ہے وہ کسی کی سنتی ہی نہیں۔“

”ممی ہم بھی بگل لیں گے۔“ لڑکی پھر منمنائی۔

”کھا جاؤ تم لوگ مجھے۔“ عقیلہ جھلا کر بولی۔ ”چلو ادھر ہٹو.... لڑکیاں بگل نہیں بجاتیں۔

جاوید تو کبھی گڑبوں کے لئے ضد نہیں کرتا۔ ہاں تو۔“ وہ پھر فریدی کی طرف مخاطب ہو گئی۔ مگر بڑی حیرت کی بات ہے کہ نہ تو اسے ہوش کی حالت میں دورے کی باتیں یاد رہتی ہیں اور نہ دورے میں ہوش کی حالت کی باتیں۔

”ممی بگل....!“

”شکیلہ اسے لے جاؤ.... ورنہ پیٹ کر رکھ دوں گی۔“ عقیلہ نے بچی کو پرے دھکیلتے ہوئے

کہا اور پھر فریدی سے بولی۔ ”میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا حشر ہو گا۔ دورے کی حالت میں ایسی ایسی باتیں ابا جان کو کہتی ہے کہ تم ظالم رومنوں کے غلام ہو۔ مجھے آزاد کر دو۔ ورنہ تمہارے محل کی اینٹ سے اینٹ بچ جائے گی۔ مصری حکومت تمہیں اپنے شکاری کتوں سے نچوڑا لیں گے۔“

فریدی سوچ رہا تھا کہ اس جھکی عورت سے کس طرح پیچھا چھڑائے۔ اس کی باتیں کسی کام کی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری.... جو باتیں اس نے کرنی چاہی تھیں ان کی طرف سے اس نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ لہذا اب غیر متعلق باتوں میں الجھ کر وہ وقت برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رات ہی کو سوچ لیا تھا آج بھی یہ راج گڑھی کا ایک آدھ چکر ضرور لگائے گا۔ وہ اس کتے کا راز معلوم کرنے کے لئے بڑی طرح بے چین تھا کہ کسی

طرح نکل بھاگے۔ اچانک صولت مرزا کی آواز سنائی دی۔

”آؤ بھئی فریدی تمہیں ایک دلچسپ آدمی سے ملاؤں۔“

صولت مرزا دروازے میں کھڑا عقیلہ کو گھور رہا تھا۔ فریدی اٹھ کر اس کے قریب آیا اور پھر دونوں نشست کے کمرے میں چلے گئے۔

حکیم ارسلانوس

ڈرائنگ روم میں اسے ایک قطعی غیر دلچسپ آدمی دکھائی دیا، جو ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بھورے رنگ کی گھونگھریالی داڑھی اور سر پر بالوں کا ایک بے ہنگم سا گچھا تھا۔ وہ بھی کچھ اس قسم کا کہ بھوکی گائیں اسے خشک گھاس سمجھ کر بے خیالی میں اس پر ایک آدھ بار منہ ضرور مار سکتی تھیں۔ ان کی آہٹ پر وہ چونکا اور نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر پھر اونگھنے لگا۔ لیکن اس کی یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی۔ جیسے ہی وہ صوفے کے قریب پہنچے وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میاں صولت اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے وہ یار ذرا دیکھو تو بین صاحب کالونڈا مجھے چونچ دکھاتا ہے۔ قسم ہے اللہ کی نہ جانے کیا سمجھ کر چھوڑ دیتا ہوں اور جو بین صاحب سے شکایت کیجئے تو وہ بھاڑ سامنے کھول کر کہہ دیتے ہیں کہ بچہ ہے.... ہو گا بچہ وچہ۔ میاں جس دن غصہ آ گیا زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دوں گا۔“

”ضرور ضرور بھائی صاحب۔“ صولت مرزا سنجیدگی سے بولا۔ ”ان سے ملنے یہ ہیں اپنے نواب عزیز الدین خاں کے صاحبزادے احمد کمال فریدی اور آپ حکیم ارسلانوس.... بڑے پائے کے حکیم ہیں۔“

”اماں وہی عزیز الدین خاں تاجنہوں نے راجہ سانگر کے پاگل ہاتھی کو گولی مار دی تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”وہی وہی!“

”اچھا تو آؤ میاں بیٹھو۔“ وہ ایک طرف سرکتا ہوا بولا۔ ”یہ تمہارے سر پر پٹی کیسی بندھی ہوئی ہے۔“

”ہاں تو لڑکوں کو لڑکائی رہنا چاہئے۔ دادانہ بن جانا چاہئے۔ خیر خیر دیکھ لوں گا۔“

”ارے تو چلے کہیں بیٹھے نا۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”جی نہیں۔ میں اُنو نہیں ہوں۔ مرنے کے بعد میری قدر معلوم ہوگی۔ میاں یونان میں پیدا ہوا ہوتا تو لوگ میرے بت بنا کر پوجتے۔“

مرزا روکتا ہی رہا۔ لیکن ارسلانوس اٹھ کر چلا گیا۔

”آپ نے کیا نام بتایا تھا ان کا۔“ فریدی نے پوچھا۔ صولت مرزا ہنسنے لگا۔

”نام تو محمد حسین ہے لیکن یہ خود کو حکیم ارسلانوس کہلاتے ہیں۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”یونانی علوم کے مطالعے نے ان کا دماغ الٹ دیا۔ خاص طور پر فلسفہ ان کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ تھیلو سے لے کر ارسطو تک شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو جس کے کارناموں کا انہوں نے عمیق مطالعہ نہ کیا ہو۔ کلیوں نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا ہے۔“

فریدی کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”آپ کی لائبریری بھی بڑی شاندار ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”اکثر والد صاحب کی زبانی اس کا تذکرہ سن چکا ہوں۔“

”شاندار کیا۔ ہاں کتابیں کافی ہیں۔ میں نے عرصے سے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ اب پڑھنے پڑھانے میں دل ہی نہیں لگتا۔ صرف جیلہ فرصت کے لمحات میں زیادہ تروہیں گھسی رہتی ہیں۔“

”آپ نے انہیں کسی سائیکو انیلسٹ کو نہیں دکھایا۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

صولت مرزا بے اختیار چونک پڑا۔

”ابھی اندر یہی بات ہو رہی تھی۔“ فریدی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل پچھلے رات کو دورے کی حالت میں ہمارے کمرے میں آگئی تھیں۔ اس گفتگو سے قبل میں یہ سمجھتا رہا کہ شاید انہوں نے مذاق کیا تھا۔“

”اب کیا بتاؤں۔“ صولت مرزا مضطرب آواز میں بولا۔ ”اس کی فکر مجھے گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ پہلے تو خیر دورے ہی پڑتے تھے مگر.... ادھر کئی دنوں سے.... اب کیا بتاؤں۔ میرے علاوہ شاید ابھی گھر کا کوئی اور فرد نہیں جانتا۔“

”چوٹ آگئی ہے۔“ فریدی نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

صولت مرزا دوسرے صوفے پر تک گیا۔

”کیا لگایا ہے۔“

”معلوم نہیں۔ میری بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر نے بینڈج کی تھی۔“

”بینڈج کیا؟“

”یعنی کہ پٹی باندھی تھی۔“

”تو گویا انگریزی میں پٹی باندھی۔“ اس نے ایک ٹھٹھکانا ہوا ہاتھ لگایا۔

”ارے میاں گومی باندھ گومی۔ ایک دن میں زخم بھر جائیں گے۔“

”گومی کیا۔“

”ہاں.... پوچھتے ہیں۔ گومی کیا۔ بھی صولت تمہیں بتاؤ گومی کیا چیز ہے۔“

”بھلا میں کیا جانوں۔“ صولت مرزا مسکرا کر بولا۔

”چلو تم بھی یونہی نکلے۔ ارے میاں گومی ایک بوٹی ہے جس کی ہر چار پٹیوں کے اوپر سبز رنگ کی ایک گیند ہوتی ہے۔ اس میں بے شمار سوراخ سے سفید رنگ کا ایک پھول نکلتا ہے۔ ابھی چلو میں تمہیں یہ بوٹی پہنچا دوں۔ سونے کے بھاؤ بکنے والی بوٹی ہے۔ کیا سمجھ۔“

وہ اور نہ جاننے کی کیا کہتا رہا۔ دفعتاً فریدی کی نظر پشت کی طرف اٹھ گئی۔ عقیلہ کا لڑکا ہاتھ میں بگل لئے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فریدی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

صولت مرزا بھی آڑ میں تھے۔ جاوید آہستہ آہستہ اپنا بگل حکیم ارسلانوس کے کان کے قریب لایا اور پھر زور کی پھونک ماری وہ چیخ کر اچھل پڑا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ پلٹتا جاوید کمرے سے جا چکا تھا۔ صولت مرزا بھی گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی سے لپٹی ہوئی شرمندگی کے آثار تھے۔ حکیم ارسلانوس صوفے سے جست لگا کر فرش پر آیا اور صولت مرزا کو منکا دکھا کر کہنے لگا۔

”میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ عقیلہ کے لونڈے کی شرارت ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بگل دیکھا تھا۔ خیر سمجھ لوں گا۔“

”ارے بھائی صاحب آپ ہی نے تو لڑکوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔“ مرزا نے پر شکایت لہجے میں کہا۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔ بگل کی پے در پے آوازوں کے ساتھ ہی کسی بچے کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ دونوں گھبرا کر برآمدے میں نکل آئے۔ ارسلانوس جاوید کو اپنی گرفت میں جکڑ کر اس کے کان سے بگل لگائے پھونکیں مار رہا تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے اسے چھڑایا اور صولت مرزا نے جاوید کو بھرپور چاٹا سید کیا۔ روتا ہوا اندر بھاگ گیا۔

”آپ بھی بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے ہیں۔“ صولت مرزا کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ ”تمہارا یہ چاٹا میری گال پر پڑا ہے۔ اسے یاد رکھنا۔“ ارسلانوس سر دلچے میں بولا۔ ”آپ کے گال پر“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر نواب صاحب نے بچے کو مارا ہے۔“ ”غصہ تو مجھ پر آیا تھا۔“ ارسلانوس بولا۔ ”لہذا وہ تھپڑ دراصل میرے ہی گال پر پڑا ہے۔“ صولت مرزا اندر چلا گیا۔ ارسلانوس کے گرد فریدی کے دوست اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان میں سے خصوصاً سرجنٹ حمید ارسلانوس کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں صاحب کیا میں تماشہ ہوں۔“ ارسلانوس انہیں مخاطب کر کے بولا۔ ”جی ہاں!“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس تماشے کے پیسے کون وصول کرے گا۔“

”کیا بکواس ہے۔“ ارسلانوس بھنا کر بولا۔ ”قسم ہے اللہ کی.... اگر اس قصبے کے ہوتے تو ناطقہ بند کر دیتا۔“

”حمید کیا یہودگی ہے۔“ فریدی نے اسے ڈانٹا۔ پھر حکیم ارسلانوس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”حکیم صاحب! میں آپ کے رتبے سے واقف ہوں۔ ملک میں کوئی آپ کی ٹکر کا نہیں۔ میں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔“

”واللہ تم مومن ہو۔“ ارسلانوس پر جوش انداز میں اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔

”اور میرے لئے کیا ارشاد ہوتا ہے جناب۔“ حمید آگے بڑھ کر بولا۔

”دجال۔“

”تو بس ایمان لے آئیے مجھ پر“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ آرے سے چروا کر دوبارہ زندہ کر دوں گا۔“

”قسم ہے اللہ کی بھیجا پھاڑ دوں گا۔“ ارسلانوس اس کی طرف لپکا۔ لیکن فریدی بچ میں آگیا۔

”جانے بھی دیتے حکیم صاحب.... بچوں کو معاف کر دیتے ہیں۔“

”یہ بچہ ہے! اگر بچہ ہے تو اپنی ماں کا دودھ پی کر دکھائے۔“ ارسلانوس گرجا۔

”اے اوبقلمندوس.... زبان سنجال کے۔“ حمید بھی آگے بڑھا۔

”بقلمندوس....!“ اس نے بچوں کی طرح قہقہہ لگا کر کہا۔ ”جاہل کہیں کے۔ یونان میں کوئی برا آدمی بقلمندوس نام کا نہیں گزرا۔ تم بھول رہے ہو۔ شاید تمہاری مراد جالینوس ہے۔“

”حمید....!“ فریدی نے اسے پھر ڈانٹا اور حمید نے خاموشی اختیار کر لی۔

فریدی اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر پھانک تک چھوڑ آیا اور ارسلانوس اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر رخصت ہو گیا۔

”یہ کون جنگلی تھا۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”ایک خطبی۔“ فریدی نے کہا اور اس کے متعلق اسے جو کچھ معلوم تھا بتا دیا۔

”آدمی اس قابل ہے کہ اسے دلچسپی کا مشغلہ بنایا جاسکے۔“ حمید نے کہا۔

اتنے میں اشرف وغیرہ بھی آگئے اور فریدی پر اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جانے پر زور ڈالنے لگے۔ لیکن فریدی کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ بجھلی رات کو یوں ہی بلا مقصد خطرے میں نہیں پڑا تھا۔ اس نے فی الحال یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ وہ صولت مرزا سے مشورہ لئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ ان کا مہمان خصوصی تھا۔

یہ بحث ہو رہی تھی کہ ایک نوکر نے آکر فریدی سے کہا۔

”سرکار آپ کو لاہوریری میں یاد کر رہے ہیں۔“

فریدی حمید کو رکے کا اشارہ کر کے اس کے ساتھ چلا گیا۔ صولت مرزا کی ادھوری بات رہ رہ کر ذہن میں چبھ رہی تھی۔ وہ کون سی بات تھی جس کے متعلق اس کے علاوہ گھر کے کسی فرد کو علم نہیں تھا۔

لاہوریری میں اسے جیلہ بھی دکھائی دی جو ایک گوشے میں کھلی کھڑکی کے قریب باپ کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ یہ ایک کافی طویل و عریض کمرہ تھا۔ چاروں طرف بڑی بڑی الماریاں تھیں، جن میں کتابیں چپی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک بڑی میز تھی جس کے گرد گدے دار

کرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی میزیں اور تھیں۔ بہر حال وہ سارا فرنیچر موجود تھا جو کسی جدید طرز کے ریڈنگ روم کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ فریدی کی آہٹ پر جیلہ چونک کر مڑی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے کا تیکسا پن کچھ اور واضح ہو گیا تھا۔ فریدی اسے نکلیوں سے دیکھتا ہوا صولت مرزا کی طرف متوجہ ہو گیا، جو ایک صوفے پر نیم دراز کسی کتاب پر گرد پوش چڑھا رہا تھا۔

جیلہ نے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب الماری میں رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ فریدی نے وہ جگہ نوٹ کی جہاں کتاب رکھی گئی تھی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔
 ”واقعی شاندار ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں ایک نظر ڈال لوں۔“
 ”ضرور بھی ضرور۔“ صولت مرزا اٹھتا ہوا بولا۔

فریدی ایک ایک الماری کا جائزہ لیتا ہوا اس الماری کے قریب آیا جس میں جیلہ نے کتاب رکھی تھی۔ اس دوران میں صولت مرزا اسے جیلہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ فریدی نے وہ کتاب الماری سے نکالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ صولت مرزا کہہ رہا تھا۔ ”اب ایک بالکل ہی نئی بات ہونے لگی ہے جس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سخت الجھن میں ہوں کہ تم اس طرح غیر متوقع طور پر ادھر آ نکلے۔“
 فریدی میز پر کتاب رکھ کر استفہامیہ انداز میں صولت مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”ممکن ہے کہ تم نے پچھلی رات کو اندازہ لگایا ہو کہ وہ زیادہ تر قدیم یونان روم اور مصر کی باتیں کرتی ہے۔“

”قطعاً اور میں اسی کے متعلق سوچتا بھی رہا ہوں۔ اس وقت وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔“

”کیا....!“ صولت مرزا نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”جو کچھ وہ دن بھر پڑھتی ہیں وہی دورے کی حالت میں ان کی زبان پر ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ٹھیک ہے وہ زیادہ تر روم.... یونان اور مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتی ہے، لیکن دوسری بات....“

صولت مرزا دفعتاً خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے یا تو مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہے یا پھر کہنے ہی میں اسے تامل ہے۔ فریدی میز کے کونے پر تنک کر پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”بھئی کسی طرح کہوں زبان نہیں کھلتی۔“ صولت مرزا نے خود سے اکتا کر کہا۔

”مگر کوئی اہم بات ہے تو ضرور بتائیے۔ وہ مجھ تک ہی محدود رہے گی۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔
 ”اہم سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن تم مجھے کیا سمجھو گے۔“

فریدی پھر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ دراصل اشتیاق کے ساتھ ہی ساتھ اکتاہٹ بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ابھر رہی تھی۔
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ اس نے کہا۔

”بھئی اگر تم رات کو اپنے یہاں کچھ اجنبیوں کو دیکھو اور ان کا کچھ بتاؤ گا تو لوگ تمہیں کیا کہیں گے۔“ صولت مرزا نے بے ڈھنگے پن کے ساتھ کہا۔
 ”بیمار یا بزدل....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”لیکن.... لیکن.... جن حالات میں مجھے اس قسم کا اتفاق ہوا ہے....!“
 ”آپ کو....!“

”ابھی تک ہم سب اسے ایک ذہنی بیماری ہی سمجھتے رہے ہیں۔“ صولت مرزا کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مگر ادھر کچھ دنوں سے....!“ وہ پھر کہنے کہتے رک گیا اور فریدی کو ایک بار پھر جھنجھلاہٹ کو دبا کر چہرے پر نرمی کے آثار پیدا کرنے پڑے۔

”میں اپنے گھر میں کئی راتوں سے کچھ اجنبیوں کو دیکھ رہا ہوں۔“ صولت مرزا نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ اس دنیا کے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“

”کیا مطلب....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”وہ اسی دنیا اور اسی زمانے کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جس کا تذکرہ جیلہ دورے کی حالت میں کرتی ہے۔“

فریدی متحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا اور صولت مرزا بولتا رہا۔ ”ان کا لباس یونان یا روم کے قدیم سپاہیوں کا سا ہوتا ہے۔ سروں پر لوہے کے چمکدار خود ہاتھوں میں نیزے اور مستطیل ڈھالیں مگر دن سے کر تک زریں۔ ٹخنوں سے گھٹنوں تک کسے ہوئے سیاہ سینڈلوں کے تھے۔“

فریدی نے بے خیالی میں وہ سگار کھڑکی کے باہر پھینک دیا جو ابھی سلگایا تھا۔
”آپ نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”اسی قسم کے سوالات کے خوف سے میں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”انہیں دیکھ کر خون رگوں میں منجمد سا ہوتا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ میں انہیں تین بار دیکھ چکا ہوں ان کے چہروں کے گرد ایک عجیب قسم کی روشنی ہوتی ہے۔ آنکھیں اپنے حلقوں میں جمی جمی سی معلوم ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اسی وقت دکھائی دیتے ہیں جب جیلہ پر دورہ پڑتا ہے۔“

”تو پھر وہ کل رات کو بھی دکھائی دینے ہوں گے۔“ فریدی نے پوچھا۔
”میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کل رات مجھے ہوش نہیں تھا۔“
”تو کیا وہ جیلہ کے پاس آتے ہیں۔“

”ہاں! جیلہ ان سے اس طرح گفتگو کرتی ہے جیسے وہ انہیں جانتی ہو۔“
”کس قسم کی گفتگو۔“

”وہی اوٹ پٹانگ جو تم نے پچھلی رات کو سنی ہوں گی۔ یعنی مجھے یہاں سے رہائی دلاؤ۔ زفورس کی فوجیں اب کہاں لڑ رہی ہیں اسے جلد میرے پاس پہنچنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔“
”وہ کیا کہتے ہیں۔“ فریدی نے بے چینی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ان کے صرف ہونٹ ہلتے ہیں۔ آوازیں نہیں نکلتیں، ہاتھوں کے اشارے کرتے ہیں۔ جیلہ کو سارے گھر میں ٹہلاتے پھرتے ہیں۔ کبھی پائیں باغ میں جاتے ہیں اور کبھی جانوروں کے اصطبل کی طرف.... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی چیز تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں چھپ چھپ کر انکا پیچھا کرتا رہتا ہوں، لیکن نہ تو اس کی ہمت پڑتی ہے کہ نوکروں کو جگاؤں اور نہ یہی کر سکتا ہوں کہ انہیں لٹکاؤں۔“

”آپ کے چوکیداروں نے تو انہیں دیکھا ہی ہوگا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میرے یہاں کبھی کوئی چوکیدار نہیں رہا۔ نہ میں کتے پالتا ہوں اور نہ چوکیدار رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نہ تو میرے یہاں چوری ہو سکتی ہے اور نہ ڈاکہ پڑ سکتا ہے۔“
”ان لوگوں کا جیلہ کے ساتھ کیا رویہ ہے۔“

”وہی جو غلاموں کا مالک کے ساتھ ہو سکتا ہے۔“ صولت نے کہا۔ ”وہ اسے دیکھ کر تعظیماً جھکتے ہیں۔ اپنے نیروں کی ایناں زمین پر ٹیک دیتے ہیں۔ پھر وہ انہیں جھنجھوڑتی ہے۔ ان سے اپنے سوالات کا جواب چاہتی ہے لیکن وہ بت بنے کھڑے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے ہونٹ ہلتے ہیں اور جیلہ پاگلوں کے انداز میں کہتی ہے کہ وہ ان کی آواز کیوں نہیں سن سکتی۔ کیا وہ بہری ہو گئی ہے۔“
”تو آپ نے انہیں بولتے نہیں سنا۔“
”نہیں!....!“

”اور وہ انداز سے کسی چیز کی تلاش میں سرگرداں معلوم ہوتے ہیں؟“

”ہاں!....!“ صولت مرزا نے جواب دیا۔

”وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔

”بھلا میں کیا جانوں۔“

”خیر.... بہر حال.... آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔“

”بھی کیا بتاؤں۔ کچھ کہتے سنتے نہیں بن پڑتی۔ اب سے کچھ دن قبل میں اسے ذہنی بیماری سمجھتا تھا لیکن اب....“ صولت مرزا خاموش ہو گیا۔ چند لمبے بعد وہ فریدی کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”مگر اب یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ واقعی کوئی آسبی خلل ہے۔“

”شاید آپ ان رومیوں یا یونانیوں کی بناء پر کہہ رہے ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ کیا تمہاری رائے اس سے مختلف ہے۔“

”ابھی میں نے کوئی رائے قائم ہی نہیں کی۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔

”لیکن مجھے اس قسم کے بھوتوں اور پریوں کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے اور میری نظروں میں ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ مثلاً ایک تو وہی آپ کا روایتی کتا۔ اگر اچانک دیوار نہ گر پڑی ہوتی تو۔“

دوسری ملاقات

شام بڑی خوشگوار تھی۔ دن بھر کی تیز دھوپ کے بعد شفق کی چھاؤں زندگی افروز معلوم ہو رہی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ اگر گڑھوں اور تالابوں میں کچڑ اور پانی نہ ہوتا تو یہ کہنا دشوار تھا کہ

”ہو گا.... ہو گا.... مجھے کیا؟“ حمید بیزاری سے بولا۔

”اسے ہزاروں سال کے مردے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔“

”اس پورے قصبے ہی پر خدائی مار نظر آتی ہے۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ آج وہ مردے ہمیں بھی دکھائی دیں۔“

”کیا مطلب....!“ حمید چونک کر بولا۔

”مردے.... نہیں سمجھ! ہم رے پیش مردال بے زیروے مردے۔“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا۔

حمید اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے اکثر تواریخ کی کتابوں میں قدیم زمانے کے رومن یا یونانی سپاہیوں کی تصویریں دیکھی ہوں گی ہو سکتا ہے کہ آج تم انہیں گوشت و پوست میں دیکھو۔“

”یعنی....!“

”کیا تمہیں یاد نہیں۔“ فریدی اپنی جیب میں سگار ٹوٹا ہوا بولا۔ ”کل رات کو وہ اپنے سپاہیوں کا تذکرہ کر رہی تھی۔“ حمید کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ پر بھی جن آنے والے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ اپنے ہوش میں کب تھی۔“

”تو میں کب کہتا ہوں کہ وہ ہوش میں تھی۔“ فریدی نے ہنس کر کہا اور پھر اس نے وہ ساری باتیں دہرا دیں، جو اس کے اور صولت مرزا کے درمیان ہوئی تھیں۔

”تو یوں کہتے تاکہ اس بار اٹلیٹ ہی بن جائے گا اپنا۔“ حمید نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس بیچارے کتے کا کیا ہو گا جو صد ہا سال سے آپ کی یاد میں گریہ زاری کر رہا ہے۔“

”اسے دیکھیں گے۔“ فریدی بولا۔

”اچھا جناب اب مجھے تو بخش ہی دیجئے۔ میری ہڈیاں کافی ملائم ہیں اور گوشت بھی کچھ ایسا سخت نہیں۔ اگر کہیں اس بازیہ حویلی ٹوٹ پڑی تو میرے کپڑے دھو بی ہی کے یہاں پڑے رہ جائیں گے۔“

”مگر مت کرو۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں انہیں منگوا کر محتاجوں کو تقسیم کر ادوں گا۔“

ایک دن قبل اعتدال سے زیادہ بارش ہو چکی ہے۔ فریدی کے سارے دوست اور نوکر جا چکے تھے۔ حمید نے بھی واپس جانے کے لئے براؤز مارا تھا لیکن فریدی کے آگے ایک نہ چلی۔ اسے عجیب و غریب کتے کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا اشتیاق ضرور تھا لیکن وہ خواہ مخواہ خطرے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ دوسرے لوگوں سے چھان بین کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا کی چیز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو آواز صد ہا سال سے سنی جا رہی ہو اس کے لئے سربارنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے بھی سینکڑوں جوان مردوں نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ خود نواب صولت مرزا سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک بار چند انگریز اس منارے پر چڑھے تھے اور انہوں نے کافی دنوں تک ادھر ادھر ہاتھ پیر بھی مارے لیکن کوئی قاعدے کی بات نہ معلوم ہو سکی اور پھر مینار کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا۔ چونکہ اس گڑھی کو تاریخی اہمیت حاصل تھی اس لئے اکثر آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اسے دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے اور ایک بار تو اس کی کھدائی بھی ہوئی تھی۔

حمید کرتا بھی کیا۔ ہاتھ پیر مارنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا اور اس کا انجام بھی خود اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فریدی اپنا اطمینان کئے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتا۔ اس وقت وہ دونوں کو نچی کے عقبی پارک میں بیٹھے شفق میں تحلیل ہوتی ہوئی سرخیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حمید کو حیرت ہو رہی تھی کہ صولت مرزا اس قصبے میں رہ کر کس طرح اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انگلینڈ کے کسی بڑے آدمی کے خانگی پارک میں بیٹھا ہو۔ یہاں لان پر کئی جگہ قد آدم جسے نصب تھے۔ فن میں زیادہ تر یونان و روم کی قدیم سنگ تراشی کے نمونے تھے۔ جنہیں موجودہ دور کے ایچھے بیکاروں نے تراشا تھا۔

”صولت مرزا کو بھی شاید مردہ تہذیبوں سے بڑی دلچسپی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

غالباً وہ دونوں بیک وقت ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

”ہوں....!“ حمید نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بڑی دیر سے خود کو پوز کر رہا تھا۔ ورنہ خصوصیت سے آج کے دن اسے فریدی کی کھاری باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ ”اب اگر اس سلسلے میں اس کی بیٹی کا دماغ الٹ جائے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا اور پھر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”اور میرا سارا قرض بھی آپ ہی ادا کر دیں گے۔“

”چلو یہ بھی منظور۔“

”اچھا تو ایک استاد عا اور ہے۔“

”فرمائیے۔“ فریدی نے ہونٹ بھیج کر کہا۔

”آج کی رات مجھے جی بھر کے سولینے دیجئے۔“

”مرنے سے پہلے سونے کی خواہش غور طلب ہے۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”بعض لوگ مرنے سے قبل عموماً ہو جایا کرتے ہیں۔ ایسی کوئی تشویش ناک بات نہیں۔“

دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ فریدی بھی اٹھا۔

”ہمیں آج رات کو بہر حال جاگنا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہمیں نہیں مجھے کہئے۔“ حمید دانت پیس کر بولا۔ ”دیکھتا ہوں کہ مجھے دنیا کی کون سی طاقت

سونے سے روکتی ہے۔“

”وہی طاقت جس نے کل رات کو مجھے تمہارے کمرے میں آرام کرسی پر سلا دیا تھا۔“

”شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس لڑکی سے ڈر گیا ہوں۔ لڑکی.... ہو نہ۔“

”نہیں بھی! تم تو یونہی میرا دل خوش کر رہے تھے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”خیر....“

چلتے رہو۔ چلو حکیم ارسلانوس سے ملنے آئیں۔“

”کون وہی خبطی.... خیر چلے۔ تھوڑی کوفت بنی دور ہوگی۔“

وہ دونوں ارسلانوس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے۔

اور پھر جب قصبے والوں نے ارسلانوس کے مکان کے سامنے دو اجنبیوں کو دیکھا تو انہیں

بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ ان کی نظروں میں ارسلانوس ایسا آدمی نہیں تھا جس سے ماڈرن اور

ایجوڈیٹ قسم کے لوگ دلچسپی لے سکیں گے۔

فریدی اور حمید ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس میں ایک کافی بلے

صدر دروازہ تھا اور دروازے کے اوپر بنے ہوئے سانبان میں ابابیلوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے

جن میں شور مچاتی ہوئی ابابیلیں گھس رہی تھیں۔ شام کی ہلکی نیلگوں سیاہی میں یہ عمارت کچھ

پر اسرار سی معلوم ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی باہر نکلا، جو غالباً ارسلانوس کا نوکر تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ

چندھیائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ حمید کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چگادڑا جالے میں

ہنکادی گئی ہو۔

اس نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اندر گھستے ہی ابابیلوں کے بیٹ کی بدبو نے ان کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ ناکوں پر رومال رکھے

دلہیز سے گزر کر صحن میں نکل آئے۔ صحن کافی وسیع تھا اور صحن کے گرد بنے ہوئے چبوتروں پر

چاروں طرف بڑے بڑے کباب رکھے ہوئے تھے جن سے کبوتروں کی غٹر غوں غٹر غوں کی

آوازیں نکل رہی تھیں۔ کچھ کبوتر ابھی تک لو پر ہی بیٹھے ادنگھ رہے تھے اور کچھ اپنے پر پھلپھلاتے

ہوئے خانوں میں گھس رہے تھے۔ کچھ دیواروں پر تھے جنہیں ایک نوکر طرح طرح کی آوازیں

نکال کر نیچے بلارہا تھا۔

فریدی اور حمید کے ساتھ والے نوکر نے داہنی طرف کے دالان کی سمت اشارہ کیا جس کے

اندر دھندلی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ارسلانوس ان کے خیر مقدم کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے ہلکے نارنجی رنگ کا ٹخنوں تک

لبا کر تاپچن رکھا تھا۔ پیروں پر بڑے بالوں والی لومڑیوں کی کھال کے جوتے تھے ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے اس نے بڑے بڑے بالوں کے ڈھیر میں اپنے پیر گاڑ رکھے ہوں۔ اس وقت اس کے سر

کے بالوں کا گلدستہ اوپر اٹھے ہونے کے بجائے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

”آؤ آؤ.... میں تو سمجھتا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔“ حکیم ارسلانوس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ یہ آپ کیوں سمجھتے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”بھئی بات یہ ہے کہ میرے پاس دکھاوے کا ٹھاٹھ باٹ نہیں ہے۔“

”تو آپ مجھے اتنا تنگ نظر سمجھتے ہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں نہیں.... تمہارا باپ بھی بڑا عالی ظرف تھا۔“ ارسلانوس نے کہا اور حمید کو گھورنے لگا۔

”یہ میرے عزیز ترین دوست مسٹر حمید ہیں۔“

”عزیز ترین! بھلا تم جیسے سنجیدہ آدمیوں کے ساتھ نالائقیوں کا کیا کام۔“

حمید نے بھنا کر فریدی کا شانہ دبوچ لیا۔

وہ انہیں دالان میں لے آیا۔ یہاں کئی بڑے بڑے پتنگ پڑے ہوئے تھے جن میں سے کچھ پر کتابوں کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ ایک طرف پیتل کا ایک بڑا سا ساور کھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک پتنگ پر بیٹھ گئے اور ارسلانوس ساور کے قریب کھڑا ہو گیا۔
”میں تمہیں ویسی ہی چائے پلاؤں گا جیسی میں خود پیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”کیسی چائے پیتے ہیں آپ؟“ حمید نے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا۔
”بغیر دودھ کی۔“

”اور چائے کی پتیوں کے بجائے لکھنؤ کا خمیرہ استعمال کرتے ہیں۔“ حمید نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”دیکھا تم نے۔“ حکیم ارسلانوس نے فریدی سے پرشکایت لہجے میں کہا۔
”تم حکیم صاحب کے رتبے سے واقف نہیں۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”اپنے الفاظ واپس لو۔“
اس نے حمید کو اشارہ کیا اور حمید کو الجھن ہونے لگی کہ آخر اس خطبی میں دلچسپی لینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔

”اخلاق کا تقاضا یہی ہونا چاہئے۔“ حکیم ارسلانوس نے سنجیدگی سے کہا۔
اور حمید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ اس وقت ایک انتہائی پراسرار آدمی سے ہم کلام ہے کیونکہ اس نے اسے آج ہی ایسی حالت میں بھی دیکھا تھا جسے بعض سنجیدہ قسم کے بچے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

”مگر کچھ لوگوں کو دوسروں کو دکھ پہنچا کر ہی لذت حاصل ہوتی ہے۔“ ارسلانوس نے پھر کہا۔ ”انسانی زندگی کی منزل کے حصول میں لذت ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم دوسروں کو حصول لذت سے محروم تو نہیں کر رہے ہیں۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ فریدی جلدی سے بولا۔

”تمہیں فلسفے سے دلچسپی ہے۔“

”بہت زیادہ۔“ فریدی نے جواب دیا۔ وہ بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔
”آب توریت کے متعلق کیا خیال ہے۔“ ارسلانوس نے کہا اور جھک کر چائے دانی میں سار

سے گرم پانی ڈالنے لگا۔

”آب توریت....!“ فریدی نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے فلسفہ انگریزی میں پڑھا ہے۔“
”ویمز اٹیس کا نام سنا ہے۔“
”کیوں نہیں۔“

”وہ آب توریت کا نام سمجھا جاتا ہے۔“

”اوہ تو شاید آب توریت سے اہیکورنیزم (Epicureanism) مراد ہے۔ ٹھیک ہے اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے جو اوروں کا ہے۔“
”یعنی....!“

”یعنی کہ فلسفہ ہم جیسے آدمیوں کے بس کا روگ نہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ وہ دراصل کسی فلسفیانہ بحث میں پھنس کر وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں ایک خاص مقصد کے تحت آیا تھا۔

”ایسا نہ کہو.... ہم سب کسی نہ کسی فلسفے کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔“ حکیم ارسلانوس نے کہا۔

”ہوگا.... لیکن میں فلسفے کو حاصل حیات نہیں سمجھتا۔“

”کیوں....!“

”کیونکہ ان معاملات کے باوجود بھی فلسفہ....!“ فریدی کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ”ہماری معلومات تشنہ رہ جاتی ہیں۔“

”مثلاً....!“ حکیم ارسلانوس پیالیوں میں چائے اٹھاتا ہوا بولا۔

”مثلاً ایک بہت معمولی سی بات۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”یہ راج گزمی میں رونے والا کتا۔“

”لاحول ولا قوۃ....!“ حکیم ارسلانوس منہ سکڑ کر بولا۔ ”فلسفے کو ان لغویات سے کوئی سروکار نہیں۔“

”لیکن یہ لغویات بھی اسی دنیا میں جنم لیتی ہیں۔“ فریدی نے سگار کیس اس کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کا تعلق بھی ہماری زندگی سے ہے۔“

حکیم ارسلانوس نے ایک سگار لے کر ہونٹوں میں دبایا۔ فریدی اور حمید نے چائے کی پیالیاں اٹھالیں، بغیر دودھ کی تلخ چائے تھی۔ اس میں شکر بھی خفیف ہی سی ڈالی گئی تھی۔ حمید نے گھونٹ لیتے وقت بُرا سامنہ بنایا۔ بہر حال وہ اسے زہر مار کر پی ہی تھی۔

”ہم آخر انہیں اس کائنات کے اجزاء کے کس خانے میں فٹ کریں گے۔“ فریدی چائے کی چسکی لے کر ارسلانوس کا سگار سلگاتا ہوا بولا۔ پہلے ہی کش پر اسے بری طرح کھانسی آگئی۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ ارسلانوس نے کھانستے ہوئے بُرا سامنہ بنایا اور سگار کو مچن میں پھینک دیا۔

فریدی اپنا سگار سلگا کر اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”میں نے اپنی زندگی میں کئی بار وہ آواز سنی ہے لیکن میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی

نہیں۔“ ارسلانوس نے کہا۔

”اب میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔“ حمید نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اور میں

اس صورت میں آپ کی پوجا کروں گا اگر آپ فریدی صاحب کو بھی اپنا ہی جیسا بنادیں۔“

”کیا مطلب....!“ ارسلانوس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ کل رات کو اسی چکر میں میری جان گنوا چکے ہوتے۔“

ارسلانوس فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ ٹھیک ہے! میں اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

ارسلانوس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہ جانے کتنے اس حسرت میں مر گئے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے کہا۔

”اس چکر میں مت پڑو۔ اپنے بزرگوں سے سنتا آ رہا ہوں کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے سے بچا

ہا ہے۔“

”اوہ....!“

”تم شاید اس گڑھی کی تاریخ سے ناواقف ہو۔“

”قطعی! میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ راج اکبر کی فوج کا ایک سردار تھا۔ اکبر نے اس کی خدمات کے صلے میں اس کو یہاں کی

جاگیر عطا کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے پناہ دولت کا مالک تھا اور ملک کے کئی بڑے بڑے

راجے اور مہاراجے بھی اسے مال دار نہیں تھے۔ جسے ہم آج گڑھی کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ

ایک بہت بڑا اور ناقابلِ تسخیر قلعہ تھا۔ ایک رات رانا پر تاب ستھ کی فوجوں نے ندی پار کر کے

قلعے پر شبنون مارا۔ شاید قلعہ دار پہلے دشمنوں سے مل گیا تھا۔ رانا کی فوج نے قلعے کی اینٹ سے

اینٹ بجا دی اور ساری دولت لوٹ لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ تبھی سے اکثر برساتوں میں وہاں کتے کے

رونے کی آواز سنائی دیتی ہے اور ندی میں بازو آ جاتی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اب تک

سینکڑوں آدمی اس کا راز جاننے کی کوشش میں جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔“

”کیا اس کے راز سے کوئی اور چیز بھی وابستہ ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

حکیم ارسلانوس چونک کر اسے ٹولنے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”یہ مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے توقف کے بعد کہا۔ ”لیکن میں تمہیں اس چکر میں نہ پڑنے

کی رائے دوں گا۔“

”خیر چھوڑیے۔“ فریدی نے اپنی پیالی ختم کر کے ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں

ایک دلچسپ چیز میں نے نوٹ کی ہے۔“

”وہ کیا....!“

”یہی کہ اس قصبے کے بعض لوگ یونان پر بُری طرح عاشق ہیں۔“

”یعنی....!“

”ایک تو آپ ہی یونانی علوم پر عاشق ہیں۔ صولت مرزا کو یونانی بتوں سے عشق ہے اور ان

کی لڑکی۔ وہ تو خود ہی اب سے ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ قبل کی تہذیب کی ایک نمائندہ بن

جاتی ہے۔“

ارسلانوس بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”وہ لڑکی مکار ہے۔ اپنی داوی کی طرح صولت مرزا کی ماں بھی کچھ دنوں تک اسی قسم کے

ڈراے کھیتی رہی تھی۔ محض اس لئے کہ گھر والے اس سے خائف رہیں۔ وہ دوسروں پر چھائی

رہے اور اب یہ چوہیا جیلہ وہی کھڑا ک پھیلا رہی ہے۔“

”مگر صولت مرزا تو کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے اس کی یہ حالت ہے۔“
 ”میاں تم کیا جانو! اس نے سب کچھ اپنی دادی سے سیکھا ہے۔ مجھ سے پوچھو میں بھی اسی خاندان کا ایک فرد ہوں۔ میرے اور ان کے آباؤ اجداد ایک ہی تھے۔“

”اوہ! اچھا صولت مرزا کے متعلق کیا خیال ہے۔“
 ”میں عموماً ایسے موقعوں پر اپنے خیالات ظاہر کرنے سے گریز کرتا ہوں۔“
 ”کیسے موقعوں پر۔“

”کوئی اور بات کرو۔“ حکیم ارسلانوس اکتا کر بولا۔ ”نہ وہ لوگ میرے لئے کوئی اچھی رائے رکھتے ہیں اور نہ میں ان کے لئے۔“

”کیا عقیلہ بھی نہیں! وہ تو کافی سمجھ دار عورت ہیں۔ وہ یقیناً آپ کی کافی عزت کرتی ہوں گی۔“
 ”اوہ سمجھا! شاید تم کوئی سمجھوتہ کرانے آئے ہو۔“ ارسلانوس ماتھے پر ہل ڈال کر بولا۔ ”یہ ناممکن ہے.... یہ ناممکن ہے۔“

”بھلا سمجھوتہ کیا....!“ فریدی نے تحیر آمیز انداز میں کہا۔
 ”تم جانے ہو عقیلہ میری کون ہے۔“
 ”نہیں۔“

”میری بہو ہے۔ ان لوگوں نے میرے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالا۔ انہوں نے ہمیں ہمیشہ ذلت کی نظروں سے دیکھا ہے۔“
 ”زہر دے کے....!“

”ہاں عقیلہ بجائے خود ایک زہر ہے۔ اس کی حرکتوں کی بناء پر میرا اکلوتا بیٹا بی۔ بی کا شکلا ہو کر مر گیا۔“

”اوہ وہ بچے! کیا عقیلہ کی دوسری شادی ہو گئی۔“
 ”نہیں! وہ میرے لڑکے کی اولاد ہیں۔“

وہ مردے

حکیم ارسلانوس سے واپسی کے وقت فریدی بہت خاموش تھا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لڑکا جس کے کان میں بگل بجا رہا تھا اس کا پوتا تھا۔“ حمید نے کہا۔
 ”فریدی نے پر خیال انداز میں چلتے چلتے رک کر کہا۔ ”ہاں اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ صولت مرزا وغیرہ نے ہی اسے بچوں اور بزرگوں کا فرق نہیں سمجھایا۔“

”خیر اس سے کوئی بحث نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے تو وہ خطی بھی بھوت ہی معلوم ہوتا ہے۔“
 ”آخر تمہارے سر پر بھوت کیوں سوار ہیں۔“ فریدی نے جھلا کر کہا اور سگار سگاکر پھر چل پڑا۔ حمید خاموش رہا۔ اس کی طبیعت کافی بیزار ہو چکی تھی۔ شاید اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ خوبصورت لڑکیوں کا قرب حاصل ہونے کے باوجود بھی اس پر پُر مژدگی چھائی ہوئی تھی۔ جب بھی اسے جیلہ کاٹتا ہوا چہرہ اور وحشت زدہ آنکھیں یاد آتیں تو اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی اور پھر جب وہ شکیلہ کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتا تو خود بخود اس کی طبیعت میں جھلاہٹ پیدا ہو جاتی۔ وہ بے چین تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگے۔ کبھی کبھی اسے خود پر بھی غصہ آنے لگتا۔ اس نے فریدی کے ساتھ بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے اور وہ ان سے اکتایا بھی تھا۔ مگر اس بار کی اکتاہٹ بالکل مختلف تھی اور پھر جب وہ اُسے اپنی بزدلی پر معمول کرنے لگتا تو وہ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کے جسم سے کافی خون نکل چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کمزوری اسی بناء پر پیدا ہوئی ہو اور آہستہ آہستہ دور ہو جائے۔ لیکن اس دل بہلاوے کے باوجود بھی وہ غبیث ارواح کا خوف اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔

اسی رات کو کھانے کی میز پر صولت مرزا کے خاندان والوں کے ساتھ حمید بھی موجود تھا۔ جیلہ کے علاوہ اور سب لوگ گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ اس نے کھانے کے دوران میں ایک دو بار صرف باورچی سے بات کی تھی۔ وہ بھی کھانے کی اچھائی یا برائی کے متعلق۔ نہ تو گھر والوں ہی نے اسے کسی بات پر مخاطب کیا اور نہ اسی نے کسی سے کوئی بات کرنا ضروری سمجھا۔ گھر والوں کے اس رویے سے لا پرواہی کے بجائے کچھ دبا دبا سا خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

حمید نے اسے پچھلی رات کے بعد سے اب دیکھا تھا۔ وہ فریدی کے بیان کے مطابق صرف ایک چڑچڑے مزاج کی لڑکی معلوم ہو رہی تھی اور بس۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ رومان انگیز تاثرات نہیں تھے جو پچھلی رات کو دکھائی دیئے تھے۔

شکیلہ فریدی کو بتا رہی تھی کہ اس نے اس کے کن کیسوں کے تراشے اکٹھا کئے ہیں اور انہیں

پوچھو تو بہتر ہے۔“

”اگر کوئی خاص نقصان نہ ہو تو یہ بھی بتا دیجئے۔“ فریدی نے کہا۔

”بھئی بات ذرا مضحکہ خیز ہے۔“ صولت مرزا مسکرا کر بولا۔ ”اور پھر تمہارے ساتھ ایک

ایسے صاحب موجود ہیں جو لطیفہ گو بھی ہیں۔ اگر انہوں نے....“

”یقین کیجئے کہ میں بڑا شریف بچہ ہوں۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا اور صولت مرزا ہنسنے لگا۔

”بھئی بادشاہوں کی باتیں بھئی بڑی عجیب ہوا کرتی تھیں۔ بات بات پر انعامات اور قتل کے

فرمان چلا کرتے تھے۔ مغل بادشاہوں میں خصوصیت سے جہانگیر ان باتوں کے لئے بہت مشہور

ہے۔ قتل تو خیر اس نے کم ہی کرائے ہوں گے لیکن انعامات بہت تقسیم کئے ہیں اور وہ بھی ذرا ذرا

ی باتوں پر۔ میرے ایک مورت اعلیٰ جہانگیری فوج میں ایک معمولی سپاہی تھے ایک بار بادشاہ دلی

سے آگرہ جا رہے تھے۔ تھوڑی فوج بھی ساتھ تھی۔ اس میں میرے مورت اعلیٰ بھی تھے۔ خیال

تھا کہ رات کو کہیں پر پڑاؤ ضرور ہوگا۔ لیکن جہانگیر عالم خوشی میں چلا ہی جا رہا تھا۔ لوگ دن کے

سفر سے تھک آگئے تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے اتنے میں کسی سردار نے کہا کہ

آج کم بخت آلو بھی نہیں بولتے۔ یہ ایک بوڑھا سردار تھا اور اکثر جہانگیری جوانی کے زمانے میں

اس کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اگر جہانگیر رات کے سفر میں آلو کی آواز سن لیتا تو فوراً

ہی قیام کا حکم جاری کر دیتا تھا۔ ہمارے مورت اعلیٰ نے جب یہ بات سنی تو وہ آلو کی بولی بولنے پر

تیار ہو گئے۔ کام بڑا خطرناک تھا۔ یہ بات صرف اس سردار اور دو سپاہیوں تک محدود تھی۔ قافلہ

آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ حضرت آگے بڑھ گئے اور ایک درخت پر چڑھ کر آلو کی طرح آوازیں

ٹکانا شروع کر دیں۔ آلو کی آواز سنتے ہی جہانگیر نے قیام کا حکم دے دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ اسی رات

کو کسی نے بادشاہ تک خبر پہنچادی کہ آلو مصنوعی تھا۔ جہانگیر نشتے میں تھا۔ اس پر اسے غصہ آنے کی

جگہ نہ رہی آگئی۔ مورت اعلیٰ صاحب طلب کئے گئے اس نے ہنس کر انہیں بوم الدولہ اور منخوس

الملک جیسے خطابات سے نوازا اور یدہ راج نگر کی جاگیر عطا کر دی۔

صولت مرزا خاموش ہو گیا اور ہنسنے لگا۔

”اس طرح میں اپنے خاندان کا آٹھواں آلو ہوں۔“ اس نے کہا اور مسکرا کر حمید کی طرف

دیکھنے لگا جو مضحکہ خیز حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔

کس طرح ایک اہم کی شکل میں ترتیب دیا ہے اور اب اس پر فریدی کے آٹوگراف لینا چاہتی ہے۔
صولت مرزا گفتگو میں حصہ ضرور لے رہا تھا لیکن اس کا ذہن کسی اور طرف معلوم ہوتا تھا۔ اکثر وہ
کوئی بات کہتے کہتے اچانک رک کر کچھ سوچنے لگتا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں آ بیٹھے۔ لیکن اب جیلہ ان کے ساتھ نہیں
تھی۔ تھوڑی دیر بعد کافی کا دور شروع ہو گیا۔ عقیلہ نے بچوں کو سونے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس
لئے ایک اکتا دینے والے ہنگامے سے نجات مل گئی تھی۔ اس دوران میں کہیں اتفاق سے صولت
مرزا نے لطیفہ چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا۔ حمید نے جواباً اتنے لطیفے سنائے کہ تھوڑی دیر بعد وہ سب ہنسنے
میں بھی کاہلی محسوس کرنے لگے۔ خصوصاً شکیلہ تو ہنسنے ہنسنے بے دم ہو گئی تھی۔

اور پھر جب فریدی نے یدہ راج گڑھ کی بات چھیڑی تو حمید کو بے تحاشہ غصہ آ گیا۔
چونکہ عقیلہ اور شکیلہ کے لئے یہ موضوع بہت پرانا ہو چکا تھا اس لئے وہ جلد ہی اٹھ گئیں اور حمید
کے ذہن پر ایک خواب ناک سی کاہلی مسلط ہو گئی۔

فریدی صولت مرزا سے ان لوگوں کے متعلق گفتگو کر رہا تھا جنہوں نے کتے کی آواز کے
متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے جدوجہد کی تھی۔

”بھئی تم نہیں جانتے۔“ صولت مرزا راز دارانہ انداز میں بولا۔ ”اس سے ایک دوسرا خط
بھی وابستہ ہے۔“

”کیا....؟“

”کسی پُر اسرار خزانے کی تلاش۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”اور یہ خزانے والی بات بھی
میرے ہی خاندان والوں کی زبانی باہر تک پہنچی ہے۔“

”وہ کس طرح....؟“ فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”بڑی لمبی داستان ہے لیکن میں اختصار کے ساتھ بتانے کی کوشش کروں گا۔ ہم سے پہلے یہ
جاگیر یدہ راج نامی ایک سردار کے پاس تھی لیکن یہ آج کی بات نہیں۔ اکبر اعظم کے دور کی بات ہے۔“

اور پھر صولت مرزا نے یدہ راج اور یدہ راج گڑھی کے متعلق وہی کچھ بتایا جو اسے سنانوس
نے بتایا تھا۔

”پھر عہد جہانگیری میں یہ جاگیر ہمارے خاندان میں منتقل کر دی گئی۔ ہم تک کیسے پہنچی یہ نہ

”اور وہ خزانے کی بات۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جاگیر کے ساتھ ہی ساتھ وہ قلعہ بھی ہاتھ آیا جو یہ راج گڑھی کے نام سے مشہور ہے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت خراب حالات میں نہ رہا ہوگا۔ یہ راج ایک دولت مند آدمی تھا۔ نے ایک بڑا شاندار تخت بنوایا تھا جس کا تذکرہ اکثر پرانی کتابوں میں ملتا ہے اور وہ اس وقت عزت و مقرب کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی شکل ایک بہت بڑے بچھو کی تھی اور وہ خالص سونے کا بے شمار جواہرات اس میں جڑے گئے تھے۔ اس نے وہ تخت اکبر اعظم کی خدمت میں پیش کر کے لئے بنوایا تھا۔ رانا کے آدمی اس کی تاک میں تھے۔ ایک رات انہوں نے گڑھی پر شب خور مارا اور یہ راج کو قتل کر کے اس کی ساری دولت سمیٹ لے گئے۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ وہ خزانے کے ہاتھ نہیں لگا اور وہ اب بھی گڑھی ہی میں کہیں پوشیدہ ہے۔ خود میری خاندانی روایت یہی ظاہر کرتی ہے۔ میرے اسلاف میں سے بھی بہتیرے اس کی جستجو کر چکے ہیں۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور خیر میں اسے بالکل ہی لغو خیال کرتا ہوں۔ اپنے خاندان میں میں بھی ہوں جس نے کبھی اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔“

فریدی خاموشی سے سن رہا تھا۔ صولت مرزا کے آخری جیلے پر وہ خفیف سا مسکرایا اور جب سے سگار نکال کر اس کا کونہ توڑنے لگا اور حمید سوچ رہا تھا کہ حکیم ارسلانوس نے اس تخت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے اس کا علم ہی نہ ہو لیکن پھر بھی وہ.... صولت مرزا سے پوچھ بیٹھا۔

”حکیم ارسلانوس صاحب بھی اس سے واقف ہی ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”واقف تو قریب قریب سبھی ہیں لیکن یقیناً بہت لوگ رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک یاد آیا۔“ فریدی بولا۔ ”یہ حکیم صاحب واقعی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ شام کو لوگ ان کے گھر گئے تھے۔ لیکن وہ بہت قاعدے سے ملے یہاں تو انہیں بالکل ہی محبوظ الحوا سمجھا تھا۔“

”جھکی آدمی ہیں۔ کبھی قاعدے کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی دماغ بالکل الٹ جاتا ہے۔ صولت مرزا نے کہا۔

”کیا وہ آپ کے کوئی عزیز ہیں۔“

”ہاں بھی قریبی ہیں۔ عقیلہ کی شادی ان کے لڑکے کے ساتھ ہوئی تھی۔“

”تو کیا وہ بچہ ان کا پوتا ہے جسے وہ آج پریشان کر رہے تھے۔“

”بس یہی دیکھو! تم نے شاید ہی کسی دادا پوتے سے یا پوتے کو دادا سے اس قدر بے تکلف دیکھا ہو۔ جاوید کو انہوں نے اس قدر سر چڑھا رکھا ہے کہ خدا کی پناہ! سارے بچے انہیں کے بگاڑے ہوئے ہیں۔“

”بہر حال وہ ایک بہت ہی پراسرار آدمی ہیں۔“ فریدی نے کہا اور حمید کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کر کے سگار سلگانے لگا۔

حمید اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا جہاں پچھلی رات وہ سویا تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا اور قدیل بجا کر لیٹ گیا۔ نیند بُری طرح مسلط تھی لیکن فریدی کے اس رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی نے اسے وہاں سے ہٹا کیوں دیا۔ کیا کوئی ایسی اہم بات بھی ہو سکتی ہے جسے فریدی صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ کہیں وہ خزانہ تو نہیں جس کا تذکرہ صولت مرزا نے کیا تھا۔ مگر وہ فریدی کی طبیعت سے واقف تھا۔ فریدی جس نے دولت کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ کیا وہ ایک رواں خزانے کے متعلق اسے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔ حمید کا ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پھر کیا بات ہو سکتی ہے۔ چند لمحے بعد اس کے خیالات کی رد و جمیلہ کی طرف بہک گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہوں۔ لیکن پھر اسے اپنی بزدلی پر ہنسی آگئی۔ پاگل سہی.... ہے تو عورت ہی اور وہ بھی گھریلو قسم کی۔ عورت نہ ہو، ہنر والی ہو سکتی ہے اور نہ چشمے والی پھر آخر خوف کی وجہ ہو سکتا ہے کہ اس پر سچ مچ ہمسیر یا قسم کا کوئی دورہ پڑتا ہو اور اگر نہ بھی پڑتا ہو تو اس کی ایسی تپسی، ایسی تپسی، ایسی تپسی.... اور پھر اس کا ذہن ”ایسی تپسی“ کی گردان کرتا ہوا نیند کی تاریک دلدل میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ سمجھا کہ شاید کسی ڈراؤنے خواب نے اسے جگا دیا ہے لیکن پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے جگا رہا ہو۔

”شش! میں ہوں۔“ اسے اندھیرے میں فریدی کی سرگوشی سنائی دی۔

”کیا بات ہے۔“ حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”آہستہ بولو۔ اس پر دورہ پڑ گیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”لاحول ولاقوة....!“ حمید دوبارہ لیتا ہوا بولا۔ ”اور شاید اب اس کے بھوت آہستہ آہستہ

آپ کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ ناخن کے عقل.... عقل.... ل.... کے ناخن لیجئے۔“

”عقل کے بچے۔ چپ چاپ اٹھ جاؤ۔“ فریدی نے اسے کھینچ کر اٹھالیا۔

”میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دوں گا۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”تمہارے حلق سے آواز ہی نہ نکل پائے گی۔“ فریدی نے اس کی گردن پکڑ لی۔

”ارے ارے۔“ حمید پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

”چپ چاپ چلے آؤ۔“

”خدا نے مجھے آدمی بنا کر سخت ظلم کیا ہے۔“ حمید جھنجھٹاتا ہوا چپل کی تلاش کرنے لگا۔

”جلدی کرو۔“

اور پھر وہ دونوں آہستہ سے برآمدے میں آگئے چاروں طرف تاریکی اور سنائے کاراج تھا۔

حمید فریدی کے پیچھے پیچھے چلتے لگا۔ وہ جھاڑیوں اور مہندی کی باڑوں کی آڑ لیتا ہوا عقبی پارک کی

طرف بڑھ رہا تھا۔ پارک میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بعد میں حمید نے دیکھا کہ وہ ایک

مشعل کی روشنی تھی۔ جیلہ اپنے ہاتھوں میں مشعل اٹھائے اور بلباں ہاتھ سینے پر رکھے بتوں کے

درمیان کھڑی تھی۔ وہ دونوں ڈانٹا کے بت کے قرب و جوار میں اگی ہوئی مالتی کی جھاڑیوں میں

چھپ گئے۔ اس وقت جیلہ سچ گچ اب سے ہزاروں برس پہلے کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ٹخنوں

تک لپٹا ہوا ڈھیلا لبادہ اس وقت جدید طرز کا سلپنگ گاؤن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بال پشت پر

بکھرے ہوئے تھے اور ایک سرکش سی لٹ چہرے کے سامنے لہرا رہی تھی اور مشعل کی سرخ روشنی

میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح مہک رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر ایک بت کے سامنے آئی اور

اس کے چہرے کے برابر مشعل لے جا کر کہنے لگی۔

”تم کبھی نہیں بولو گے! کاش تمہارے پتھر لے جسم کے اندر خون کا ایک قطرہ بھی ہوتا۔

میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ زفورس کیا میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر مرجاؤں۔ خیر

اگر تم یہی چاہتے ہو تو اس جسم کو بھی مٹی کے کیڑے کھا جائیں گے اور ہڈیوں کا پتھر بھی ایک دن

خاک ہو جائے گا۔ بولو زفورس کیا تمہیں وہ شام یاد نہیں جب ہم نیل کے شفاف پانی پر اپنے طلائی

ہیزے میں سیر کر رہے تھے اور ہم نے مغرب کی طرف سرخ دھوئیں کے بادل دیکھے تھے اور تم

نے کہا تھا کہ بادلوں کی دیوی قربانی چاہتی ہے۔ پھر ہم دوسرے دن سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔

بادلوں کی دیوی کا مندر جو دودھ کی طرح شفاف اور اجلا ہے وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ تم نے سب

کچھ بھلا دیا؟ تم نے اسیل مرغ قربان کرتے وقت کہا تھا کہ تم زندگی بھر میرے ساتھ رہو گے۔

تم سب کچھ بھول گئے۔ زفورس تمہیں قسم ہے۔ اس قصر زمردین کی جہاں سب سے بڑے معبود

کے غلام رہتے ہیں۔ جہاں فضاؤں میں طلائی ابا بلیں پرواز کرتی ہیں۔ سب سے بڑے معبود کے

مرکب مقدس نیلے کی قسم مجھے تو سب کچھ یاد ہے جیسے وہ کل ہی کی بات ہو۔ عود عنبر کے

دھوئیں کے پیچھے لو دیتا ہوا چہرہ یاد ہے۔ بادلوں کی نسیم تن دیوی کا مقدس چہرہ اس کی ملکوتی

مسکراہٹ یاد ہے۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ زفورس لیکن تم نے؟ کیا تمہارے فولادی بازو تھک گئے۔

کیا تمہارے ممر سے تراشے ہوئے سڈول سینے پر جھریاں پڑ گئیں۔ میں چند اجنبیوں میں قید ہوں۔

کیا تم مجھے رہائی نہیں دلا سکتے۔ میں جو سیاہ فام باغیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا کرتی تھی میں جو

بچپن میں سانپوں سے کھیلا کرتی تھی۔ میں جس نے ہر اتلیس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے نکال لی

تھیں۔ ایک معصوم فاختہ کی طرح بے بس ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر اس نے اپنا چہرہ بائیں ہاتھ سے چھپالیا۔

”میں اس کو ڈبری کی چاکلیٹ کھلاؤں گا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

فریدی کچھ نہ بولا۔

”اچھا میں تو چلا....!“ حمید نے پھر کہا۔

”کہاں....!“ فریدی نے پوچھا۔

”اسی کے پاس، اس سے جا کر کہوں گا۔ جان من۔ میں تمہارا زفورس ہوں۔ باپ کا نام

پوچھنے گی تو چورس بتاؤں گا پھر نہایت ادب سے ایک چاکلیٹ پیش کر کے یا تو تارک الدینا

ہو جاؤں گا یا اس کی بڑی بہن سے شادی کر لوں گا۔ اس طرح بچے مفت ہاتھ آئیں گے۔“

”چپ رہو سو۔“ فریدی ہنسی ضبط کرتا ہوا بولا۔

”پتہ نہیں کس کس الا بلا کی قسم کھا رہی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”قسم ہے اس ولا تخی خرگوش کی

جو سال میں تیس انڈے دیتا ہے۔ یہ لڑکی کسی رات صولت مرزا کو قتل کر کے نکل جائے گی۔ اس کے سر پر فلم کمپنی کا بھوت سوار معلوم ہوتا ہے۔“

”بکو مت....!“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔

پھر انہوں نے جیلہ کی سسکیوں کی آوازیں سنیں، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”بھئی مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتی۔“ حمید نے کہا۔

”چپ رہو گدھے! صولت مرزا بھی یہیں کہیں چھپا ہو گا۔“

”ازے یہ کیوں!“

فریدی نے کوئی جواب دیئے بغیر حمید کا شانہ دبا دیا۔ اس کی نظریں سامنے اٹھ گئیں اور اگر فریدی نے دوسرے ہی لمحے میں اس کا منہ بھی نہ دبا دیا ہو تا تو اس کی چیخ سارے پارک میں اٹھی ہوتی۔ بت کے پیچھے سے پانچ قد آور آدمی نکل آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے اور خم کھائی ہوئی مستطیل ڈھالیں تھیں۔ لباس قدیم رومن یا یونانی سپاہیوں جیسا تھا۔ سروں پر آہنی خود تھے اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز وہ روشنی تھی، جو ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی تھی بلکہ زرد رنگ کی روشنی جس کا عکس ان کے سینوں پر پڑی ہوئی چمکدار زرہوں پر پڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے مشعل کی روشنی کے احاطے سے باہر تھے۔ دفعتاً جیلہ ان کی طرف جھٹی۔

”تم آگئے۔ بتاؤ زورس کہاں ہے۔ آج تم مجھے لے کر ہی جاؤ گے۔ بولو جواب دو۔“

ان میں سے ایک کے ہونٹ ہلے رہے، جیسے وہ کوئی بات کہہ رہا ہو۔ لیکن آواز نہ دار۔ پھر وہ سب تعظیماً جھکے۔

جیلہ نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا جس کے ہونٹ ہلے تھے۔

”میں کچھ نہیں سن سکتی۔“ زور سے بولو۔ ”کیا تم بہرے ہو۔“

اس کے ہونٹ پھر ہلے۔ لیکن آواز نہ نکلی۔ اس بار جیلہ نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا جس کی آواز فریدی اور حمید نے صاف سنی۔ تھپڑ کھانے کے باوجود بھی وہ بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔

حمید بڑی طرح کانپ رہا تھا۔

”کیوں اب کیا خیال ہے بیٹا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”نکلنے لگی جان۔“

حمید بدستور خوف کے مارے دانت کلکنا تارہا۔

تھپڑ کھانے والے نے اپنا نیزہ اور ڈھال زمین پر ڈال دیئے اور پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر تشنجی کیفیت طاری ہو گئی۔

حمید فریدی سے لپٹا جا رہا تھا۔ ادھر اس پُر اسرار آدمی کی حالت غیر نظر آرہی تھی۔ بقیہ چار خاموش کھڑے تھے۔ دفعتاً وہ پھر اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ اس بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرہ بھی زندہ آدمیوں جیسا معلوم ہو رہا تھا۔

”نقارہ....!“ اس کے ہلے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

”اے وادی نیل کی بیٹی۔“ اس نے زمین سے اپنا نیزہ اور ڈھال اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تو اس نقارے کے بغیر اس طلسم سے نکل نہیں سکتی۔“

اس کی آواز آدمیوں جیسی نہیں تھی۔ اس میں کچھ عجیب سا کھوکھلا پن موجود تھا۔ ویران ویران سی آواز۔

”میں نہیں جانتی تو کس نقارے کا ذکر کر رہا ہے۔“

”وہ اسی عمارت میں کہیں موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

دفعتاً فریدی نے حمید کو پرے ہٹا دیا اور جھاڑیوں سے نکل کر ایک طرف ریٹکنے لگا۔ حمید نے بھی اس کی تقلید کی۔ ادھر نہ جانے کیوں جیلہ نے مشعل زمین پر گرادی اور اس پر پیر رکھ کر اسے بچھا دیا۔ پارک میں تاریکی چھا گئی۔ صرف ان پانچ آدمیوں کے چہرے روشن تھے۔ اچانک حمید کو بعض دیوتاؤں کی تصویریں یاد آگئیں جن کے چہروں کے گرد روشنی کے ہالے ہوتے ہیں۔ کیا یہ اسی قسم کی ملکوتی روشنی تھی۔ اس کا دل ایک بار پھر تھرا گیا۔

آسمان پر پھر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ اندھیرا پہلے سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ فضا میں انتشار برپا کئے ہوئے تھی۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے ان پُر اسرار آدمیوں کے چہرے صاف نظر آرہے تھے اور اب تو ان میں حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ چل رہے تھے۔ فریدی اور حمید جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ دفعتاً فریدی ٹھٹھک گیا۔ وہ اصطبل کی طرف جا رہے تھے اور شاید جیلہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ حمید نے فریدی کے ہاتھ میں دبا ہوا پتلی کی دُور کا ایک لچھا دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ آخر وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ فریدی کو کس طرح روکے اس نے کئی بار کچھ کہنا چاہا لیکن منہ آواز نہ نکلی۔ بس وہ مشینی طور پر فریدی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس کے اس فعل میں ارادے کو تو دخل نہیں تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ساری قوت کسی پراسرار طریقے پر زور ہو گئی ہو۔ بہر حال وہ فریدی کے ساتھ گھٹنا پھر رہا تھا۔

جیلہ ان آدمیوں سمیت اصطبل میں داخل ہو گئی۔ حمید کو یاد آیا کہ فریدی نے اس سلسلہ اصطبل ہی کا تذکرہ کیا تھا۔ آخر اصطبل میں کیوں! فریدی کے خیال کے مطابق انہیں شاید کسی کی تلاش تھی۔ اس وقت اس نے ان کی زبان سے ”نقارے“ کا نام بھی سنا تھا۔ اگر انہیں کون نقارے کی تلاش تھی تو پھر بار بار اصطبل کا رخ کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ حمید کے ذہن میں بیک وقت کئی سوال تھے۔ اگر وہ واقعی اب سے ہزاروں سال قبل کے مردے تھے تو ان کا یہاں کام! ظاہر ہے کہ جیلہ صولت مرزا کی لڑکی نہیں تھی۔ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک مخصوص حالت کے تحت خود کو اس کی قیدی سمجھنے لگے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن کم از کم حمید کا ذہن اب اس بات کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ وہ کسی ذہنی مفرغ میں مبتلا ہے۔ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو جانے کے بعد صرف مریض ہی کو عجیب و غریب تشکیر نظر آ سکتی تھیں۔ دوسروں کو نہیں۔ پھر یہ کیا راز ہے۔ حمید اس قسم کی گھٹیوں میں الجھا ہوا فریدی کے ساتھ ساتھ ریٹکتا رہا۔ پھر فریدی اصطبل کے قریب پہنچ کر رک گیا اور تھوڑی دیر بعد لوگ باہر نکل آئے۔ دفعتاً فریدی نے رسی والا ہاتھ بلند کر کے اسے گردش دی اور دوسرے لمے میں رسی اس کے ہاتھ سے نکل کر پراسرار آدمیوں کی طرف جھپٹی اور پھر ان کے چہروں کی روشنی غائب ہو گئی۔ ادھر فریدی نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور اندھیرے میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ ”خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلے تو گوئی مار دوں گا۔“ فریدی کی گرج دار آواز دور تک لہرائی چلی گئی۔

لیکن جواب میں کسی قسم کی آواز نہ سنائی دی۔ فریدی نے رسی کو کھینچنے کے لئے زور لگا شروع کر دیا۔ مگر بے سود۔ آخر اس نے بائیں ہاتھ سے نارچ نکالی۔۔۔ اور روشنی ہوتے ہی اس کے منہ سے حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ اصطبل کے قریب جیلہ تنہا کھڑی تھی اور رسی کا دوسرا اصطبل کے سانہان کے ستون کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ فریدی دیوانہ وار چاروں طرف دوڑنے لگا۔

جیلہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

”ٹھہر جاؤ، ٹھہر جاؤ۔“ قریب ہی کہیں صولت مرزا کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس دوران میں فریدی نے پورے پارک کی دوڑ لگا ڈالی۔ لیکن ان پراسرار شخصیتوں کا سراغ نہ ملا۔

”بڑے دلیر ہو۔۔۔۔ بہت دلیر۔“ صولت مرزا نے فریدی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم نے بہت بُرا کیا۔“

”یقیناً میں نے بُرا کیا کہ انہیں نکل جانے دیا۔“

”یہ بات نہیں۔ وہ ہرگز ہماری دنیا کے آدمی نہیں ہیں۔“ صولت مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ تمہاری کند کہاں بھنسی ہے۔“ صولت مرزا نے رسی کی طرف اشارہ کیا۔

”تو پھر گرا کون تھا۔“

”میں۔۔۔۔!“ صولت مرزا بولا۔ ”ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔“

جیلہ ڈرامائی انداز میں آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”اب کیا ہو گا۔“ حمید بولا۔

”اچھا جی! آپ بھی بہک رہے ہیں۔“ فریدی نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

جیلہ ان کے قریب آ کر رک گئی۔

صولت مرزا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ فریدی نے جھپٹ کر جیلہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”پاگل لڑکی۔“ فریدی کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ کیونکہ جیلہ اس کی گرفت سے نکل جانے کے لئے بُری طرح زور لگا رہی تھی۔

”اب تو بہتر یہی ہے کہ میں اسے زہر دے دوں۔“ صولت مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اندر چلو۔“ فریدی نے اسے عمارت کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

بہزار وقت وہ اسے اس کے کمرے میں لائے۔ یہاں اسی جدوجہد میں اس کا ہاتھ میز پر جا پڑا اور دوات ایک کتاب پر الٹ گئی۔ وہ ان پر بُری طرح خفا ہوتی رہی.... نہ جانے کتنی مغفلات بنا ڈالیں پھر تقریباً دو بجے اسے نیند آگئی۔

بے تکے اشعار

دوسرے دن صبح جب فریدی اور حمید ناشتہ کرنے کے لئے اندر جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک کمرے میں جیلہ کی آواز سنی جو کسی پر بگڑ رہی تھی۔

”میری میز پر سیاہی کس نے گرائی.... صاف صاف بتاؤ، ورنہ کھال ادھیڑ دوں گی۔ حرام خور۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ سچ بتادو، ورنہ تم سب کی شامت آجائے گی۔“

فریدی نے دروازے کو خفیف سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ جیلہ کے سامنے تین نوکرانیاں سر جھکائے کھڑی تھیں وہ ان پر برس رہی تھی۔

”محترمہ یہ حماقت مجھ سے ہوئی ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”آپ سے؟“ وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔ ”آپ میرے کمرے میں۔“

”جی ہاں! رات آپ کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔“

جیلہ خاموشی سے فریدی کو دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے نوکرانیوں کو باہر جانے کے لئے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔“ جیلہ بولی۔

”کس سلسلے میں۔“

”عجیب بات ہے کہ میری طبیعت خراب ہوتی ہے اور مجھے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ روز صبح ایک نہ ایک نئی کہانی سنتی ہوں، میں کس طرح یقین کروں کہ مجھ پر دورہ پڑتا ہے۔ اباجانی کا خیال ہے کہ زیادہ پڑھنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ لہذا میں نے تقریباً ایک ماہ تک کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن گھر والوں کے بیان کے مطابق مجھے اس حال میں بھی دوروں سے نجات نہیں

لی۔ اوہ.... خیر چلے، شاید آپ لوگ ناشتے کے لئے جا رہے تھے۔“

وہ ان کے ساتھ ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں ایک بار بھی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے یہ ساری باتیں ہوش میں کی تھیں۔ لیکن حمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب بھی اپنے ہوش میں نہ ہو اور کسی بھی لمحے میں پلٹ کر اس کی گردن دبوچ سکتی ہے۔ وہ ڈرائینگ روم میں آئے۔ یہاں صولت مرزا عقیلہ اور شکیلہ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

ناشتہ کے دوران میں زیادہ تر خاموشی رہی۔ شکیلہ جب بھی زیادہ بولنے کی کوشش کرتی جیلہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگتی تھی۔ عقیلہ کی گھریلو قسم کی باتوں پر اس کے ہونٹ سکڑ جاتے تھے۔ عقیلہ کے بچوں سے تو وہ بُری طرح میز پر معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ فریدی میں خاص طور پر دلچسپی لے رہی تھی۔

”اباجانی کہتے ہیں کہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔“ جیلہ نے فریدی سے کہا۔

”خاک بھی نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”البتہ فرصت کے اوقات میں تھوڑا بہت پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔“

”یونانی اساطیر کا مطالعہ کیا ہے آپ نے؟“

”شاید....!“ فریدی اثباتی انداز میں مسکرایا۔

”مجھے یاد نہیں پڑ رہا ہے کہ اس دیوی کا کیا نام تھا جس نے ناری سس کو خود پرستی کی بدو عادی تھی۔“

”ڈائنا....!“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

”ڈائنا.... ڈائنا....“ جیلہ سر ہلا کر بولی۔ ”میری یادداشت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔“

حمید شکیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے چپ چاپ ناشتہ کر رہی تھی۔

ناشتہ کے بعد لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں اور وہ لوگ وہیں بیٹھے رہے۔

”اس وقت وہ قطعی ہوش میں ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”ہاں! لیکن اب بھی اب میں عاجز آ گیا ہوں۔ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے۔ نہ جانے وہ پانچوں کون ہیں۔“ نواب صاحب تشویش کن لہجے میں بولے۔

”آپ رات کو ان کا کمرہ باہر سے مقفل کیوں نہیں کرا دیا کرتے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا بتاؤں یہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوا۔ پہلے تو وہ بڑھاپا جاتی رہی پھر اپنا سر دیوار سے ٹکرا کر زخمی کر لیا۔ بھلا بتاؤ ایسی صورت میں کیا ہو سکتا ہے۔ بس ہوتا ہے کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی ذات بھر جاگتا رہتا ہے اور ادھر کئی دن سے میں ہی جاگ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان پانچوں پر میرے علاوہ کسی اور کی نظر پڑے۔“

”واقعی آپ بڑے صبر آزما حالات سے دوچار ہیں۔“ فریدی نے مغموم لہجے میں کہا۔
”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب وہ اپنی پیچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ بھول جاتی ہیں تو پھر انہیں اپنی مادری زبان کیونکر یاد رہتی ہے۔“

”ارے میاں! اس کا بھی بڑا لمبا قصہ ہے۔“ صولت مرزا نے چائے دانی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”شروع شروع میں اس پر گونگے دورے پڑتے تھے اور وہ تیرہ سال کی عمر میں کسی چھ ماہ کے بچے کی طرح صرف غوں غوں کر لیا کرتی تھی۔ پھر ایک سال بعد اس نے خور سال بچے کی طرح ہکلا ہکلا کر بولنا شروع کیا اور یہ اتنی صاف زبان اسے سات سال کے عرصے میں حاصل ہوئی ہے۔“

”تو گویا دورے کی حالت میں ان کی بات چیت غوں غوں سے شروع ہوئی ہے۔“
”ہاں قطعی۔“ صولت مرزا نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”دورے کی حالت میں اس نے زبان سیکھی ہے۔“

فریدی پر خیال انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔
”لیکن مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔“ صولت مرزا پھر بولا۔
”میں تو آپ کو یہی رائے دوں گا کہ آپ انہیں انگلینڈ یا کسی دوسرے مغربی ملک میں لے جا کر عمدہ سائیکو انیلیلٹ کو دکھائیے۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو میں ایک سائیکو انیلیلٹ کے لئے آپ کو تعارفی خط بھی دے سکتا ہوں۔ لنڈن کے ویسٹ انڈ میں ڈاکٹر ٹائیلون بہت مشہور آدمی ہے۔ وہ زیادہ تر ذہنی امراض کا علاج بہت اچھی طرح کرتا ہے۔“

”ارے میاں وہ کسی لمبے سفر کے لئے تیار ہی نہیں ہوتی۔ کئی بار کہا مگر جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ اب میرے لئے دور استے رہ گئے ہیں یا تو بدنامی برداشت کروں یا خود کشی کر لوں۔“
”بھلا اس میں بدنامی کی کیا بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ظاہر ہے کہ وہ ایک مرض میں مبتلا

”ہیں۔“
”لیکن اگر کسی اور نے بھی ان آدمیوں کو دیکھ لیا تو کیا خیال کرے گا۔“
”ہاں یہ بات ضرور قابل تشویش ہے۔“

صولت مرزا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے چہرے کی رہی سہی توانائی بھی بڑھاپے کے اضمحلال میں تبدیل ہو چکی تھی اور آنکھوں سے ایک غم انگیز سنجیدگی ظاہر ہونے لگی تھی۔
فریدی بخور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سر جٹ حمید غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ کیا سوچنا چاہئے۔ اس وقت جیلہ کو ہوش میں گفتگو کرتے سن کر وہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اگر وہ سب کچھ حقیقتاً محض ڈھونگ ہی تھا تو اس ڈھونگ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ سوچتا رہا اور پھر اسے اس ڈھونگ والے نظریے کو سرے ہی سے مسترد کر دینا پڑا۔ کیونکہ دوسری طرف صولت مرزا کا یہاں بچوں کی طرح زبان سیکھنا تیرہ سال کا بچہ ذہن اتنی مکمل اور جامع اسکیم نہیں بنا سکتا۔ خیر اچھا اگر اسے مرض ہی تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان پر اسرار آدمیوں کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔“
”تو پھر بتاؤ نا کہ میں کیا کروں۔“ صولت مرزا نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”آپ مطمئن رہئے۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”مرض کے لئے تو خیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ پانچ آدمی۔“

فریدی کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ نوکر نے ارسلانوس کی آمد کی اطلاع دی۔
ارسلانوس اپنی تمام تر وحشتوں سمیت ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اس نے ایک عجیب سا قہقہہ لگایا اور پھر یک بیک سنجیدہ ہو کر احمقوں کی طرح ایک ایک کا منہ تکتے لگا۔
”فرمائیے۔“ صولت مرزا نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔
ارسلانوس اسے چند لمحوں تک عجیب نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”تمہارا لہجہ کچھ ایسا ہے جیسے میں تم سے کچھ ادھار مانگنے آیا ہوں۔“

”دیکھیے! اس وقت طبیعت حاضر نہیں ہے۔“ صولت مرزا نے منہ بنا کر کہا۔
”تو تم بھی غیر حاضر ہو جاؤ نا.... میں تو ان مہمانوں سے ملنے آیا ہوں۔“
صولت مرزا نے اسامہ بنا کر کھڑا ہو گیا اور کچھ کبے بغیر تیزی سے مڑا اور اندر چلا گیا۔
ارسلانوس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ وہ صولت مرزا کے

چلے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے وہ گیا تھا۔ یک چوہ کر فریدی کی طرف مڑا۔

پھر وہ وہاں سے اٹھ کر نشست کے کمرے میں آئے۔

”ہاں تو محمد کمال افندی صاحب! کہتے رات کیسے گزری۔ آپ کی چوٹ کا کیا حال ہے۔“ نے پوچھا۔

”احمد کمال فریدی کہتے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”رات اچھی گزری اور چوٹ میں کافی آفاقہ معلوم ہوتا ہے۔“

”آفاقہ.... بابا بابا۔“ ارسلانوس نے قہقہہ لگایا۔ ”آفاقہ۔“

”بھلا اس میں ہسنے کی کیا بات تھی۔“ حمید نے جڑبڑہو کر کہا۔

”ایک واقعہ یاد آگیا تھا اپنے بچپن کا۔“ ارسلانوس ہنسی روکتا ہوا بولا۔ ”لیکن میں بتاؤں نہیں۔“

”کیا کہا۔“ حمید مصنوعی غصے کا اظہار کر کے اٹھتا ہوا بولا۔ ”آپ کو بتانا پڑے گا۔“

فریدی حمید کو گھورنے لگا۔

”میں بے ہودگی نہیں پسند کرتا۔“ ارسلانوس نے کرخٹ لہجے میں کہا۔

”آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ کیوں بنے تھے۔“

”حمید....!“ فریدی نے اسے ڈانٹا۔

”آپ مت دخل دیجئے۔“

ارسلانوس بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اٹھنے کا انداز لڑمڑنے والا ضرور تھا لیکن چہرہ پر اس قسم کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غیر ارادی طور پر اس سے کوئی حرکت سرزد ہونے والی ہے۔

فریدی اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ یک بیک ان کے درمیان میں آگیا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ فریدی ارسلانوس کو صوفے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔

”بزرگوں کو اتنا تیز مزاج نہ ہونا چاہئے۔“

پھر اس نے پلٹ کر حمید کو ڈانٹا۔

بدقت تمام وہ ارسلانوس کو بٹھانے میں کامیاب ہو سکا۔ حمید بھی چپ چاپ بیٹھ گیا۔ لیکن وہ ابھی تک اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس نے دراصل یہ چھیڑ چھاؤ مذاق شروع کی تھی۔ لیکن اب نہ جانے کیوں اسے سچ مچ غصہ آگیا۔

”میاں تم میں رکھا ہی کیا ہے۔“ ارسلانوس ہاتھ نچا کر بولا۔ ”ایک منٹ کی گرفت میں ہڈیاں

کڑکڑا جائیں گی۔ میں نے صاحب کے لوٹنے کو تو ٹھیک ہی کر دیا۔ تم کیا مال ہو۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”ہم واقعی آپ کے سامنے بچے ہیں۔ بھلا

آپ کی پرانی ہڈیوں کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں۔“

ارسلانوس اب فریدی کو گھورنے لگا۔ حمید کم از کم اپنے متعلق تو یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ارسلانوس

سے زیادہ دیر تک نظریں نہیں ملا سکتا۔ کیونکہ اسے اس کی آنکھوں کی پراسرار ویرانی بڑی ڈراؤنی

معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس وقت فریدی کی آنکھوں کو اس کی آنکھوں کے مقابل دیکھ رہا تھا۔

ارسلانوس خوفناک حد تک سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

دفتر ارسلانوس پھر ہنس پڑا اور اب وہ احمقوں کی طرح حمید کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ فریدی

سگڑا سگڑا لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کس خط میں مبتلا ہو۔“ اچانک ارسلانوس فریدی کی طرف مڑ کر

بولا۔

”لیکن تم بھی دوسرے احمقوں کی طرح مفت اپنی جانیں ضائع کر دو گے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”مطلب....!“ ارسلانوس نے تیز قسم کی سرگوشی کی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں سنجیدگی سے پوچھا۔ ”میں کل شام ہی کو سمجھ گیا تھا کہ

تم یہ ہراج گڑھی کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہو۔“

”بھلا کیوں!“ فریدی استنبہامیہ انداز میں سر ہلا کر مسکرایا۔

”تخت عقرب کے لئے۔“ سونے کا وہ فرضی تخت جس کے لئے سینکڑوں جانیں جا چکی ہیں۔

تمہیں یہاں کھینچ لایا ہے۔“

”تو کیا آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔“ فریدی اس کے قریب آکر بیٹھتا ہوا بولا۔
 ”یہی جانتا ہوں کہ اب وہ ایک شاندار غپ ہے۔ میرے پاس اس کا واضح ثبوت موجود ہے
 کہ رانا کے سپاہی یدھ راج کی دوسری دولت کے ساتھ اسے بھی لے گئے تھے۔“
 ”میرے خیال سے تو آپ کا یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔“ فریدی نے کہا۔
 ”اودہ تم میری معلومات کو چیلنج کر رہے ہو۔“ ارسلانوس بگڑ کر بولا۔
 ”دیکھئے آپ پھر غلط سمجھے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی معلومات کو چیلنج
 نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اپنی معلومات کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔“
 ”تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔“ ارسلانوس نے تسخرانہ انداز میں پوچھا۔
 ”بعض قدیمی قلمی کتابیں۔“
 ”کس کی لکھی ہوئی ہیں۔“

”نام تو مجھے یاد نہیں رہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن میں یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں
 کہ“ فریدی جملہ پورا نہیں کرنے پایا تھا کہ اندر کچھ شور سانسائی دیا اور وہ چونک کر اس کی طرف
 متوجہ ہو گیا۔
 ”کہو کہو! یہاں تو سب ہوتا ہی رہتا ہے۔“ ارسلانوس بیزاری سے بولا۔
 ”کیا ہوتا رہتا ہے۔“

”اونہ چھوڑو بھی۔ تم شاید اپنی معلومات کا رعب جمار ہے تھے مجھ پر... ہاں... جاری رکھو۔“
 ”بہت مختصر سا بیان ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”مجھے تخت عقرب یا تخت افعی سے کوئی
 دلچسپی نہیں۔ میں تو اس کتے کی آواز کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”یہ اس سے بھی بڑی حماقت ہے۔ یار سچ سچ تم اپنے باپ ہی کی طرح پاگل معلوم ہوتے ہو۔“
 فریدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پر خیال انداز میں کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا اور اس کے
 چہرے پر اکتاہٹ کے آثار تھے۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ ارسلانوس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔

”کیا وہاں نہ چلے گا۔“ حمید نے فریدی کو مخاطب کیا۔

”اوں...!“ فریدی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اودہ تو یہ کہو۔“ ارسلانوس منہ بنا کر بولا۔ ”میں لوٹنا نہیں ہوں۔ صاف صاف کیوں نہیں

”چلتے ہو یا گردن میں ہاتھ دوں۔“

”کیا مصیبت ہے چلتے صاحب۔ کاش میرے والد صاحب زندگی بھر کنوارے ہی رہتے۔“
”اب کھنکھو بھی ورنہ تمہیں تو ناپید ہا کر دوں گا۔“

وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک چکیلی سی نسوانی آواز سنائی دی۔
”سنئے۔“

دونوں چونک کر مڑے۔ صولت مرزا کی چھوٹی لڑکی شکیلہ عقی دروازے میں کھڑی فریدی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”فرمائیے۔“ فریدی اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

وہ فریدی سے آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی۔ اس کے انداز میں کچھ ہچکچاہٹ سی تھی۔ حمید متحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ارے بھی میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”خیر چلتے۔“

فریدی حمید کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے اس کے ساتھ چلا گیا اور حمید پائپ میں منہ دبا کر اپنا سر سہلانے لگا۔ اس کی آنکھیں مضحکہ خیز طور پر اپنے حلقوں میں گردش کرنے لگی تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے لیکن فریدی واپس نہ آیا حمید اکتا کر برآمدے میں نکل جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس بار کسی دوسری عورت نے اسے مخاطب کیا۔

وہ بوکھلا کر مڑا۔ صولت مرزا کی دوسری بڑا سراسر لڑکی جلیلہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جلیلہ عادت کے مطابق اس وقت بھی اپنی تکیہ سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”فنف.... فرمائیے۔“ حمید ایک قدم پیچھے ہٹا ہوا بولا۔

”چلے جاؤ.... تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ ڈرمانی انداز سے تیز قسم کی سرگوشی میں بولی۔
اس کی آنکھیں حد درجہ خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ ہونٹ بھیجنے ہوئے تھے اور ماتھے کی سلوٹیں اور زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گئی۔

”چچ.... چلے.... جائیں گے.... بب.... تیل.... بالکل چلے جائیں گے۔“ حمید پیچھے کھسکا ہوا بولا۔

”چند لمحے کھڑی اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی اور حمید بوکھلا کر برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فریدی نے اسے آواز دی اور وہ جواب دینے کی بجائے دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔“

”کیا بات ہے۔“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

حمید تیزی سے اس کی طرف مڑا کچھ کہنا چاہا۔ ہونٹ ہلے۔ غصے کی شدت کی وجہ سے آواز نہ نکلی۔
”کیوں؟ کیا تم ان رات والے آدمیوں کی اینٹنگ کر رہے ہو۔“

”جناں۔“ حمید زہریلے لہجے میں بولا۔ فریدی کو چند لمحے گھورتا رہا پھر بیک بیک برس پڑا۔
”جہنم میں گئی دوستی اور محبت۔ میں اس بھوت خانے میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رہ سکتا۔“
”آخر کچھ بتاؤ بھی تو۔“

حمید کوئی جواب دیئے بغیر اس کمرے کی طرف چل پڑا جس میں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔
فریدی اس کے پیچھے چلنے لگا۔

”یار تم تو کسی خونخوار بیوی کی طرح پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھتے دیتے۔“ فریدی نے اسے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”کچھ منہ سے بولو بھی تو۔“

”مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“ حمید بھنکا کر بولا۔ ”کیا اس شیطان کی نواسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”کس سے۔“

”بھوتوں کی محبوبہ سے۔“

”کیا جلیلہ سے بڑبھڑ ہو گئی۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”اے ہے۔“ حمید جھلاہٹ میں ہاتھ نچا کر بولا۔ ”اس وقت ملی ہوتی تو یہ مسکراہٹ حلق سے اتر جاتی۔“

”آخر بات کیا ہے۔“

حمید خود ہی اس وقت بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح فریدی کو سمجھا بجا کر یہاں سے نکال لے جائے۔ لہذا اس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

فریدی کچھ سوچ رہا تھا۔

”اچھا ٹھہرو.... میں ابھی آیا۔“ فریدی نے کہا اور اندر چلا گیا۔

حمید برآمدے سے نکل کر لان پر اتر آیا۔ وہ بار بار بوکھلا کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگتا تھا کہ کہیں جیلہ تو نہیں آ رہی ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد فریدی پھر دکھائی دیا۔ گہرے تفکر کی وجہ سے اس کے ماتھے پر رگیں ابھر آئی تھیں وہ حمید کو چند لمحے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔
”آؤ چلیں۔“

”اچھا.... اچھا.... میں سامان سیٹھا ہوں۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”ہم یدھ راج گڑھی جارہے ہیں۔“ فریدی نے کہا اور حمید کا ہاتھ پکڑ کر پھاٹک کی طرف چلے لگا۔

حمید کا دل چاہا کہ یا علی کا نعرہ مار کر سر کے بل کھڑا ہو جائے۔

”سنو! وہ اس وقت قطعی ہوش میں تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”اس کی....!“ حمید اس سے آگے نہ کہہ سکا۔

”چپ رہو۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”پہلے میں سمجھا تھا کہ شاید اس وقت بھی اس پر دروازہ پڑا ہو گا۔ مگر ایسا نہیں۔ صولت مرزا سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ صبح سے اب تک سوئی ہی نہیں لہذا اپنے ہوش میں ہے۔“

”ہوش میں ہو یا نہ ہو۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔“

”عورت ہے پیارے.... اور حسین بھی ہے اس کے علاوہ تمہیں اور کیا چاہئے۔“

”مجھے تو بس اب میں گز کفن چاہئے۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”خیر اس کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔ فی الحال تو میرے ساتھ چلو۔“

حمید منہ پھلائے ہوئے اس کے ساتھ چلے لگا۔ فریدی کچھ سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے ایک کاغذ کا ٹکڑا حمید کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”یہ کیا....؟“ حمید نے پوچھا۔

”پڑھ لو۔“

حمید نے اسے پڑھ کر بُرا سا منہ بنایا۔ اس میں کچھ بے سرو پا اشعار لکھے تھے۔

دھن دھن دھن نقارہ باجے

بچھو پر یدھ راج براجے

نقارے میں ڈنگ لگا ہے

مہابلی کا نقارہ ہے

بچھو پر الو بیٹھے گا

ڈنگ پر چڑھ کر راج کرے گا

حمید استفہامیہ نظروں سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیوں؟ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”آپ مجھے الو کیوں سمجھنے لگے ہیں۔“

”محض اس لئے کہ ہم لوگ آٹھویں الو کے مہمان ہیں۔ کیا تم مجھ سے کسی پاگل پن کی توقع

رکھ سکتے ہو؟“

”آپ پر کیا منحصر ہے میں خود کو ہی پاگل سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔“

”خیر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان اشعار کا مطلب سمجھئے۔“

”اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔ ”البتہ زبانی یاد کرنے کی کوشش

کروں گا اور جب میرے بچے اس قابل ہو جائیں گے تو انہیں بھی یاد کرا دوں گا اور انہیں وصیت

کر جاؤں گا کہ وہ اپنے بچوں کو یاد کرا دیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس سے اچھے شعر کبھی نہ کہہ

سکیں گے۔“

فریدی کوئی جواب دینے کے بجائے مسکراتا رہا۔

مجھے یہ اشعار شکلیہ سے ملے تھے۔

ایک اشارہ

حمید بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”خیریت.... خیریت۔“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔

”یہ لڑکی بھی پاگل ہی معلوم ہوتی ہے۔“
”کیوں؟“

”بھلا ان مہمل اشعار سے ذہن کے اس گوشے کا کیا تعلق جہاں عشق کے کیرے کھلا رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”اسے تو عشقیہ اشعار یا فلمی گیت لکھنے چاہئے تھے۔ مثلاً مار کٹاری مر جانا... ہو گئی رے میں تو ہو گئی... یا پھر دل لے کے چلے تو نہیں جاؤ گے ہو راجہ جی... ہو راجہ جی...“
”تم ہو خاصے چغند...!“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔ ”تمہیں بس دو ہی باتیں آتی ہیں باز خروش کی طرح دہکتے پھرو گے یا پھر عشق! وہ بھی گھٹیا قسم کا۔“

”خیر خیر... یہاں تو ہر چیز گھٹیا ہے۔ آپ ٹھہرے اونچے آدمی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ شکیلہ ضرور آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گی۔ ہاں ذرا کسن ہے۔“

”حمید کے بچے۔“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔ ”آخر تم اپنی طرح مجھے بھی کیا سمجھتے ہو۔“
”آپ بھی میری طرح آدمی ہیں۔“

”مگر میں نے زندہ رہنے کا طریقہ آدمیوں سے سیکھا ہے۔ کتوں سے نہیں۔“
”آپ مجھے کتا کہہ رہے ہیں۔“ حمید نے بگڑ کر کہا۔

”صرف کہہ ہی نہیں رہا ہوں بلکہ واپسی پر تمہیں کتوں کے ساتھ باندھوں گا۔“
”اگر مجھے یقین نہ ہو تا کہ آپ یہ سب مذاق کہہ رہے ہیں تو میں...!“

”ہاں تو تم کیا کرتے۔“ فریدی اسے خٹکے پن سے دیکھتا ہوا بولا۔
”صبر کرتا۔“ حمید نے اتنی بے بسی سے کہا کہ فریدی بے اختیار ہنس پڑا۔

”خیر... غیر ضروری باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔“ فریدی نے کہا۔ ”فی الحال ہمیں۔“
”ٹھہرے! پہلے میری ایک بات کا جواب دیجئے۔“

”کیا...؟“

”یہ راج گڑھی سے واپسی پر ہم کہاں جائیں گے۔“

”ظاہر ہے کہ جہاں تھے۔“

”ناممکن! میں اب وہاں ہرگز نہ جاؤں گا۔“

”تو کیا تم واقعی سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔“

”قطعی۔“

”یقین نہیں آتا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”آخر یقین نہ آنے کی وجہ۔“

”میں نے تمہیں کبھی کسی جگہ سے بھاگتے نہیں دیکھا۔ جہاں خوبصورت لڑکیاں ہوں۔“
”لڑکیاں کہہ رہے ہیں آپ انہیں۔“ حمید چیخ کر بولا۔ ”اگر وہ لڑکیاں ہیں تو خدا شیطان کو

بھی ان کے شر سے محفوظ رکھے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو۔“

”خدا کرے میری ہی طرح آپ بھی پاگل ہو جائیں۔“

”آخر تم جمیلہ سے ڈرتے کیوں ہو۔“

”چلے یہ بھی ایک ہی رہی۔ مجھے آپ سے توقع نہیں تھی کہ آپ بچوں کی طرح باتیں کریں گے۔“

”آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”یہی کہ یا تو مجھے معاف کیجئے یا خود کشی کی کوئی آسان سی ترکیب بتا دیجئے۔“

”یہ دونوں کام بہت مشکل ہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں تمہیں دراصل سکا سکا کر مارنا چاہتا ہوں۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور منہ پھلائے راستہ طے کر رہا تھا۔ فریدی ہی بولتا رہا۔

”جمیلہ نے اس وقت جو بھی کہا ہے قطعی ہوش میں کہا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ۔ اس بات کا پتہ چلائے بغیر میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہوں کہ وہ یہاں ہماری موجودگی کیوں ناپسند کرتی ہے۔“

”ارے جاسوس اعظم۔“ حمید دانت پیس کر بولا۔ ”بلکہ ارسلانوس اعظم تو بالکل سانسے بات ہے۔“

”یعنی...!“

”کل رات کو حضور اعلیٰ نے اس کے چہیتے بھوتوں پر حملہ کر دیا تھا۔“

”مگر دورے کی حالت کی باتیں تو اسے یاد ہی نہیں رہتیں۔“

”اور آپ کو اس شاندار غپ پر یقین آ گیا ہے۔“

”غپ نہیں ہے فرزند...!“

”ہو سکتا ہے کہ اب ایشیا کا نامور سراغ رساں کچھ اور بلند ہو رہا ہو۔“ حمید خشک قسم لے
طنزیہ لہجے میں بولا۔

”ایشیا کا یہ کترین جاسوس تم سے بہر حال زیادہ تجربہ کار ہے۔“ فریدی نے چلتے چلتے رک
سگار سگاتے ہوئے کہا۔

”خیر نہ گھوڑا در نہ میدان۔“ حمید بولا۔ ”لیکن میں تو اسے پسند نہ کروں گا کہ وہ ایلٹس کی
محبوبہ کسی رات سوتے وقت میری گردن ناپ دے۔ میں نے کل رات والے بھوتوں کی نظر
سنی ہے۔“

”اچھا میاں صاحب زادے اگر تم بھوتوں پر یقین رکھتے ہو تو تمہیں لچر قسم کی روایات کے
مطابق یہ بھی معلوم ہو گا کہ بھوتوں سے دنیا کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔“
”ٹھیک ہے۔“

”تو پھر یہ بتاؤ کہ وہ بھوت معمولی آدمیوں کی طرح کسی نقارے کی تلاش میں کیوں ہیں۔“
”ممکن ہے۔“ نقارے سے ان کی کچھ اور مراد ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔ ”ممکن ہے وہ بادشاہی حلوہ سوہن کو نقارہ کہتے
ہوں اور اس اصطبل کو حلوئی کی دوکان سمجھتے ہوں۔ آخر، بھوت ہی ٹھہرے۔ ہماری طرح ان
کے پاس عقل تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو بھوت کیوں بنتے کیونکہ بھوت بننے سے آسان نہ
لیڈری ہے۔“

”دیکھئے! کبھی کبھی میرا کہنا بھی مان لیا کیجئے۔“

”میں اسی انتظار میں بوڑھا ہوا جا رہا ہوں کہ ایک بار تو تم کوئی قاعدے کی بات کہو اور مٹا
مان کر آرام سے قبر میں جاسوؤں۔“

”اچھا اگر یہی بات ہے تو میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔“ حمید نے ہنسا کر کہا۔

”مگر خدا کرے مجھ سے پہلے آپ کی گردن ناپی جائے تاکہ میں آپ کی روح کو سات سلام
کرنے کے بعد خود بھی آپ کے پیچھے روانہ ہو جاؤں۔“

”اچھا بکواس بند۔“

”بند ہو گئی جناب۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن آخری بات پوچھنے کی اجازت دیجئے۔“

”بے سکی نہ ہونی چاہئے۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شکلیہ آپ کو کہاں لے گئی تھی۔“

”کیوں نہیں!...“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”وہ میرا آٹو گراف لینا چاہتی تھی اس نے میرے
کیوں کے تراشے اخبارات سے جمع کر کے ان کا البم بنایا ہے۔ اسی البم پر میں نے آٹو گراف دیئے
ہیں۔“

”تو کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ انسپکٹر فریدی کے سارے کارنامے سرجنٹ حمید کی مدد کے
بغیر ادا ہو رہے رہ جاتے۔“

”جانتی ہے۔“ فریدی کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو اس نے میرا آٹو گراف کیوں نہیں لیا۔“

”خیر اس پر بھی کبھی بحث ہوگی۔“ فریدی نے کہا اور رک کر ایک راہ گیر سے یدھ راج
گڑھی کا راستہ پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہی جا رہے تھے۔“ فریدی پھر بولا۔ ”ہاں تو میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ اگر وہ اس وقت
میرا آٹو گراف نہ لیتی تو مجھے زندگی بھر افسوس رہتا۔“

”افسوس کی بات ہی تھی۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔ ”یہی ملائی قسم کی لڑکیوں کو تو ہر ایک کا آٹو
گراف لینا چاہئے۔“

”پھر آگے اصلیت پر۔“ فریدی نے کہا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اس وقت میرا آٹو
گراف نہ لیتی تو مجھے یہ بے سکتے اشعار کبھی نہ ملتے۔“

حمید بے اختیار ہنس پڑا لیکن پھر فوراً ہی سنہل کر فریدی کی طرف متحیرانہ انداز میں دیکھنے لگا۔
”کیوں بھلا ان اشعار کی کیا اہمیت ہے۔“

”بہت بڑی اہمیت ہے حمید صاحب۔ اگر اس لڑکی کا بیان صحیح ہے تو یہ اشعار بڑی قیمت رکھتے
ہیں۔“

”یعنی...!“
”یہ اشعار اس کی نظم کی کاپی میں لکھے ہوئے تھے۔ نظموں کے انتخاب کے معاملے میں وہ

سوسائٹی کی طرف سے۔ میں نے ابھی تک صولت مرزا سے اس کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی۔
”قطعی فصول ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں....؟“
”ان کھدائی کرنے والوں کا پتہ زندگی بھر نہ چل سکے گا۔“
”آخر کیوں؟“ فریدی نے تنگ آکر کہا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ آخر آپ اتنی جلدی ہر بات پر ایمان کیوں لے آتے ہیں۔
میں سچ کہتا ہوں کہ وہ آٹھواں آلو ہمیں نواں اور دوسواں آلو بنانے کے چکر میں ہے۔“

”اف.... فوہ.... تم سے پنتا آسمان کام نہیں۔ اثبات یا نفی کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ ہو تو
بتاؤ۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس بات پر یقین کر لیا جائے یا نہ کیا جائے۔ چلو ہم فرض کئے
لیتے ہیں کہ شکلیہ کا بیان قطعی درست ہے۔ اب اس مفروضے کو یقین میں بدلنے کے لئے جو
جدوجہد کرنی پڑے گی اس سلسلے میں ہمیں حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔ ویسے اس کے علاوہ اگر ج
اور جھوٹ پر کھنے کی کوئی اور آسان تدبیر تمہارے ذہن میں ہو تو بتاؤ۔ اگر اس پر عمل نہ کروں تو
جو گدھے کا حشر وہ تمہارا۔“

”میں کہتا ہوں آخر اس کا پچھائی کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔“

”نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو تمہاری شادی جیلہ کے ساتھ نہ ہو سکے گی۔“

”چھوڑیے جی! میں آج کل مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم ایک عورت سے نری طرح خائف ہو۔“

”میں اسے عورت سمجھتا ہی نہیں۔ خدا کی قسم اگر وہ عورت ہے تو میں اب زندگی بھر عورت

کا نام نہیں لوں گا۔“

”لیکن اس عورت سے ایک بہت ہی اہم کام لیا جاسکتا ہے۔“

”کیا....!“

”وہی جو دوسرے لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہی جنہیں تم بھوت کہتے ہو۔“

ایک یاذوق لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ سوائے ان چند اشعار کے میں نے اس کی کاپی میں کوئی لہجہ اور
بے تکی چیز نہیں دیکھی۔“
”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”پوری بات سنو تو.... میں ان اشعار کو پڑھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس پر جھینپی ہوئی
ہنسی کے ساتھ کہنے لگی کہ اس نے انہیں قدیم سمجھ کر تیر کا لکھ لیا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ اشعار
اس نے ایک پرانے کتبے سے نقل کئے تھے جویدہ راج گڑھی کی کھدائی پر زمین سے برآمد ہوا تھا۔“
”ادہ.... تو یہ بچھو....!“ حمید چونک کر بولا۔

فریدی ہنسنے لگا۔

”بہت دیر میں عقل آئی ہے۔“ فریدی بجا ہوا رگ ایک طرف پھینکتا ہوا بولا۔

”تو کیا اس بچھو کا تعلق تخت عقرب سے ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ابھی کیا کہا جاسکتا ہے، بہر حال ”بچھو پریدہ راج برائے“ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے ورنہ
ظاہر ہے کہ یہ راج تمہاری طرح پاگل تو نہ رہا ہو گا اور کسی بچھو پر بیٹھ جانا اور اس نقارے کا تذکرہ
بھی موجود ہے۔ ممکن ہے یہ وہی نقارہ ہو جسے تمہارے بھوت تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اشعار کسی کتبے سے نقل کئے گئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے

تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس گھر میں کوئی بہت ہی خوفناک ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً ہم لوگ
بھی وہاں جا پہنچے اور شاید ان کی نادانستگی میں اس کا ایک آدھ منظر بھی دیکھ لیا۔ اس لئے اب وہ
ہمیں آلو بنانے کے لئے واقعات کو کوئی اور شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”چلو یہی سہی۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں فی الحال تمہارے خیال کی تردید نہیں کر سکتا لیکن پھر

بھی یہ حالات اس قابل نہیں کہ ان میں دلچسپی لی جائے۔ کئی باتیں قابل غور ہیں۔ صولت مرزا
چاہتا ہے کہ ہم یہاں قیام کریں۔ جیلہ چاہتی ہے کہ چلے جائیں۔ ارسلانوس تخت عقرب کو واہمہ قرار
دیتا ہے، صولت مرزا اس کے وجود سے منکر نہیں اور آج شکلیہ کی کاپی میں مجھے یہ اشعار ملتے ہیں۔“

”اور اس کے بعد حمید کے پٹھے کا قیمہ ہو جاتا ہے۔“ حمید نراسمانہ بنا کر بولا۔

”پھر وہی بکواس۔“ فریدی باتوں کی رو میں بولتا رہا۔ ”اب یہ دیکھنا ہے کہ کھدائی والی بات

کہاں تک سچ ہے اور آثار قدیمہ کے سرکاری محکمے کی طرف سے کھدائی ہوئی تھی یا کسی ہسٹوریکل

”خدا پرستی کے بجائے بھوت پرستی کے قائل ہو جاتے۔“
”یعنی.....!“

”یعنی کہ میں ابھی کچھ اور نہیں بتانا چاہتا۔“ فریدی نے کہا اور رک کر بجھا ہوا سگار سلگانے لگا۔

دیوانی کی باتیں

تھوڑی دیر بعد وہ یدھ راج گڑھی میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک عظیم الشان مکندر پھیلا ہوا تھا۔ کہیں عمارتوں کے آثار اب بھی باقی تھے۔ منارے تو قریب قریب اب تک محفوظ تھے۔ سب سے پہلے وہ اس منارے کے قریب پہنچے جس پر انہوں نے کتے کی آواز سنی تھی، حیدر کانپ کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک فریدی نیچے سے اوپر تک اسے دیکھتا رہا پھر اس دروازے کے قریب آیا جسے اینٹوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ چند لمبے اسے گھورتا رہا اور پھر حیدر کی طرف پلٹ آیا۔ ”بڑی مشکل تو یہ ہے کہ اسے کھلوانے کے لئے آثار قدیمہ سے اجازت لینی پڑے گی۔“ اس نے کہا۔

”اوہ تو اب اس فتنے کو باہر نکالنے کا ارادہ ہے۔“ حیدر نے کہا۔
”نہ جانے تم کن کن زادیوں سے باتیں کرتے ہو۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”اگر وہ تمہارے خیال کے مطابق بھوت ہے تو کیا اسے اس قسم کی دیواریں قید کر سکیں گی۔“
”چلئے..... پیچھا چھوڑیئے۔“ اس نے یہ بات سوچ سمجھ کر نہیں کہی تھی۔
وہ کافی دیر تک گڑھی کے چکر لگاتے رہے، حیدر محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔

”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔“ حیدر نے کہا۔

”ہاں مجھے ایک باؤلی کی تلاش ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اوہ وہ تو صولت مرزا کے گھر میں موجود ہے۔“

”پھر وہی حرکت.....!“ فریدی منہ بنا کر بولا۔

”آخر باؤلی کیوں؟“ حیدر نے سنجیدگی سے پوچھا ”آپ کئی بار کسی باؤلی کا تذکرہ کر چکے ہیں۔“

”بس بس اب مجھے بہلانے کی کوشش نہ کیجئے۔“ حیدر نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔
”اس بار آپ کو بھوتوں کا قائل ہی ہونا پڑے گا۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اس کے چکر میں نہ پڑیئے۔ یہ پورا قصبہ آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے۔“
”بکواس ہے۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

”بھئی مجھے تو اب پیاس معلوم ہو رہی ہے۔ دھوپ ہے کہ دوزخ کی آج اور یدھ راج گڑھی کا راستہ شیطان کی آنت۔“

”ظہر و..... وہ سامنے کنواں دکھائی دے رہا ہے اور کچھ لوگ پانی بھر رہے ہیں۔“
وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے ہوئے کنوئیں کے قریب آئے۔ یہاں انہوں نے پانی پیا اور پھر چل پڑے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے دونوں کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ یدھ راج گڑھی کے منارے تو دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ ابھی دور تھی۔ چلتے چلتے حیدر بولا۔
”چلئے اگر میں اسے مان بھی لوں کہ وہ بھوت مصنوعی تھے یعنی وہ بھوتوں کا بہروپ تھا تو یہ آپ اس کتے کی آواز کو کس طرح جھٹلائے گا اس کے لئے کون سا خطی جواز پیش کیجئے گا۔ کوئی تجرباتی مثال آپ کے آڑے آئے گی۔“

”بھئی اسے میں خود ابھی تک نہیں سمجھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس سلسلے میں کسی مادی قوت کا وجود تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

”ٹھیک ہے..... بعض لوگ اپنی عقل کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔“ حیدر زہر خند کے ساتھ بولا۔

”بیٹے اس وقت تو تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔ لیکن اسے یاد رکھو کہ تمہیں بعد کو شرمندہ بھی ہونا پڑے گا۔“

حیدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر بدستور بیزارگی کے اثرات بکھرے رہے۔
”میرا خیال ہے۔“ فریدی پھر بولا۔ ”اگر اس رات کو تمہیں یدھ راج گڑھی میں ایک بار بھی ہوش آیا ہو تو شاید تم مر ہی جاتے اور اگر نہ بھی مرتے تو کم از کم اپنا مذہب تو ضرور ہی بدل ڈالتے۔“

”کیا مطلب.....!“

”ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو ایک باؤلی میں پایا تھا اور تم بھی میرے ہی قریب بے ہوئے تھے۔“

”میں....!“ حمید اچھل کر بولا۔ ”لیکن مجھے تو یاد نہیں۔“

”تم بے ہوش تھے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور مجھے خوشی ہے کہ آخر تک بیہوش ہی رہے۔“

”کیا مطلب....؟“

”کچھ نہیں مطلب یہ کہ تمہارا انھما سادل اس تبدیلی پر دھڑکنے لگتا اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی بائبل لڑکی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے بھی لگتے۔“

”آخر کیوں؟“

”فضول وقت مت برباد کرو۔ آؤ چلیں۔“

”اس اینٹ کو تو پھینکتے۔“

”نہیں۔ اپنا اطمینان کئے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ چلو بڑھو۔“ فریدی نے اسے دھکا دے کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں کہتا ہوں کہ یہ نشانات ہمارے ساتھیوں ہی میں سے کسی کے ہوں گے۔“ وہ چلتا ہوا بولا۔

”آخر انہوں نے ہی ہمیں اس ڈھیر سے نکالا ہی تھا۔ اس وقت انہیں بھگ رہی ہوں گی لہذا ان پر لگی ہوئی مٹی میں نشانات ضرور پڑے ہوں گے۔“

”لیکن ان سے پہلے بھی کسی نے ہمیں اس ڈھیر سے نکالا ہوگا۔ ورنہ ہم باؤلی میں کیوں کر پہنچے اور پھر اس کے بعد دوبارہ ہمیں اس ڈھیر میں دفن کیا ہوگا۔“

”آپ نے خواب دیکھا ہوگا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”مگر ذرا اسے دیکھو۔“

اس نے اہٹا دہنا ہاتھ حمید کے سامنے پھیلا دیا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ نشانات کیسے ہو سکتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”خراش....!“

”جناب....!“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ خراشیں ایک چگادڑ کے بنجوں کی ہیں۔ جو مجھ

ہاں باؤلی میں جھپٹی تھی۔“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اگر مل جاتی تو اچھا تھا۔ قدیم عمارتوں میں ایک آدھ باؤلی ضرور نظر آتی ہے۔“

”آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”نہیں تو.... قطعی نہیں۔“ فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر جھک مارنے کے بعد وہ لوٹنے لگے۔ دفعتاً فریدی اینٹوں کے ایک ڈھیر کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس کی تجسس نگاہیں کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ حمید نے دیکھا کہ وہ جھک کر کوئی چیز اٹھا رہا ہے اور جب اس کے پاس واپس آیا تو اس نے اس کے ہاتھ میں ایک فاؤنٹین پن دیکھا۔

”پارکر ففٹی ون ہے۔“ فریدی اسے پر خیال انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”عالباب یہ وہی جگہ ہے جہاں ہم گرے تھے، لیکن فاؤنٹین پن! کہیں یہ ہمارے ساتھیوں میں سے تو کسی کا نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم میں سے تو کسی کے پاس بھی پارکر ففٹی ون نہیں تھا۔“

”پھر یہ کس کا ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے کہا اور ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ کافی دیر تک جھکا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اینٹ اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ جیب سے محذب شیشہ نکال کر اس نے اینٹ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

”نشانات تو ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”یہاں اس مٹی کے دھبے پر، جواب خشک ہو چکا ہے۔“

حمید اس کے قریب آگیا۔ فریدی سر اٹھا کر پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ ہم میں سے کسی کی انگلیوں کے ہوں۔“

”ہوگا صاحب! اسے پھینکتے اور چل دیتے۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔ ”نہ جانے آپ کس چکر میں ہیں۔“

”اب شاید بتانا ہی پڑے گا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ پھر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ”دیوار گرنے کے بعد سے صولت مرزا کی حویلی میں پہنچنے تک ہم اسی میں نہیں

دبے پڑے رہے تھے۔“

”پھر....!“ حمید یک بیک چوہک کر بولا۔

”چہ خوب.... گویا جیلہ صولت مرزا کی لڑکی نہیں ہے۔“

”ہے کیوں نہیں.... لیکن پاگل ہے۔“

”مجھے تو یہاں سبھی پاگل دکھائی دیتے ہیں۔“

”اچھا تو تمہارا انتظام ارسلانوس کے یہاں کرادوں گا۔“

”بہتر ہو گا کہ آپ مجھے کسی رچھ یا بھڑیے کے سپرد کر دیجئے۔“

”ارے نہیں۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اپنا اپنا ذوق ہے۔ بہر حال میں اس ڈارون کے پٹھے کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“

”اوہ ہو.... تو بے چارے ڈارون پر کیوں غصہ اتار رہے ہو۔“

”محض اس لئے کہ یہ ساری بیداری اس کی پھیلائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے

غیر مروتی قوتوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔“

”بیٹے حمید صاحب یہ خیال اپنے ذہن سے نکال لو۔ ورنہ مجھے تم سے نفرت ہو جائے گی۔“

”کاش نفرت ہی ہو جاتی۔“

”اچھا ذرا تیز چلو۔“ فریدی نے اسے پھر دھکا دیا۔

”چل تو رہا ہوں۔ اب کیا سر کے بل چلوں۔“

تین بجتے بجتے وہ لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ

صولت مرزا کو اطلاع ہی دے کر گئے تھے۔ صولت مرزا کافی دیر تک بزرگانہ انداز میں فریدی کو

برا بھلا کہتا رہا۔ حمید اندر ہی نہیں گیا۔ اس نے فریدی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی چائے اس کے

کمرے میں بھجوادے۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کر لیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا

چاہئے۔ اس گھر میں مزید قیام کرنے کے خیال ہی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ پائپ میں تمباکو بھر

کر اسے سلگاتا ہوا ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ راستے کی تھکن پچھلی رات کی بیداری ایک بوجھ کی

طرح اس کے ذہن پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے تین چار گہرے گہرے کش لینے کے بعد

چلی ہوئی تمباکو ایش ٹرے میں جھاڑ دی اور پھر آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اونگھنے لگا۔

ابھی اچھی طرح آنکھ نہیں لگی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ حمید منہ سکڑتا ہوا

اٹھا۔ ساتھ ہی وہ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ کوئی تک ہے ابھی سے چائے بھی آگئی ان لوگوں کو سوا

”کمال کر دیا آپ نے۔ جب یہاں کوئی باؤلی ہے ہی نہیں تو۔“

”ہے تو ضرور۔“ فریدی اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”دیکھئے میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ اس شیطانی چکر میں نہ پڑیئے۔“

”کے جاؤ۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فریدی کو راہ راست پر لانا ناممکن ہے۔ ایک بار کوئی نظریہ

قائم کر لینے کے بعد اس کا اس سے ہٹ جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ منہ میں پانی لے کر سیٹی بجانا۔

اب اس نے حمید کی الجھن میں اضافہ کر لینے کے لئے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ

آخر باؤلی والی بات اس نے اسے اتنی دیر سے کیوں بتائی۔ وہاں بھی کوئی خاص قسم کا حادثہ پیش آیا

تھا؟ بہر حال یہ بات معلوم ہونے پر حمید کے یقین کو اور زیادہ تقویت پہنچ گئی اور وہ اسے سچ چا

شیطانی کارخانہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کس طرح فریدی کو اس چکر سے نکال لے

جائے اور خود بھی جان بچائے۔ اپنی جان تو خیر وہ بچا ہی سکتا تھا۔ اگر وہ واپس جانے پر اڑ جائے تو

فریدی اسے باندھ کر تو رکھنے سے رہا۔ لیکن وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ

فریدی کو کسی خطرے میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی وجہ انفری اور ماتحتی کا خیال نہیں تھا۔

فریدی کی شخصیت اور کردار نے اسے اپنا غلام بنالیا تھا۔ وہ اس کے بے پناہ خلوص کا پجاری تھا۔ اس

کی اس محبت پر جان دیتا تھا، جو صرف چھوٹے بھائی ہی کے لئے ہو سکتی ہے۔ بہر حال وہ اس طرح

نہیں بھاگ سکتا تھا جس سے ان کے جذباتی رشتے محروم ہوتے۔

”لیکن ذرا یہ تو بتائیئے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”کہ آپ کی خودداری کہاں

قیام کرے گی۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا خیال ہے کہ کوئی شریف آدمی کسی ایسی جگہ نہیں رہ سکتا جہاں لوگ اس کے قیام کے

خواہشمند نہ ہوں۔“

”اوہ....؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”تو گویا تم اب تک جیلہ کے خیال میں ڈوبے ہوئے ہو۔“

”میں نے تو اپنی بڑی توہین محسوس کی ہے۔“

”مگر ہم تو صولت مرزا کے مہمان ہیں۔“

کھانے پینے کے کچھ اور بھی آتا ہے۔ کیا مصیبت ہے.... ارے باپ؟

دروازہ کھولتے ہی وہ بے اختیار اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے میں جیلہ کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

”جی ہاں....!“ حمید بوکھلا کر بولا ”مم.... میں سامان ہی.... بب.... باندھ رہا تھا۔“

جیلہ اندر چلی گئی اور حمید کے جسم سے پسینہ چھوٹ پڑا۔

”وہ دیکھئے نا....!“ وہ پھر بولا۔ ”یہ بکس ہے نا.... ذرا اس کی کنڈی کچھ سخت ہو گئی ہے

ازے.... ہولڈال کہاں ہے۔ بستر بندھ گیا۔ بالکل بندھ گیا۔“

جیلہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ اتنے مضحکہ خیز کیوں ہوئے جارہے ہیں۔“ جیلہ پرسکون لہجے میں بولی۔ حمید نے

محسوس کیا کہ وہ سچ مچ خواہ خواہ آلو ہوا جارہا ہے۔ اس سے یہ حرکت قطعی غیر ارادی طور پر سرور

ہوئی تھی۔ لہذا اب وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو

لیکن اس کا نچلا ہونٹ ابھی تک خود بخود پھڑکے جارہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تو

جیسے اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔

”مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے۔“ جیلہ آہستہ سے بولی۔ ”میں غصے میں تھی۔“

”اوہ کوئی بات نہیں.... کوئی بات نہیں۔“

”لیکن میں کیوں غصے میں تھی؟“ جیلہ نے سوال کیا اور حمید پھر بوکھلا گیا۔ اس نے یہ سوال

محض باتوں کی رو میں کیا تھا۔ ورنہ جواب طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھتی نہ رہتی۔

”غالباً آپ کو فریدی صاحب پر غصہ آیا ہوگا۔“ حمید نے کافی سوچ بچار کے بعد کہا۔

”بھلا ان پر کیوں آتا۔“

اس دوسرے سوال پر حمید جھنجھلا گیا۔ اس دوران میں اس نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور

اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی وہ ساری صلاحیتیں بھی جاگ

اٹھی تھیں جو عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کے لئے کافی ہوتی تھیں۔

”شاید آپ کو ان کی بے ڈھنگی چال پر غصہ آیا ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”تو گویا میں اب تک ان کی چال دیکھتی رہی ہوں۔“ جیلہ نے ناخوشگوار لہجے میں سوال کیا۔

”آپ غلط سمجھیں۔ یہ بات نہیں۔ قاعدہ ہے کہ بعض بے ہنگم چیزوں پر خود بخود نظر پڑ جاتی ہے۔“

جیلہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں سامنے والی دیوار پر جمی ہوئی تھیں اور حمید گھبرا گھبرا کر

اس کی نظروں کا تعاقب کر رہا تھا کہ کہیں دیوار سے کوئی بھیانک چیز نہ نکل پڑے۔

”بہر حال میں غصے میں تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”مجھے قطعی افسوس نہیں ہے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”غصے میں آدمی کہنا کچھ چاہتا ہے منہ

سے نکلتا کچھ ہے۔ مثلاً میں ہی غصے کی حالت میں بڑی بے تکلی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ اگر غصے میں

کسی کو گدھا کہنا ہوگا تو ٹھانریا چنندہ کہہ جاؤں گا۔“

جیلہ کے ہونٹوں پر ایک بے جان مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہر حال حمید کی عاقبت روشن کرنے

کے لئے یہی کافی تھا۔ وہ اچھی طرح چپکنے کے موڈ میں آ گیا۔

”اب ایک بار کا لطیفہ سنئے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک نوکر پر ایک دن بڑا تازہ آیا۔ کہنا یہ

چاہتا تھا کہ سور کے بچے جہنم میں جاؤ۔ لیکن بوکھلاہٹ میں کہہ گیا جہنم کے بچے سور میں جاؤ۔ لہذا

وہ مرعوب ہونے کے بجائے سر پیٹ پیٹ کر ہنسنے لگا۔“

جیلہ پھر مسکرائی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اچانک اس طرح سنجیدہ ہو گئی جیسے حمید نے

اسے گالی دی ہو۔

”میں یہاں آپ سے فلت کر کے نہیں آئی۔“ اس کے لہجے میں حمید نے ناقابل برداشت

قسم کی تمغنی محسوس کی۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ اس کے دوسرے جملے کا منتظر تھا اور خود جیلہ کے

انداز کی تشنگی یہ بات ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس ایک جملے پر اکتفا نہ کرے گی۔ وہ کچھ کہنا ضرور

چاہتی تھی لیکن چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔

”میں آپ سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ یقین رکھیں کہ وہ صرف مجھ تک ہی محدود رہیں گی۔“

جیلہ کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ والد صاحب نے تم لوگوں کو بھی اس سازش میں شریک کیا ہے۔“

”سازش....!“ حمید چونک کر بولا۔

”ہاں سازش....!“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”بہت دنوں سے برداشت کر رہی تھی لیکن اب

ضبط کی سرحدوں سے باہر ہو چکی ہوں۔ والد صاحب نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے کیوں بدنام کر رہے ہیں۔

”بدنام کر رہے ہیں۔“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بھولے مت بنو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔“

حمید حیرت سے اس کامنہ دیکھتا رہا اور وہ بولتی رہی۔

”والد صاحب اس لئے مجھے بدنام کر رہے ہیں کہ میری شادی نہ ہو سکے۔ اگر شادی ہو گئی تو وہ تین لاکھ کی رقم ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی جو تانا جان مرحوم خاص طور پر میرے نام سے بینک میں جمع کرا گئے ہیں۔“

”اوہ....!“

”پھر تم نے ایکٹنگ شروع کی۔“ جمیلہ نے اسامہ بنا کر بولی۔ ”تم مجھے کسی طرح اس بات کا یقین نہیں دلا سکتے کہ تم دونوں اس سازش میں شریک نہیں ہو۔“

حمید نے سوچا کہ کیوں نہ فی الحال اس کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔

”میں ایکٹنگ نہیں کر رہا ہوں۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ ابھی تک فریدی صاحب نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

جمیلہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر سر اٹھا کر آہستہ سے گلوگیر آواز میں بولی۔

”میری زندگی برباد کر کے تم لوگوں کو کیا ملے گا۔ والد صاحب کو سمجھا دو کہ مجھے وہ تین لاکھ

روپے نہیں چاہئیں لیکن میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔“

”میں انہیں سمجھا دوں گا۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا تم نے کبھی اور بھی کسی ایسی بیماری کا نام سنا تھا جیسی مجھ سے منسوب کی جاتی ہے۔“

”کبھی نہیں۔“

”کیا تم نے بھی مجھے کسی رات کو دورے کی حالت میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔“

”ہرگز نہیں۔“ حمید نے سفید جھوٹ بولا۔

”تو پھر وہ سیاہی میری میز پر کس طرح گری تھی؟“ جمیلہ نے حمید کو گھور کر پوچھا۔

”میں کیا جانوں... میں نے فریدی صاحب کی زبانی سنا تھا۔“

”آخر انہیں ان باتوں سے کیا مل جائے گا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ مجبوروں کی مدد کرتے ہیں۔

پھر آخر میرے لئے کیوں اتنے تنگدل بن گئے ہیں۔“

”میں انہیں سمجھا دوں گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

نہ جانے کیوں اسے اس سے کچھ کچھ ہمدردی سی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ان معاملات کو سمجھنے

سے قاصر تھا۔ کیوں کہ وہ خود اسے دو بار دورے کی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔

”میں نے سب کچھ آپ کے سامنے رکھ دیا؟“ جمیلہ اٹھتی ہوئی بولی۔ ”اب جو کچھ آپ کا ضمیر گوارا کرے۔“

”آپ مطمئن رہئے۔“ حمید بھی مودبانہ انداز میں اٹھتا ہوا بولا۔

جمیلہ چلی گئی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن قلابازیاں کھانے لگا تھا۔

آخر اس گھر میں ہو کیا رہا ہے۔ باپ کچھ بیٹی کچھ۔ دوسری بیٹی دماغ خراب کرنے کے لئے مہمل

اشعار بانٹتی ہے اس نے بچپنی رات کو وہ منظر بھی دیکھا تھا جب بیٹی نے باپ کے منہ پر تھپڑ رسید

کیا تھا اور وہ سب کیا تھا۔

وہ بے صبری سے فریدی کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ نہ آیا۔ اس دوران میں چائے بھی آئی

لیکن نہ تو صولت مرزا دکھائی دیا اور نہ فریدی.... برآمدے میں ایک آدھ بار شکلیہ پر ضرور نظر

پڑی۔ لیکن اس نے حمید کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حمید تھوڑی دیر تک بیٹھا الجھتا رہا۔ پھر برآمدے

میں نکل آیا۔

رات ہوئی لیکن فریدی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ حمید نے صولت مرزا سے پوچھا۔ لیکن اس نے

لا علمی ظاہر کی۔ آخر حمید تھک ہار کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ حالانکہ جمیلہ سے اس کی گفتگو ہو چکی

تھی۔ لیکن وہ رات کے تصور ہی سے لرز رہا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس نے نہایت احتیاط سے

کمرے کے سارے دروازے بند کر دیئے اور انتہائی گرمی کے باوجود بھی بند کمرے میں سو گیا۔

کتبے کا سراغ

دوسرے دن فریدی ناشتے کی میز پر صولت مرزا سے کہہ رہا تھا۔

”آج ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔“

ناشتے پر اس وقت یہی تینوں تھے۔ حمید چونک کر فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ابم تک اس سے یہی نہیں پوچھا تھا کہ وہ بچپلی رات کو کہاں رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ اور.... صولت مرزا ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ وہ بھی آگیا تھا اور قبل اس کے کہ اس سے رات کی غیر حاضری سبب پوچھا جاتا اس نے آج کی روائی کا ذکر چھڑ دیا۔

”تو کیا تم ہمیں اس مصیبت میں جھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“ صولت مرزا نے بھرائی ہوئی آوا میں کہا۔

”میں آپ ہی کیلئے ایسا کر رہا ہوں۔ فی الحال یہاں رہ کر میں آپ کے کسی کام نہ آسکوں گا۔“ فریدی نے چائے کی پیالی رکھ کر سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

صولت مرزا چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”رات کہاں رہ گئے تھے۔“

”تھانے کے انچارج نے روک لیا تھا۔ لہذا رات اس کے ساتھ بسر کرنی پڑی۔ مجھے امید۔“

کہ آپ نے بُرا نہ مانا ہوگا۔“

”اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔“ صولت مرزا نے فکر مندانہ انداز میں کہا۔

”تو کس ٹرین سے جاؤ گے۔“

”تین بجے والی ہے۔“

اس گفتگو کے علاوہ بقیہ وقت میں خاموشی ہی رہی۔

ناشتے کے بعد فریدی اور حمید عقبی پارک میں آ بیٹھے۔

”اب بتائیے کہ آپ رات کہاں تھے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اسی پارک میں۔“

”یہاں....!“ حمید چونک کر بولا۔

”ہاں....!“

”پھر....!“

”نہ تو رات اس پر دورہ ہی پڑا اور نہ وہ بھوت دکھائی دیئے۔“

”کل رات دورہ نہیں پڑا....؟“ حمید نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔“

”آخر کل کیوں نہیں پڑا۔“

”نہ پڑا ہوگا۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔

”تو پھر آپ کیا کرتے رہے۔“

”بھوتوں کا انتظار۔“

”واقعی آپ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔“

فریدی مسکرائے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

”جانتے ہو وہ فونٹین پن کس کا تھا۔“

”یہی جانتا ہوتا تو لوگ ولی اللہ نہ کہتے۔“ حمید بیزار سی سے بولا۔ لیکن فریدی نے اس کے

لہجے پر دھیان دیئے بغیر کہا۔ ”وہ فونٹین پن جیلہ کا تھا۔“

”ارے....!“ حمید تقریباً اچھل پڑا۔ ”کس سے معلوم ہوا۔“

”صولت مرزا سے۔“

”پھر اس نے آپ سے یہ بھی پوچھا ہوگا کہ وہ آپ کو ملا کہاں سے۔“

”یقیناً۔ یہ ایک قدرتی سوال تھا۔“ فریدی مسکرایا۔

”پھر آپ نے کیا کہا۔“

”ظاہر ہے کہ میں نے اسے حقیقت نہ بتائی ہوگی۔“

”آپ یک بیک شہر کے لئے کیوں تیار ہو گئے۔“

”اس کتبے کے چکر میں ہوں جس پر سے وہ اشعار نقل کئے گئے تھے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔ ”میں آپ کو اتنا سمجھ نہیں سمجھتا تھا۔“

”خیریت.... خیریت۔“ فریدی مسکرایا۔ ”تم عقلمند کب سے ہو گئے۔“

”میں کسی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔“ حمید نے فریدی کے لہجے کی نقل اتاری اور فریدی بے

اختیار ہنس پڑا۔

”میر و مرشد اس راز سے ذرا بچ مقدار کو بھی آگاہ فرما کر رونے کا موقع دیجئے۔“

حمید نے فلسفیانہ انداز میں اُلو کی طرح اپنے دیدے پھرائے اور جیلہ کی گفتگو بیان کر چلا۔ پھر جب اس نے اس موقع پر یہ تصور کرتے ہوئے کہ فریدی کی آنکھیں چمکنے لگی ہوں گی اس طرف دیکھا تو اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ فریدی کے چہرے سے کچھ ایسی بے تعلقی ظاہر ہو رہی تھی جیسے وہ اب تک کسی ضدی بچے کی ”ریں ریں اور ٹس ٹس“ سنتا رہا ہو۔

”پھر کیا ہوا۔“ حمید کے خاموش ہوتے ہی اس نے لا پرواہی سے پوچھا۔
”میرا سر.....!“ حمید بھنا کر بولا۔

”پھنا تو نہیں۔“ فریدی نے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

”آپ مجھے اُلو سمجھتے ہیں۔“ حمید نے چیخ کر کہا۔

”نہیں الو سے بھی اونچی چیز۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آخر تم اس دیوانی لڑکی اور اس

کی باتوں کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہو۔“

”معلوم نہیں آپ کس چکر میں ہیں اور کیا سوچتے ہیں۔“

”میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ لڑکی کچھ نہیں جانتی۔ حتیٰ کہ اسے اپنے متعلق بھی کچھ

نہیں معلوم۔“

”یہ کتنے عرصے کے تجربات کا نچوڑ ہے۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اٹا اب آپ بھی طنز فرمانے لگے..... صاحبزادے ہو۔“

”شکریہ! میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ حرام زادہ ہوں۔“

”خیر فضول باتیں چھوڑو..... ہمیں چلنے کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

وہ دونوں اٹھ کر اس کمرے میں چلے آئے جہاں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ حمید منتشر

چیزیں اکٹھا کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گنگنا تا بھی جا رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وقتی ہی طور

پر اس بھوت خانے سے نجات تو مل رہی ہے۔

”تو آپ اس کتبے کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

فریدی آرام کر سی پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ حمید کے مخاطب کرنے پر اٹھ بیٹھا۔

”کیا پوچھا تھا تم نے۔“

حمید نے اپنا سوال دہرایا۔

”اس کے لئے زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔“ فریدی نے انگڑائی لے کر کہا۔ ”صورت مرزا سے معلوم ہوا ہے کہ کھدائی کرنے والے یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی چیز برآمد ہوئی تھی تو وہ یونیورسٹی کے میوزیم میں ضرور موجود ہوگی۔“

”تو یقین کیجئے کہ وہ کتبہ موجود نہ ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں.....!“

”اے صاحب یہ سب مل کر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی کسی بات پر یقین

نہیں آیا۔“

”ایسی بے یقینی بھی ٹھیک نہیں۔ خصوصاً ایک سراغ رساں کے لئے۔“

”سراغ رساں.....!“ حمید ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”چھیٹوں میں، میں خود کو قطعی سراغ رساں

نہیں سمجھتا۔ یہ سعادت تو کچھ آپ ہی کے حصے میں آئی ہے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں گہرے تفکر کا پتہ دے رہی تھیں۔

”لیکن یہ تو بتائیے۔“ حمید پھر بولا۔ ”وہ کتبہ شکیلہ کے ہاتھ کیسے لگا تھا۔“

”کھدائی کرنے والوں نے صولت مرزا ہی کے گھر قیام کیا تھا۔“

”اوہ تو..... بہر حال صولت مرزا وغیرہ نے آپ کو اچھی طرح جکڑ لیا ہے۔“

”اچھا سنو.....!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”اب ہم ان معاملات کے متعلق قطعی کوئی

بات نہ کریں گے۔“

حمید اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر اپنے کام میں

مشغول ہو گیا۔

اس کیس میں کچھ اس قسم کے الجھاوے پیدا ہو گئے تھے کہ حمید نے اس کی طرف سے اپنے

ذہن کو بے تعلق کر لینے ہی میں بھلائی دیکھی۔ اس کا خیال تھا کہ صولت مرزا وغیرہ انہیں کسی

جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن فریدی اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

حالا کہ فی الحال اس کے پاس اپنے نظریے کی چٹنگی کے ثبوت میں کافی دلائل نہیں تھے لیکن پھر

بھی وہ اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ کوئی دوسرا ان لوگوں کو اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔

حمید سوچ رہا تھا کہ اگر جیلہ ان واقعات سے بے تعلق ہے تو پھر اس کا فائدہ نٹین پنیدھ راج

”نہیں نہیں..... میں اتنا نا سمجھ تو نہیں ہوں۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”شکر یہ.....“ وہ آہستہ سے بولی۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔ ”میں ایک بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل مجھے بغاوت پر ابھارتا ہے۔ لیکن پھر افسوس ہوتا ہے۔ میں ہر وقت کسی نہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتی ہوں۔ کبھی کبھی میرے منہ سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں جو مجھے نہ کہنی چاہئیں۔“

”ہوتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔“ حمید نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہئے۔

”آپ نے فریدی صاحب سے اس کا تذکرہ ضرور ہی کیا ہوگا۔“ جمیلہ نے پوچھا۔

”قطعی نہیں۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”ورنہ پھر بات ہی کیا رہ جاتی۔ میں نے بس کسی طرح انہیں واپس چلنے پر راضی کر لیا۔“

جمیلہ نے سر جھکا لیا اور پھر جب اس نے نظریں اٹھائیں تو حمید نے اس کے چہرے پر ندامت کے آثار دیکھے۔ سارا ہیکھا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی بجائے اس کے چہرے پر ایک غم آلود نرمابٹ پھیل گئی تھی اور آنکھیں کسی گہری سوچ اور پرسکون جمیل کی طرح حسین اور طمانیت بخش نظر آنے لگی تھیں۔ پھر حمید دوسرے ہی لمحے میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ تھوڑی دیر قبل اس سے خائف تھا۔ اسے وہ پُر اسرار بھوت بھی نہ یاد رہ گئے۔ اس نے اس تھپڑ کو بھی فراموش کر دیا جسے ایک بیٹی نے اپنے باپ کے منہ پر رسید کیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا وہ یہ کہ جمیلہ غیر معمولی حسن کی مالک ہے۔ کسی بڑے آرٹسٹ کا ایک اچھوتا خیال۔

شہر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی اور فریدی کو اس کتبے کے متعلق چھان بین ملتوی کر دینی پڑی۔

حمید بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اس لئے زیادہ دیر تک نہ جاگ سکا۔ لیکن رات میں جب بھی اس کی آنکھیں کھلیں اس نے فریدی کی لائبریری میں روشنی دیکھی۔

دوسرے دن صبح اسے نوکروں سے معلوم ہوا کہ فریدی رات بھر لائبریری ہی میں رہا اور اس وقت وہ ایک آرام کرسی پر پڑا سو رہا تھا۔ حمید نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ جتنی دیر سونے کا تہیہ کر چکا ہے اتنی ہی دیر سوئے گا۔ اس نے نہ جانے کس طرح یہ عادت ڈال لی

گڑھی میں کس طرح پہنچا اور پھر خلاف معمول پچھلی رات کو اس پر دورہ کیوں نہیں پڑا۔ وہ ارسلانوس کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ محض اس لئے کہ یہ ثابت کرنے کیلئے ایزی چوٹی کا زور لگا دیا کہ تحت عقرب یدہ راج گڑھی میں موجود نہیں ہے تو کیا ان سب شیطانی حرکتوں میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے یہی بات ہو کیونکہ اس کے اور صولت مرزا کے تعلقات اچھے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ دونوں ملتے ضرور ہیں لیکن ان کے درمیان میں کوئی ناخوشگوار ماحول جذبہ حائل معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار ارسلانوس نے اس کی برائیاں بھی تو بیان کی تھیں اور جمیلہ کی حرکات کو محض ڈھونگ قرار دیا تھا تاکہ گھر والوں پر اس کا رعب قائم رہے۔ اس کے برخلاف جمیلہ اس بات کی شاکی ہے کہ اس کے گھر والے اسے بدنام کر کے شادی سے روکنا چاہتے ہیں۔

حمید نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے ذہن کو ان واقعات کی طرف سے ہٹالے۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ یدہ راج نگر سے رواجی کے وقت اس کا دماغ بُری طرح پک رہا تھا اور چہرے پر گہرے غم کے آثار تھے۔ لیکن اس کے برخلاف فریدی بالکل ہی سیدھے سادھے موڈ میں تھا۔.... رواجی سے قبل اس نے صولت مرزا سے الوداعی ملاقات اس طرح کی جیسے وہ اب تک ان کے یہاں محض سیر و تفریح کرتا اور دعوتیں اڑاتا رہا ہو۔ حمید نے اس وقت ایک بات اور بھی محسوس کی کہ جمیلہ خلاف عادت بہت زیادہ ہشاش نظر آرہی تھی اور بقیہ لوگوں کے چہروں پر وہی آثار تھے، جو کسی مہمان کو رخصت کرتے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ خصوصاً صولت مرزا بہت زیادہ پریشان اور اداس معلوم ہو رہا تھا۔

جمیلہ انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے کے لئے آئی۔ صولت مرزا بھی آ رہا تھا لیکن فریدی نے روک دیا۔

گاڑی پندرہ یا بیس منٹ لیٹ تھی حمید کو اس وقت سخت حیرت ہو رہی تھی کہ فریدی نے جمیلہ سے سوائے چند رسمی باتوں کے اور کوئی بات نہ کی۔ آخر کیوں؟ حمید کا خیال تھا کہ جمیلہ اس ڈرامے کی خاص کردار ہے لیکن فریدی اسے بُری طرح نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ فریدی اسے تنہا پاتے ہی اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دے گا۔ اس دوران میں فریدی کسی کام سے ان کے پاس سے ہٹ گیا اور جمیلہ حمید سے بولی۔

”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ نے ان باتوں کا تذکرہ والد صاحب سے تو نہیں کیا۔“

تھی۔ یہ چیز کسی عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ اچھے اچھے با اصول قسم کے لوگ بھی نیند پر جبرہ کر رہا تھا۔

نہیں پاتے۔ لیکن فریدی کا خیال تھا کہ جتنی دیر بعد جاگنے کا تہیہ کر لیتا اس سے ایک منہ اور ادھر ادھر نہ ہوتا۔ وہ اکثر حمید سے کہا کرتا تھا کہ وہ اس کی قوت ارادی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ قوت ارادی کی تربیت انسان کو کسی چیز کی پابند نہیں بنا سکتی۔ خواہ وہ موت ہی کیوں نہ ہو اور حمید سچ سچ اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نہیں سینکڑوں بار فریدی کو موت کے منہ سے نکلنے دیکھا تھا۔

آٹھ بجے فریدی سو کر اٹھا لیکن وہ بہت خاموش خاموش تھا۔ چہرے پر گہرے غم کے آثار تھے اور آنکھیں ابھی تک نیند میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ناشتے کے دوران میں اس نے گزری ہے لیکن اتنے نمونے خود میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ بہت کم گفتگو کی۔ وہ بھی اس کیس یا زیر تفتیش کتبے کے متعلق نہیں تھی۔ دس بجے وہ دفتر کے لئے روانہ ہو گئے۔ فریدی دیر تک دفتر میں بیٹھا۔ اس نے سرزنش کی بناء پر ایک دوسرے سے آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔ حاضری بتائی۔ دو ایک کاغذات دیکھے اور پھر اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ حمید نے شام چار بجے تک اس انتظار کیا۔ لیکن وہ جب واپس نہ آیا تو مجبوراً اسے ٹیکسی ہی پر گھر واپس ہونا پڑا کیونکہ فریدی اپنی کاغذی ہوئی ہے۔ ساتھ لے گیا تھا۔

وہ گھر پر بھی موجود نہیں تھا۔ حمید غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کرے کہ فریدی کی آواز سنائی دی۔ وہ برابر کے کمرے میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ حمید آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا۔ فریدی کا مخاطب ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم آدمی تھا جس سے سر اٹھنے کے چھلکے کی طرح صاف اور نچلا جڑا اتنا بھاری تھا کہ غیر متناسب معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ نہ جانے ان میں کیا بات تھی کہ حمید کو ہاتھی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ سفید قمیض اور پتلون میں وہ بڑا باریع معلوم ہو رہا تھا۔ گفتگو کرتے وقت اس کی ٹھوڑی کچھ انداز سے ہل رہی تھی کہ حمید کا ذہن ایک ایسے بھیڑیے کے تصور سے خالی نہ رہ سکا جو اپنے انداز کی بونیاں نوچ رہا ہو۔ فریدی اسے ساتھ لے کر اپنے عجائبات کے کمرے میں چلا گیا۔

حمید حیرت تھا کہ وہ کون ہے۔ اُس نے اسے کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور تھا۔ لیکن اسے اچھی طرح یقین تھا کہ اس نے اسے فریدی کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ عجائبات کے کمرے کی طرف بڑھا۔ فریدی اس نووارد کو بعض قدیم اور تاریخی چیزیں دیکھا دیکھا کر ان کے

حمید نے دیکھا کہ نووارد بھی کبھی کبھی اظہار خیال کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ حمید نے محسوس کیا کہ فریدی اسے خاص طور پر قدیم کتبوں اور مخطوطات کے نمونے دکھا رہا ہے۔

”میں ان چیزوں پر عاشق ہوں۔“ فریدی نے اسے کہا۔ ”اور جہاں کہیں بھی مجھے کوئی پرانا کتبہ دکھائی دیتا ہے اسے خرید لینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہوں۔“

”اچھا شوق ہے۔“ نووارد نے سر ہلا کر کہا۔ ”خیر میری تو عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے لیکن اتنے نمونے خود میرے پاس بھی نہیں ہیں۔“

”خیر بہر حال۔“ فریدی اسے سرگرم پیش کرتا ہوا بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ ایک مشترک شوق دس بجے وہ دفتر کے لئے روانہ ہو گئے۔ فریدی دیر تک دفتر میں بیٹھا۔ اس نے سرزنش کی بناء پر ایک دوسرے سے آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔“

حاضری بتائی۔ دو ایک کاغذات دیکھے اور پھر اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ حمید نے شام چار بجے تک اس انتظار کیا۔ لیکن وہ جب واپس نہ آیا تو مجبوراً اسے ٹیکسی ہی پر گھر واپس ہونا پڑا کیونکہ فریدی اپنی کاغذی ہوئی ہے۔ ساتھ لے گیا تھا۔

وہ گھر پر بھی موجود نہیں تھا۔ حمید غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کرے کہ فریدی کی آواز سنائی دی۔ وہ برابر کے کمرے میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ حمید آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا۔ فریدی کا مخاطب ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم آدمی تھا جس سے سر اٹھنے کے چھلکے کی طرح صاف اور نچلا جڑا اتنا بھاری تھا کہ غیر متناسب معلوم ہوتا تھا۔

آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ نہ جانے ان میں کیا بات تھی کہ حمید کو ہاتھی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ سفید قمیض اور پتلون میں وہ بڑا باریع معلوم ہو رہا تھا۔ گفتگو کرتے وقت اس کی ٹھوڑی کچھ انداز سے ہل رہی تھی کہ حمید کا ذہن ایک ایسے بھیڑیے کے تصور سے خالی نہ رہ سکا جو اپنے انداز کی بونیاں نوچ رہا ہو۔ فریدی اسے ساتھ لے کر اپنے عجائبات کے کمرے میں چلا گیا۔

حمید حیرت تھا کہ وہ کون ہے۔ اُس نے اسے کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور تھا۔ لیکن اسے اچھی طرح یقین تھا کہ اس نے اسے فریدی کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ عجائبات کے کمرے کی طرف بڑھا۔ فریدی اس نووارد کو بعض قدیم اور تاریخی چیزیں دیکھا دیکھا کر ان کے

”یونیورسٹی کے شعبہ تواریخ کا صدر ڈاکٹر بھٹناگر۔“

”تو آپ اسی کتبے کے چکر میں ہیں۔“

”ہاں! یہ گڑھی کی کھدائی اسی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔“

”وہ کتبہ....!“

”یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کا کہنا ہے کہ اس قسم کا کوئی کتبہ براہِ منہ نہیں ہوا۔“

”وہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا....“ حمید مسکرا کر بولا۔

فریدی نے ایک کیمبن کا پردہ ہٹایا لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پردہ بدستور ہٹا ہوا تھا۔ فریدی کے چونکنے پر حمید نے بھی اندر کی طرف دیکھا۔ داہنے کنارے پر رکھی ہوئی کرسی پر ایک آدمی بیٹھا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے۔

”آپ کی تعریف....!“ حمید نے تمسخرانہ انداز میں فریدی سے پوچھا۔

فریدی پر خیال انداز میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ حمید نے اس کے چہرے پر ابھرنے کے آثار محسوس کئے۔

”کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں! تم یہیں اسی جگہ ٹھہرو۔“ فریدی نے کہا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹیلی فون کار میسور اٹھا کر نمبر ملائے اور بولنے لگا۔

”ہیلو.... کو تو اہی.... کون.... جگڈیش کو بلاؤ۔“ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”جگڈیش! میں فریدی بول رہا ہوں۔ مئے پول ہوٹل کے کیمبن نمبر چودہ میں ایک لاش ملی ہے.... فوراً آؤ۔“

لاش کا نام سن کر قریب بیٹھی ہوئی لڑکی اچھل پڑی۔

”چپ چپ! ہلومت بچانا۔“ فریدی نے اس سے آہستہ کہا۔ ”میں پولیس کا آدمی ہوں۔“

کلرک بُری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔ بار بار اس کی نظریں کیمبن نمبر چودہ کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”جب تک پولیس نہ آجائے تم یہاں کسی سے کچھ نہیں کہو گی۔“ فریدی نے اس سے کہا اور بھر کیمبن کے قریب لوٹ آیا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”لاش....!“

”کہاں لاش....!“

”آہستہ بولو! اندر۔“ اس نے کیمبن کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے.... تو.... تو....!“

”تم غلط جانتے تھے۔“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے دیکھتا ہوا بولا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ کھانا مئے پول میں کھائیں گے۔“

”کوئی خاص بات۔“ حمید اسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ہو سکتا ہے کوئی خاص بات ہی ہو جائے۔ جلدی کرو۔“

”دوڑ دھوپ نہیں کروں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہ ایک آؤنڈر مہاکے بھی ہوں گے۔“

”چلو چلو....!“ فریدی بیزار سی بولا۔

حمید ایک فلمی گیت گاتا ہوا دوسرے کمرے میں جانے لگا۔

”ٹھہرو....!“ فریدی نے کہا۔

حمید رک گیا۔

”آئندہ اس قسم کے گیت نہیں گاؤ گے۔“

”خدا کی قسم آپ نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔“

”بکومت.... جاؤ....!“

بُری پھنسے

مئے پول ہوٹل میں خاصی رونق تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ڈرائیونگ ہال میں بھی بال روم موسیقی سنائی دے رہی تھی لیکن ابھی شاید رقص نہیں شروع ہوا تھا۔

حمید نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص انداز میں دانت کلکٹائے اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کاؤنٹر پر آج کوئی دوسری کلرک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

”یہ کوئی نئی معلوم ہوتی ہے۔“ حمید نے فریدی سے کہا۔

فریدی اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر کیمبنوں کی طرف بڑھنے لگا۔ حمید چل تو رہا تھا کہ پیچھے.... لیکن ذہن بال روم کی موسیقی میں الجھا ہوا تھا۔

”شامت.... میں جا رہا ہوں۔“

”ٹھہرو.... اس کی موت غیر متوقع ضرور ہے لیکن وہ خود....!“

”کیا آپ اسے جانتے ہیں۔“

”ہاں.... وہ اس کتبے سے واقف تھا۔“

”ارے.... تو.... اس کا یہ مطلب....!“

”ہاں میں اسی سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔“

”کس طرح.... کیسے۔“

”پھر بتاؤں گا۔ جگہ لیش وغیرہ شاید اب آہی رہے ہوں گے۔“

”کیا مصیبت ہے۔“ حمید جھنجھنایا۔ ”جہاں کسی معاملے میں ہاتھ دیا.... کشت و خون شروع

ہو گیا۔“

فریدی کوئی جواب دیئے بغیر کیمین کے اندر چلا گیا۔ حمید باہر ہی ٹھہرا رہا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد پولیس کی لاری نئے پول ہوٹل کے سامنے رکی۔ انسپکٹر جگہ لیش دو تین کانشیلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑے ناخوشگوار قسم کے تاثرات پائے جا رہے تھے۔ شاید وہ اس حادثے کی غیر متوقع اطلاع پر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر حمید پر پڑی جو کیمین نمبر چودہ کے سامنے کھڑا تھا۔ حمید نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

”کہئے؟ فریدی صاحب کہاں ہیں۔“

”اوپر نیجر کے کمرے میں۔“ حمید نے کہا اور پھر کیمین کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”ترقی کا ایک اور موقع۔“

”چھوڑیئے بھی! میں تو اب عاجز آ گیا ہوں۔“ جگہ لیش نے منہ بنا کر کہا اور پردہ اٹھا کر کیمین کے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے ہوٹل کا نیجر اور فریدی بھی پہنچ گئے۔ حمید کی ڈیوٹی کانشیلوں نے سنبھال لی اور وہ بھی اندر چلا گیا۔

مرنے والا ابھی تک اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں اور سکتے ہوئے ہونٹوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے مرنے سے قبل اسے کسی گہرے تحیر میں ڈوبنا پڑا ہو اور اسی

حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔

”غالباً آپ اس وقت بہت زیادہ مشغول ہوں گے۔“ فریدی نے نیجر سے کہا، جو بہت زیادہ

گہرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ کر باہر چلا گیا۔

”میں یہاں کھانا کھانے کی غرض سے آیا تھا۔“ فریدی نے جگہ لیش سے کہا۔ ”اتفاقاً اسی کیمین

کی طرف گھوم پڑا۔“

”لیکن یہ مرا کیسے۔“ جگہ لیش نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”بھئی میں اس کے ساتھ تو تھا نہیں۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”یہ بات پوسٹ مارٹم

کے ذریعہ معلوم ہی ہو جائے گی۔“

”تو میں یہاں اس کے متعلق تفتیش شروع کر دوں اور رپورٹ میں یہ لکھ دوں کہ لاش کی

اطلاعات مجھے آپ سے ملی تھی۔“

”ضرور.... ضرور....!“

جگہ لیش کی ہچکچاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔ لیکن فریدی نے اسے اس کا

موقع ہی نہ دیا۔ وہ حمید کا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل کے باہر نکل آیا۔

”کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ قتل ہے یا خودکشی۔“ حمید نے کہا۔ ”فطری موت.... یا قیوم نظر کی

شاعری قسم کی کوئی ناقابل فہم حرکت.... آخر اسے کیا سمجھا جائے۔“

”قتل....!“

”لیکن قتل کا طریقہ سمجھ نہ آیا۔“ حمید نے کہا۔ ”اور شاید یہ پہلا موقع ہے کہ آپ نے اتنے

پراسرار قتل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔“

”طریقہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہو جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”اور قتل کی وجہ سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ مرنے والے کا صورت آشنا بھی پہلے ہی

سے تھا۔“

”اور پھر بھی آپ اسے اتنی لاپرواہی سے ٹال گئے۔ آخر وہ تھا کون؟“

”یونیورسٹی کے شعبہ تواریخ کا ایک لیکچرار.... آثار قدیمہ کی چھان بین کرنے والی پارٹی کا

ایک رکن۔“

واقف ہیں۔“

”یقیناً....!“ فریدی نے کہا۔ ”شاید تم اس بات سے نہیں واقف کہ آثار قدیمہ کی چھان بین کرنے والی اس پارٹی کا واحد مشغلہ دینیوں کی تلاش ہے۔ آثار قدیمہ کی چھان بین تو محض ایک بہانہ ہے۔“

”اوہ! لیکن آپ کی یہ ساری معلومات نئی نہیں معلوم ہوتیں۔“
”ٹھیک ہے! پہلے محض شبہ تھا لیکن اب یقین ہو چکا ہے۔“ فریدی نے کہا اور کھڑکی پر ہاتھ ٹپک کر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

”ارے یہ ٹیکسی کدھر جا رہی ہے۔“ دفعتاً وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ حمید بھی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ دراصل باتوں میں اس درجہ محو ہو گئے تھے کہ انہیں اس کا دھیان بھی نہیں رہا کہ وہ کہاں کے لئے روانہ ہوئے تھے اور ٹیکسی کدھر جا رہی ہے۔ اچانک ڈرائیور کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں کوئی چیز چمکی اور وہ ان کی طرف مڑ کر بیٹھ گیا۔ اعشاریہ تین آٹھ کارپو الوور اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ پہلے وہ دونوں اسے کلیئر سمجھے ہوئے تھے کیونکہ ان کی پوشش کچھ اس قسم کی تھی۔ اب انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا، جو حد درجہ خوفناک تھا اور چمکیلی آنکھوں سے سفاکی ظاہر ہو رہی تھی۔

فریدی ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سیٹ کی پشت سے ٹک گیا۔

ٹیکسی شہر کے باہر ایک ویران سڑک پر کھڑی کر دی گئی۔

”باہر آؤ....!“ ریو الوور والا گرج کر بولا۔

حمید نے کچھ کہنا چاہا لیکن فریدی نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

دونوں چپ چاپ نیچے اتر آئے۔

”ان کی تلاشی لو۔“ ریو الوور والے نے ڈرائیور سے کہا اور فریدی اور حمید نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائیے، اتفاق سے اس وقت ان دونوں میں سے کسی کے پاس ریو الوور نہیں تھا۔

”کوئی خطرناک چیز....!“ ریو الوور والے نے ڈرائیور سے پوچھا جو ان کی جامہ تلاشی لے کر

الگ ہٹ گیا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”قتل کی وجہ کے متعلق آپ کیا کہہ رہے تھے۔“

”وہ مجھے اس کتبے کے متعلق اہم بات بتانے والا تھا۔“

فریدی نے ہاتھ اٹھا کر ایک ٹیکسی رکوائی اور پھر وہ اس میں بیٹھ کر آر لکچو کی طرف روانہ ہو گئے۔

”لیکن آپ نے جلدیش سے یہ باتیں کیوں چھپائیں۔“ حمید بولا۔

”اس کی ضرورت تھی۔ بہر حال قاتل ہر وقت ہماری مٹھی میں ہے۔“

”کیا....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”آپ قاتل سے بھی واقف ہیں۔“

”قطعاً....!“

”تو اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے۔“

”ہمارے پاس فی الحال اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے۔“

”وہ دوسرا آدمی آپ کو کہاں مل گیا تھا۔“

”وہیں یونیورسٹی کے تواریخی عجائب خانے میں۔“ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہیں موجود تھا جب میں ڈاکٹر بھٹناگر سے اس کتبے کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔“

فریدی خاموش ہو کر سگار کے کش لینے لگا۔

”پھر....؟“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے ڈاکٹر بھٹناگر کو اپنے شوق کے متعلق بتایا اور اسے دعوت دی کہ وہ کسی دن میرے

جمع کئے ہوئے نمونے بھی دیکھے اور وہ اسی وقت اس کے لئے تیار ہو گیا۔“

فریدی پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر تک چپ رہا پھر بولا۔ ”جب ہم دونوں

باہر آ رہے تھے مرنے والے نے پیچھے سے ایک چھوٹا سا پرچہ مجھے تھما دیا۔“

”اور اسی پرچے میں یہ لکھا ہوا تھا کہ آپ اس سے مئے پول ہوٹل میں ملیں۔“ حمید نے کہا

”اف فوہ.... یار کچ تم بڑے ذہین ہوتے جا رہے ہو۔“ فریدی بولا۔

”کیا آپ اس وقت یہ نہیں سمجھتے تھے کہ بھٹناگر کو اس پرچے کا علم ہو گیا ہے۔“

”حقیقتاً میں دھوکا کھا گیا۔“ فریدی مضحل آواز میں بولا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کتبے کے راز سے ڈاکٹر بھٹناگر کے علاوہ کچھ اور لوگ

کہ فریدی نے اس کا ہاتھ دبا دیا اور وہ پھر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی اب بھی ایک ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی اور نہ جانے کدھر سے دو تین آدمی اور آگئے۔
”کھینچ کر باہر نکال لو۔“ ریوالور والا گرجا۔

دوسرے آدمیوں نے ٹیکسی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ڈرائیور ابھی تک اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ حمید کو تو انہوں نے جلد ہی باہر کھینچ لیا لیکن فریدی ابھی تک بڑا بیٹھا تھا۔ تین تین آدمی اسے کھینچ رہے تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر رہا تھا۔ شامت اعمال ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کی گردن فریدی کے ہاتھ میں تھی اور وہ دروازوں کے پاٹوں میں دبے ہوئے کتے کی طرح چیخ رہا تھا۔

”میں سچ کہتا ہوں گولی مار دوں گا۔“ ریوالور والے نے باہر سے کہا۔

”ابے تو اس میں کہنے سننے کی کیا بات ہے۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔ ”مار بھی دے۔“

”سکا سکا کر ماروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”خیر معلوم ہوا کہ تم بھی اپنے دن پورے کر چکے ہو۔“ حمید دانت پیس کر بولا۔

”شٹ اپ.....!“

”یو شٹ اپ ڈرنی ڈاگ.....!“ حمید حلق کے بل چیخا۔

ریوالور والے نے حمید کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔ حالانکہ حمید دو گرانڈیل آدمیوں کی گرفت میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا لیکن ریوالور والے کا تھپڑ پڑتے ہی گویا اس کے جسم میں بجلیاں کوند گئیں اور یک لخت اس طرح تڑپا کہ وہ دونوں اسے نہ سنبھال سکے۔ ساتھ ریوالور والا بھی زمین پر آ رہا۔ حمید نے بس اتنا محسوس کیا کہ اس پر بھی کوئی جھپٹ پڑا۔

”خبردار.....!“ فریدی کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور تم ڈرائیور کے

بچے باہر نکلو..... نکلو.....!“

”ہرا.....!“ حمید کی لکار دور تک سنائے میں لہراتی چلی گئی۔

”حمید ٹیکسی اشارت کرو۔“ فریدی نے کہا۔ ”خبردار اگر کوئی اپنی جگہ سے بلا تو شوٹ

کردوں گا۔ ہاتھ اٹھائے رکھو۔“

حمید اچھل کر ڈرائیور کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ فریدی ان آدمیوں کی طرف ریوالور کی نال کئے

”چلو بیٹو.....!“ اس نے ریوالور کی نال سے ٹیکسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آر لکچو ہوٹل.....!“ فریدی ٹیکسی پر بیٹھا ہوا بولا۔

ریوالور والے کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ٹیکسی پھر چل پڑی۔

”میں کہتا ہوں..... آر لکچو ہوٹل! کیا تم بہرے ہو گئے ہو۔“ فریدی ڈرائیور کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“ ریوالور والے نے آہستہ سے کہا۔

”چپ چاپ ہیں پیارے بھائی۔“ حمید دانت پر دانت جما کر بولا۔ ”بھوک کے مارے آواز

ہی نہیں نکل رہی ہے ورنہ اس وقت تمہیں شام کلیان سنا تا۔ معرکے کی چیز ہے۔“

”ڈرائیور.....“ فریدی چیخا۔

”جانے بھی دیجئے۔“ حمید اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”اگر بے چارے کے کان کے پردے

پھٹ گئے تو اس کے بال بچوں کے حلق پھٹ جائیں گے۔“

”تم ہو کون۔“ فریدی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں تم سے ہر گز یہ نہ پوچھوں گا کہ تم نے یہ سب کس لئے کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریوالور والا مسکرا کر بولا۔ ”جتنی بہادری چاہو دکھاؤ..... پھر موقع نہ ملے گا۔“

”کیا سمجھے۔“ حمید نے فریدی کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”بھائی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے کھانے پینے کا انتظام پہلے ہی کر لیا ہو گا۔“

”ضرور ضرور.....!“ ریوالور والا مسکرا کر بولا اور پھر ریوالور کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

”اس غذا کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”بہت کم لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”ویسے چیز شاندار ہے..... ذرا دینا تو۔“

”بیچھے ہو.....!“ ریوالور والا درشت لہجے میں بولا۔

”بڑے بھائی بُرا مان گئے۔“ حمید نے بچوں کی طرح منہ بنا کر پوچھا۔

فریدی انتہائی بے تعلقانہ انداز میں ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس ریوالور کو نفی سمجھتا ہو۔ ایک جگہ ٹیکسی پھر کی اور ان سے نیچے اترنے کو کہا گیا۔ حمید اٹھ ہی رہا تھا

اچھی طرح یاد تھا جب وہ نادانستی میں ایک گہرے تالاب میں جاگرا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے تیرنا نہ آتا ہوتا تو اس کا کیا حشر ہوتا اور اگر اسے اس درخت کی شاخ نہ مل جاتی تو وہ کنارے ہی پہنچ کر ڈوب گیا ہوتا۔ وہ بھی دلدل میں کمر تک تو یونہی دھنس گیا تھا۔ کتنی خوفناک دلدل تھی جس کے سہارے وہ پھر سے دنیا دیکھ سکا۔ ورنہ نہ کہیں جنازہ اٹھاتا نہ کہیں مزار ہوتا اور احباب بچارے پلاؤ کے لئے منہ دیکھ کر رہ جاتے۔

فریدی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کیا ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا؟ حمید خود کو نفرین کر رہا تھا۔ اس نے شروع ہی سے اپنا اطمینان کیوں نہیں کر لیا تھا۔ اگر اسے اس وقت یہ معلوم ہو گیا ہوتا کہ فریدی ٹیکسی میں نہیں بیٹھ سکا تو کبھی اس طرح نہ بھاگتا۔

اس کے خیالات کی رواجناکیدہ راج گڑھی کی طرف مڑ گئی اور اسے فریدی کے قول کی صداقت پر کچھ کچھ یقین آنے لگا۔ اس پر اسرار کتبے کی جس پر مہمل اشعار لکھے ہوئے تھے اہمیت ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کتبے کے لئے شعبہ توارخ کے ایک لیکچرار کا قتل ہو گیا۔ اسے اور فریدی کو پکڑنے کی کوشش کی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا حقیقتاً تخت عقرب جیسے کسی حیرت انگیز تخت کا وجود ہے۔ پھر اسے وہ مہمل اشعار یاد آ گئے اور ساتھ ہی ہنسی بھی آ گئی۔ اس مصرع پر تو اس کا دماغ ہی چل نکلا۔

بچھو پر آلو بیٹھے گا
اور اس نے انہیں اوزان میں مصرعے فٹ کرنے شروع کر دیے
آلو پر گدھا بیٹھے گا
گدھے پر مرغی بیٹھے گی
مرغی پر بلی بیٹھے گی
بلی مگڑوں کوں بولے گی

وہ غسل خانے سے آکر ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ لیکن اس وقت اس کا دل کسی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوال گونج رہا تھا کہ فریدی پر کیا گزری ہو گی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ صبح کا اخبار دیکھنے کے لئے لائبریری کی طرف جا رہی رہا تھا کہ نوکر نے ایک تار لاکر اسے دیا۔ حمید کا دل دھڑکنے لگا اور لغافہ چاک کرتے کرتے اس کے ذہن نے لاتعداد سوال

ہوئے آہستہ آہستہ ٹیکسی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی طرف سے فائر ہونے شروع ہو گئے۔

فریدی جھپٹ کر ٹیکسی کی آڑ میں ہو گیا اور اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور سے بجز شعلے نکلنے لگے۔

”حمید.... نکل چلو۔“ فریدی نے چیخ کر کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ حمید نے ٹیکسی بڑی پھرتی سے گھمائی تھی اور اب اسے اچھی خاصی رفتار سے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک طویل سڑک تھی اور کانوں میں گولیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

تھوڑی دور چل کر اس نے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی اور بے اختیار اچھل پڑا۔ اگر فوراً اسٹیرنگ نہ سنبھال لیتا تو ایک درخت سے گاڑی ضرور ٹکرا جاتی۔ پچھلی سیٹ خالی تھی۔ حمید نے بوکھلا کر ٹیکسی روک دی۔ آخر فریدی کہاں گیا، کیا وہ بدحواسی میں اسے وہیں چھوڑ آیا۔ اپنی جان بچانے کے لئے یہ تک نہ دیکھا کہ فریدی بھی بیٹھ چکا ہے یا نہیں۔ اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں ہی سے اپنا گلا گھونٹ لے۔

وہ ٹیکسی سے اتر آیا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے کہ دور اسے کسی کار کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ دفعتاً ایک سوال تیزی سے اس کے ذہن میں گونج اٹھا۔ کیا وہ لوگ اس کا تعاقب کر رہے ہیں اور پھر دوسرے ہی لمحے میں جھپٹ کر وہ جھاز یوں کے پیچھے جا چکا تھا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ کار ٹیکسی کے قریب آکر رک گئی۔ کئی آدمی اتر کر خالی ٹیکسی کا جائزہ لینے لگے۔

”تلاش کرو۔“ ان میں سے ایک چیخا۔ ”جھاز یوں میں گھسو۔“

حمید بچوں کے بل نشیب میں دوڑنے لگا۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں سنائے کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اچانک حمید کا پیر پانی میں پڑا اور وہ لا محدود گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

آگ

دوسرے دن صبح حمید اپنی پلنگ پر پڑا رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اسے اپنی الجھن کا وہ

کر ڈالے۔ تار فریدی کے نام تھا۔ لیکن تار دینے والے کا نام پڑھ کر حمید کے ہونٹ سکڑ گئے۔ سوچنے لگا کہ اب کیا مصیبت آگئی۔ اس نے ایک بار پھر تار کا مضمون پڑھا۔

”فوراؤ.... ایک نئی مصیبت.... صولت مرزا....!“

حمید سوچنے لگا کہ یہ نئی مصیبت کیا ہو سکتی ہے۔ کیا وہ بھوت جیلہ کو اٹھالے گئے۔ لیکن پچھ رات کے واقعات کے بعد سے وہ انہیں بھوت سمجھنے پر پس و پیش کر رہا تھا اور پھر ان مہمل اٹھ میں بھی تو کسی فقارے کا ذکر تھا۔ ان بھوتوں کو بھی کسی فقارے کی تلاش تھی۔ ان سب باتوں باوجود بھی کم از کم جیلہ کی بیماری کا معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن فریدی اسے ایک قسم بیماری ہی قرار دے رہا تھا۔ خیر چلے بیماری ہی سہی۔ لیکن وہ کتابچہ راج گڑھی میں سینکڑوں سال سے روتا چلا آ رہا ہے اور عموماً بارش ہی کے زمانے میں روتا ہے اور جب بھی روتا ہے قریر کی ندی میں اتنا زبردست سیلاب آتا ہے کہ کنارے بے ہوئے گاؤں ڈوب جاتے ہیں۔ آخر کو منطق اس کا جواز کس طرح پیش کرے گا۔ اسے کس طرح انسانی کارنامہ قرار دے گا۔

کچھ دیر قبل حمید ان سارے معاملات سے بُری طرح بیزار تھا اور کسی نہ کسی طرح اپنی جا بچا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن فریدی کا اس طرح غائب ہو جانا اس کی کاہلی کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ حمید کو یقین تھا کہ وہ یہ راج نگر ہی کے واقعات کے سلسلے میں غائب ہوا ہے۔ لہذا اب اس معاملے کو کسی طرح نہیں ٹال سکتا تھا۔ خواہ خود اس کی جان ہی کو خطرہ کیوں نہ ہو۔ اس نے فوراً ہی ایک ملازم کو تار کا جواب لکھ کر دیا اور خود ٹیلی فون پر دفتر کے کسی آدمی سے گفتگو کرنے لگا۔

صولت مرزا کو وہ اپنی روانگی کے متعلق تار دے چکا تھا۔ اگر فریدی کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فریدی اس معاملے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اور اسی لئے شاید اس پر کوئی اچانک مصیبت نازل ہوئی ہے اگر وہ یہ راج نگر نہ گیا تو ممکن ہے کہ اس کے لئے زندگی بھر افسوس کرنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ فریدی سچ جال میں پھنس گیا ہو۔

اسی رات کو وہ یہ راج نگر پہنچ گیا۔ صولت مرزا بذات خود اسٹیشن پر موجود تھا۔ لیکن بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”فریدی نہیں آئے۔“ اس نے سب سے پہلے سوال کیا۔

”وہ پھر بتاؤں گا.... آپ یہ بتائیے کہ بات کیا ہے۔“

”آؤ چلو باہر گاڑی کھڑی ہے بتاؤں گا.... عجیب قسم کی مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔“

وہ دونوں اسٹیشن کے باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔

”کل رات کو اصطبل میں آگ لگ گئی تھی۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”کس طرح۔“

”خدا بہتر جانتا ہے جیلہ بُری طرح جل گئی ہے۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے۔“

”جل گئیں....!“ حمید چونک کر بولا۔ ”وہ کس طرح جل گئیں۔“

”پچھلی رات کو پھر اس پر دورہ پڑا تھا اور وہ پُر اسرار آدمی پھر دکھائی دیئے تھے۔“

”اوہ....!“

”وہ اسے پہلے کی طرح اصطبل میں لے گئے اور پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اصطبل میں آگ لگ گئی۔ بدقت تمام جیلہ کو اندر سے نکالا جاسکا۔ وہ تو کبھی گھوڑے کے پیروں تلے روندی نہیں گئی۔“

”اور وہ آدمی....!“ حمید نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

”وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔“

حمید سوچ میں پڑ گیا.... پھر تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور بات۔“

”اور کچھ نہیں۔“

گھر پہنچ کر حمید نے جیلہ کو دیکھا جو واقعی بُری طرح جل گئی تھی۔ اس کا سارا جسم ٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس کا سارا چہرہ قطعی محفوظ تھا۔ تین چار نرسیں اس کمرے میں موجود تھیں اور پورے گھر پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد حمید صولت مرزا کو ساتھ لے کر اصطبل کی طرف گیا جو اب راکھ کا ڈھیر معلوم ہو رہا تھا۔ کہیں ادھ جلی دیواریں کھڑی تھیں جن کی جڑوں تک سیاہی دوڑ گئی تھی۔

”وہاں سے لوٹ کر وہ تمباکو نوشی کے کمرے میں آ بیٹھے۔“

”ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس نے تو کافی اطمینان دلایا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق آگ کا اثر اندرونی اعضاء پر نہیں ہے۔“

”تو پھر یقیناً کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں تم نے فریدی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ صولت مرزا نے پوچھا۔

اتنے میں نوکر کافی کیڑے لایا اور صولت مرزا کافی انڈیلنے لگا۔

لیکن وہ ابھی تک جواب طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حمید نے فریدی کے متعلق مختصر سب کچھ بتادیا۔

”اے تو کیا حقیقتاً اس کتبے یا ان اشعار میں کوئی خاص بات تھی۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”تو

اب ایک دوسری الجھن اُنہ جانے فریدی پر کیا گزری ہو۔“

”خیر اسے تو چھوڑیے۔ مجھے اس کی ذرہ برابر فکر نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ہم لوگ موت

سے نہیں ڈرتے۔ میں آپ سے اس نقارے کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”نقارہ! کیسا نقارہ۔“

”وہی نقارہ جس کی تلاش میں وہ پراسرار آدمی اصطبل کے چکر لگاتے تھے۔“

صولت مرزا کوئی جواب دینے جا رہا تھا کہ ارسلانوس آگیا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ سنجیدہ نظر

آ رہا تھا۔ چہرے پر وحشت کے آثار نہیں تھے۔ سر پر بالوں کا گلدستہ نما جھکاڑ بھی نہیں تھا۔ آج نہ

جانے کیوں اس نے اپنے بال بڑے سلیقے سے سنوار رکھے تھے۔ داڑھی میں بے ترتیبی نہیں تھی۔

”جیلہ کیسی ہے۔“ اس نے پوچھا اور پھر حمید پر نظر پڑتے ہی بولا۔

”اوہ آپ!....!“

اس نے حمید کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے میں حمید کے ہاتھ کی ہڈیاں

کڑکڑا گئیں۔

”وہ محمد کمال آفندی کہاں ہیں۔“ اس نے حمید سے پوچھا۔

”احمد کمال فریدی کہتے۔“ حمید نے نوکا۔

”وہی وہی!....“ ارسلانوس مسکرا کر بولا۔ ”نہ جانے کیوں مجھے ان کا یہی نام یاد رہتا ہے۔

ہاں بھی صولت جیلہ کا کیا حال ہے۔“

”پہلے سے کچھ بہتر۔“ صولت مرزا نے کہا۔

حمید نے محسوس کیا کہ ارسلانوس دوسری طرف منہ پھیر کر مسکرایا ہے۔ صولت مرزا کے

چہرے پر بیزاری کے اثرات پھیل گئے تھے۔ وہ چند لمحوں کے بعد کوئی عذر کر کے اندر چلا گیا۔

حمید ارسلانوس کے پاس آ بیٹھا۔

”آپ جیلہ کی کیفیت سن کر مسکرائے کیوں تھے۔“ حمید نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”دیکھو فرزند! میں تمہیں ایک بار پھر سمجھانے دیتا ہوں کہ مجھ سے ایسی لہجے میں گفتگو نہ کیا کرو۔“

”تو اصطبل میں تم نے ہی آگ لگائی تھی۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ ارسلانوس بگڑ کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کا تعلق محکمہ سراغ

رسانی سے ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم شریفوں کی توہین کرتے پھرو۔ اگر تم صولت

کے مہمان نہ ہوتے تو میں تمہیں اس بد تمیزی کا مزہ اچکھا دیتا۔“

”خیر.... میں صولت مرزا کو اس معنی خیز مسکراہٹ سے آگاہ کر دوں گا۔ شاید انہوں نے

دیکھا نہیں تھا۔“

”تم نے پھر وہی بکو اس کی۔“

”اچھا تمیز سے گفتگو کیجئے۔“ حمید نے بگڑ کر کہا۔

”بیٹا اگر جان کی خیریت چاہتے ہو تو جتنی جلدی ہو سکے اس گھر سے نکل بھاگو۔“ ارسلانوس

نے کہا۔

”کیوں!....؟“ حمید چونک کر بولا۔

”صولت نے جو کھیل شروع کر رکھا ہے اس کے دوران میں تم لوگوں کا وجود برداشت نہیں

کر سکو گے۔“

”کیسا کھیل!....!“

”وہی کھیل جو اس نے میرے بیٹے کے ساتھ کھیلا تھا۔“

”بھلا میں کیا جانوں۔“

”اچھا تو آؤ میری ساتھ۔“ ارسلانوس اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”وہ اسے عقبی پارک میں لے آیا جہاں بت نصب تھی۔“

”صولت مرزا بڑا لالچی آدمی ہے۔ وہ کبھی نہ چاہے گا اس کی دولت کسی دوسرے کے لئے۔“
جیلہ تین لاکھ روپیوں کی بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ وہ میرا بچہ.... میرا بیٹا بھی... مہ
کی ہوس کا شکار ہوا۔“ ارسلانوس کی آواز بھرا گئی اور وہ چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا

وہ بھوت

حمید کو اپنی عقل خبط ہوتی معلوم ہونے لگی۔ وہ تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ شاید ارسلانوس دو ہاتھ بھی کرنے پڑیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ وہ کسی بوڑھی بھیڑ کی طرح پھپھسا لگا تھا۔ حمید الجھن میں پڑ گیا کہ وہ اسے کن الفاظ میں تسلیاں دے۔ پاگل آدمی ٹھہرا۔ اگر دلا۔ پر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا تو وہ کیا کرے گا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ خود اسی کو رونے پر مجبور کر دے۔
”لوگ میرے دکھ سے واقف نہیں۔“ ارسلانوس سسکیاں روک کر بولا۔ ”وہ صرف سے ہی نفرت کرنا جانتے ہیں۔ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ میں خود اپنے لئے ہو گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔“

”فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔“ حمید نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”فلسفہ....!“ ارسلانوس ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”کاش فلسفے ہی نے میری زندگی پر ڈالا ہوتا۔“

”پھر کیا بات ہے۔“ حمید اسے گھورتا ہوا بولا۔

”کچھ نہیں....!“ ارسلانوس نے کہا اور جانے کے لئے مڑ گیا۔

دفعۃً کہیں دور ایک ساتھ تین چار فائر ہوئے تو وہ چلتے چلتے رک گیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد پھر فائر ہوئے اور اس کے بعد ہوتے ہی رہے۔

ارسلانوس بے تحاشہ پھانک کی طرف دوڑنے لگا۔ حمید نے آواز دے کر اسے روکنا چاہا۔ بے سود۔ پھر اس کے پیچھے دوڑا لیکن پھانک کے باہر جاتے ہی ارسلانوس اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ مگر جواب نہ دار۔ فائر کی آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔

حمید بھاگ کر اندر آیا۔ صولت مرزا اور اس کے کچھ نوکر پھانک کی طرف آرہے تھے۔
”کہاں گئے تھے آپ....!“ صولت مرزا نے حمید سے پوچھا۔
”ارسلانوس کے پیچھے۔ وہ نہ جانے کیوں فائروں کی آوازوں پر بے تحاشہ دوڑتا ہوا کسی رن نکل گیا۔“

”یہ فائر کہاں اور کیوں ہو رہے ہیں۔“

”میں خود ہی الجھن میں ہوں۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”آپ بیٹھئے۔ میں ابھی.... دیکھ کر تاہوں۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔“ حمید نے کہا اور ان کے ساتھ ہولیا۔

وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ کچھ لوگ انہیں اپنی طرف دوڑ کر آتے دکھائی دیئے۔

”کون ہے۔“ صولت مرزا نے بلند آواز میں پوچھا۔

”ارے.... سرکار....!“ کسی نے کہا اور وہ سب ان کے قریب آگئے اور پھر ان میں سے ایک ہانپتا ہوا بولا۔ ”سرکار گڑھی میں گولیاں چل رہی ہیں۔“
”کون ہے۔“

”نہ جانے سرکار.... بہت سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

”تو تم کہاں جا رہے ہو۔“

”آپ ہی کے پاس سرکار.... تھانیدار صاحب نے بھیجا ہے۔“

”کیوں....؟“

”انہوں نے کہا ہے کہ اپنی سب بندوقیں لے کر یا تو خود آجائے یا بھجوا دیجئے۔“

صولت مرزا نے کچھ نوکر گھر کی طرف دوڑائے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بندوقیں اور میگزین لے کر آگئے۔ پھر انہوں نے یدھ راج گڑھی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک انہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر سکون ہو گیا۔

”لیکن یہ سب یک بیک ہوا کیسے۔“ صولت مرزا نے ایک آدمی سے پوچھا۔

”نہ جانے سرکار! بس اچانک گولی چلی پھر تھانیدار صاحب دو تین سپاہیوں کے ساتھ آگئے۔ لیکن گڑھی میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ تھانے میں اس وقت دو رائفلیں تھیں اس لئے انہوں نے

مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔“

وہ گڑھی کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن فائر کی آوازیں نہیں سنائی دیں۔ مجمع دور کھڑا تھا لوگوں کے پاس لالٹینیں اور پٹر و میکس بھی تھے۔ لیکن شاید گڑھی کے اندر جانے کی ہمت پڑ ہی تھی۔ سب انسپکٹر بھی دو تین سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔

”کہئے صاحب۔“ صولت مرزا نے اسے مخاطب کیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا نواب صاحب۔“ سب انسپکٹر بے چارگی کے ساتھ بولا۔ ”ان کا خیال ہے کہ کچھ آسیب و آسیب۔“

”لاحول ولاقوة....!“ حمید منہ سکوڑ کر بولا۔ ”بچھلی رات والی جنگ کے بعد سے اس خیالات کچھ ڈانواں ڈول سے ہو گئے تھے اور پھر اس وقت اسے مجمع پر کچھ رعب بھی تو ڈالنا تھا۔“

”تو پھر چلئے اندر....!“ صولت مرزا نے کہا۔

”یہ ذرا خطرناک ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”معلوم نہیں وہ کہاں چھپے ہوں۔“

”کون.... آسیب....!“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”یہ فریدی صاحب کے ساتھی تو نہیں۔“ سب انسپکٹر نے صولت مرزا سے پوچھا۔

”ہاں.... لیکن.... تو پھر کیا کیجئے گا۔“

”میرے خیال سے تو اب صبح ہی پر رکھا جائے۔“ سب انسپکٹر بولا۔

”چہ خوب....!“ حمید نے صولت مرزا کے نوکر کے ہاتھ سے رائفل لیتے ہوئے کہا نے میگزین میں کار توں ڈالے اور رائفل اٹھا کر دو تین ہوائی فائر کر دیئے۔

لیکن جواب میں کوئی فائر نہیں ہوا۔ تھوڑی وقفے کے بعد اس نے پھر ایک فائر کیا۔ بدستور خاموشی رہی۔

”آئیے....!“ حمید آگے بڑھتا ہوا بولا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے

میں نارچ۔ اسے بڑھتے دیکھ کر صولت مرزا بھی بڑھا۔ پھر سب انسپکٹر اور صولت م بندوقین دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں۔

وہ سب گڑھی میں داخل ہو گئے۔ نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے وہ چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہاں چاروں طرف ایک اتھاہ سانا پھیلا ہوا تھا۔ صرف چلنے سے پیروں کے

آئی ہوئی روٹیوں کی کڑکڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

کئی جگہ انہیں خون کے بڑے بڑے دھبے دکھائی دیئے۔ انہیں کسی لاش کے ملنے کی بھی توقع تھی۔ لیکن پوری گڑھی کا چکر لگا لینے کے باوجود بھی کوئی لاش نہ ملی۔

تھوڑی دیر بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔ صرف سب انسپکٹر صولت مرزا حید اور چند کانٹیل رہ گئے۔ پھر صولت مرزا بھی جیلہ کی علالت کا عذر کر کے جانے لگا۔ اس پر حید نے اسے الگ لے جا کر کہا۔

”آج رات ان پر اسرار آدمیوں کا خیال رکھئے گا۔ دیکھئے وہ آج آتے ہیں یا نہیں۔“

”تو کیا تم یہیں ٹھہرو گے۔“ صولت مرزا نے پوچھا۔

”جی ہاں....!“

”آخر کیوں؟“

”اپنے لئے خطرے کی بوسنگھ رہا ہوں آج رات کو میں چھت کے نیچے رہنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”فی الحال کچھ نہ بتا سکوں گا۔“

”خیر بھی آج رات تو یوں بھی نیند آجائے گی۔ اچھا تو میں چلا لیکن تمہارے لئے فکر مند ضرور رہوں گا۔“

صولت مرزا کے چلے جانے کے بعد حید پھر سب انسپکٹر کے پاس لوٹ آیا۔

”آپ نہیں گئے۔“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں آپ کے ساتھ رہ کر تفتیش میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”شکریہ شکریہ۔ اگر فریدی صاحب بھی ہوتے تو کتنا اچھا تھا۔ آخر وہ کہاں رہ گئے۔“

”وہ شہر میں ہیں۔“

تھوڑی دیر تک وہ دونوں اس کے متعلق خیال آرائی کرتے رہے پھر سب انسپکٹر نے تفتیش شروع کر دی۔ اس سلسلے میں قصبے کے گھر گھر کی کنڈی کھنکھنائی گئی۔ راگیروں کو روک کر ان سے سوالات کئے گئے۔ دو ایک چھوٹے زمیندار جو سب انسپکٹر سے پر خاش رکھتے تھے حوالات پہنچائے گئے۔

حید نے جب بھی اعتراض کا منہ کھولا تو اسے یہی جواب ملا۔ ”آپ ان حرام زادوں کو نہیں

جانتے۔ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتے ہیں۔“

تقریباً تین بجے اس چرنے سے نجات ملی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ بقیہ رات تھانے ہی میں بسر کرے لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دینا پڑا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اب صبح تک ان بے گناہ گرفتار شدگان کا کچھ مر نکال دیا جائے گا۔ اگر وہ وہاں رہا تو اس زیادتی کو برداشت نہ کر سکے گا۔ ناچار وہ صولت مرزا کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ حقیقتاً وہ اس وقت وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ ارسلانوس کے جیلے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

بے خیالی میں وہ سامنے والے پھانک سے جانے کے بجائے عقبی پارک کی طرف مڑ گیا۔ اصطبل کے قریب پہنچ کر وہ ٹھنک گیا۔ جلے ہوئے اصطبل کے طے پر ایک آدمی جھکا ہوا نظر آیا۔ اس نے انہیں آدمیوں کا سابقہ رومن لباس پہن رکھا تھا جنہیں حمید بھوت سمجھا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی اور چہرہ کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہو رہا تھا۔ حمید ذہن پر زور دینے لگا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ ان پانچوں کے چہرے تو اسے اچھی طرح یاد تھے۔ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ دفعتاً حمید چونک پڑا۔ اس کی صورت تو اس بات سے ملتی جلتی تھی جسے جیل زفوس کہہ کر مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو کیا؟ وہ حقیقتاً بھوت ہے۔ حمید کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہندی کی باڑھ میں چھپ گیا۔ وہ پراسرار آدمی اپنے نیزے سے ایک جگہ اصطبل کا ملبہ ہٹا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حمید نے محسوس کیا کہ وہ ملے کے ڈھیر سے اتر کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حمید کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا لیکن پھر اس کے جسم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ریوالبور تو اس کے سوٹ کیس میں بند تھا۔

”میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔“ وہ مہندی کی باڑھ کے قریب آکر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”چپ چاپ کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ یہ نیزہ تمہاری ہڈیوں میں اترتا چلا جائے گا۔“

حمید کھڑا ہو گیا لیکن اس کے سارے جسم میں کپکپی طاری تھی۔

”میں تمہیں شہید کر کے بھوت بنانا چاہتا ہوں۔“ اس نے سفاکانہ انداز میں کہا۔

حمید خاموش رہا۔ پھر وہ پراسرار آدمی بے اختیار ہنس پڑا اور ساتھ ہی حمید اسے کہہ کر:

اچھلا ہے تو ایک ہی جست میں مہندی کی باڑھ پار کر گیا۔ ہنسی کا انداز فریدی کا سا تھا۔

”خدا کی قسم اسی بل بوتے پر سرخ رسانی کا دعویٰ رکھتے ہو۔“

”مگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو۔“ حمید نے مجبور کر کہا۔

”تو میں کسی کنوارے گڈے سے تمہاری شادی کر دیتا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”میرے یار تو کچھ لوٹیلوں سے بھی بدتر ہیں۔“

دفعتاً فریدی کے چہرے پر پھیلی ہوئی زرد روشنی غائب ہو گئی۔

”یہ کس طرح ہوا۔“ حمید بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”نہایت آسانی سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میرے سر پر رکھے ہوئے خود میں اندر کی طرف نئے تھے تین بلب لگے ہوئے ہیں جن کا تعلق میری جیب میں رکھی ہوئی ایک معمولی سی بیٹری سے ہے جب چاہتا ہوں انہیں جلادیتا ہوں اور جب چاہتا ہوں بجھا دیتا ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔ ”لیکن آپ نے اتنی جلدی یہ سامان کہاں سے مہیا کر لیا۔“

”سب ڈاکٹر بھٹناگر کی عنایت ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”آؤ آؤ اور.... جھاڑیوں کی اوٹ میں آجاؤ۔“

”کل رات کہاں رہ گئے تھے۔“ حمید نے پوچھا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”تم شاید سمجھے ہو گے کہ مجھے پکڑ لیا گیا۔“ اس نے کہا۔ ”بات یہ نہیں تھی۔ اس وقت کی ہال بڑی کار آمد ثابت ہوئی۔ وہ اند میرے میں یہی سمجھے کہ میں بھی اسی ٹیکسی پر بیٹھ کر نکل گیا ہوں۔ اس طرح مجھے ڈاکٹر بھٹناگر کے مکان میں گھسنے کا موقع مل گیا۔ وہ لوگ تو بے چارے رات بھر مجھے تلاش کرتے رہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے مکان کی تلاشی لینے پر مجھے خود بھی یقین ہو گیا کہ اس کے متعلق میرا اندازہ قطعی درست تھا۔ وہ پانچوں پراسرار آدمی اسی کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لباس جو میں نے پہن رکھا ہے اسی کے گھر سے چرا کر لایا ہوں۔“

”لیکن وہ پانچوں تو کل رات کو یہاں اسی لباس میں موجود تھے۔“ حمید نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ بھٹناگر کے یہاں صرف پانچ آدمیوں کے لئے لباس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہاں کئی جوڑے در دیاں اور ہیں۔ ہاں تو وہ کل رات کو نقارہ یہاں سے نکال لے گئے۔“

”یعنی اصطبل سے.....؟“ حمید نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا۔

”ہاں.... اپنی عقلوں پر تو پتھر پڑ گئے تھے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنی حماقت بھی زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ وہ نقارہ دراصل یہاں گھوڑوں کے دانہ کھانے کے ہودے کی طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ خود صولت مرزا بھی اس کی حقیقت یا اہمیت سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اسے کھود کر نکال لے گئے اور ساتھ ہی وہ اصطبل میں آگ بھی لگا گئے۔“

”آخر تھا کیا اس نقارے میں....!“

”اس راستے کا نقشہ جو ہمیں تخت عقرب تک لے جاتا۔“

”یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا۔“

”قیاس....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”آج وہ یدھ راج گڑھی میں راستہ تلاش کر رہے تھے۔“

”تو کیا وہ ساری اودھم....!“

”میں نے ہی چائی تھی۔“ فریدی نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ”ان کے کئی آدمی ہلاک

زخمی ہوئے ہیں۔“

”مگر لاشیں....!“

”وہ اٹھالے گئے ہوں گے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو ان کا راز ظاہر ہو جاتا۔“

حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

”آخر انہوں نے نقارے کی تلاش کے لئے یہ سوانگ کیوں بھرا تھا۔“

”یہ ان کی زبردست چال تھی۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”اس معاملے میں ڈاکٹر

بھٹناگر کی ذہانت کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ یدھ راج گڑھی کی کھدائی کے دوران میں صولت

ہی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ غالباً وہ جیلہ کے مرض سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کی نظر خصوصاً اس

پر زیادہ تھی کہ جیلہ دورے کی حالت میں قدیم روم اور یونان کی باتیں کیا کرتی ہے خود کو قدیم

مصر کی باشندہ سمجھتی ہے۔ لہذا اس نے اسی حوالے سے قدیم رومن سپاہیوں کی اختراع کی بنا

دیکھنے والے اسے آسانی سمجھ کر ان سے دور ہی رہیں اور وہ اپنا کام کر گزریں۔“

”اور آپ.... آپ اس لباس میں کیوں آئے۔“

”اپنا بھی وہی مقصد تھا اگر اس لباس میں نہ آتا تو ممکن ہے کہ مجھے گولی ہی ماری جاتی۔“

”کون گولی مارتا۔“

”صولت مرزا....!“

”کیوں؟“

”شاید نیند نے تمہاری سوچنے کی قوت سلب کر لی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ارے میاں.... کل اس کی لڑکی اسی اصطبل میں بُری طرح جل چکی ہے۔ بھلا آج رات کو

اس کے قریب آنے والا زندہ رہ سکتا تھا۔ صولت مرزا نے مجھے اس لباس میں یہاں دیکھا تھا اور

چپ چاپ دم دبا کر بھاگ گیا تھا۔ ممکن ہے وہ اب بھی کسی کھڑکی یا روشندان سے جھانک رہا ہو۔“

حمید فریدی کو اپنی اور ارسلانوس کی گفتگو کے متعلق بتاتا ہوا بولا۔ ”ایک بات سمجھ میں نہیں

آتی کہ ارسلانوس گولیوں کی آوازیں سن کر بے تحاشہ بھاگا کیوں تھا۔“

”وحشت....!“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

”ارسلانوس کی شخصیت بھی کچھ مشتبہ سی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ صولت مرزا کے

بچے کیوں پڑا ہوا ہے۔“

”ایک بہت ہی معمولی وجہ تو اس کا مرحوم بیٹا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”صولت مرزا کی کسی

حرکت کی بناء پر گھل گھل کر مر گیا۔“

”یہ ارسلانوس کا بیان ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن تم اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔“

اس کے لڑکے کی پرورش دراصل صولت مرزا ہی کے یہاں ہوئی تھی۔ ارسلانوس اپنی بیوی کے

مرنے کے بعد سے لڑکے کی طرف سے بھی لاپرواہ ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایک بار سخت بیمار تھا۔ اس

کے سارے جسم پر زخم ہو گئے تھے اور ان میں کیڑے بچ بچا کرتے تھے۔ ارسلانوس نے اسے گھر

سے نکال کر گلی میں ڈلوادیا تھا۔ اگر صولت مرزا نہ ہوتا تو کیڑے اس کی ہڈیاں تک چاٹ جاتے۔“

”بھئی یہاں تو میری عقل ہی خبط ہو گئی ہے۔“ حمید اکتا کر بولا۔

”پہلے کبھی نہیں تھی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ ”ایک

بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ ڈاکٹر بھٹناگر کو اس نقارے کا علم کیونکر ہوا جب کہ خود مرزا بھی

اس کے وجود سے لاعلم تھا۔ اسے یہ کس طرح معلوم ہوا کہ نقارہ صولت ہی کے یہاں کہیں پر

موجود ہے۔“

حمید نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد چونک کر کہنے لگا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“
”کیا....؟“

”جیلہ کو آپ قطعی معصوم قرار دیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ کسی مقصد کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ خود کسی بات سے واقف نہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ بتائیے کہ اس کا فائدہ کونین پرینیدہ راج گڑھی تک کیسے پہنچا۔“

”ہاں یہ سوال بھی غور طلب ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہے جلد ہی سامنے آجائے گا۔“
”تو آپ چلے کہاں؟“ حمید نے کہا۔

”جہاں اب تک تھا.... تمہیں ہدایات ملتی رہیں گی۔ میرے متعلق صولت مرزا کو کچھ نہ بتانا۔“
اور پھر وہ کچھ دور چل کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

خون ریز جنگ

فریدی نے ان پانچ آدمیوں کا بھی راز ظاہر کر دیا۔ غارے کے متعلق بھی اس کا قیاس درست ہو سکتا ہے۔ جیلہ کی ذہنی بیماری بھی حقیقت رکھ سکتی ہے لیکن وہ اس کتے کی آواز کو کس طرح آدمی کا کارنامہ ثابت کر سکے گا۔ جب کہ وہ سینکڑوں سال سے سنی جا رہی ہے۔

صبح سے صولت مرزا سے کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ بچپن کی رات کو بھی اصطبل کے قریب ان میں سے ایک آدمی دکھائی دیا تھا اور اس کی شکل پارک میں نصب شدہ بتوں میں سے ایک سے ملتی جلتی تھی۔ صولت مرزا جیلہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھا۔ جیلہ کی حالت پہلے سے بہتر ضرور تھی لیکن وہ ہر وقت کراہتی اور چیختی رہتی تھی۔ جلنے کے بعد سے وہ اب تک سو نہیں سکی تھی۔ دو ایک بار صرف غشی کے دورے پڑے تھے۔ وہ بھی زیادہ دیر تک کے لئے نہیں۔ جلنے کے بعد سے اب تک اس نے ہزار دو ہزار سال پرانی باتیں نہیں کی تھیں اور وہ ہر ایک کو پہچان بھی رہی تھی۔ بار بار ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ وہ آخر جلی کیسے کہاں اور کب جلی۔

حمید دن بھر اوتھتا رہا۔ دو ایک بار شکیلہ سے بھی مڈ بھڑ ہوئی اور حمید نے اسے مخاطب کرنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ کچھ بولی نہیں یا شاید جیلہ کی وجہ سے اس کی ساری شوخی ختم ہو گئی تھی۔ عقیلہ کے بچے بھی خاموش تھے۔

تقریباً تین بجے شام کو ایک لڑکے نے حمید کو لغافہ دیا جس پر اسی کا نام تحریر تھا۔ حمید نے اس کے ہاتھ پر ایک سکہ رکھ کر اسے رخصت کر دیا۔ یہ خط فریدی کا تھا۔ اس نے شام کو یہ راج گڑھی کے قریب کے جنگل میں بلایا تھا۔ اس کے علاوہ خط میں کچھ اور نہیں تھا۔

حمید ایک نئی الجھن میں پڑ گیا۔ فریدی شاید ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تنہا ہی کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ معاملہ تنہا پنپنے کا نہیں تھا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر بھٹناگر کا گروہ کتنا مضبوط ہو۔ وہ دو آدمی ان کا کیا بگاڑ لیں گے۔ بہر حال اسے جانا ہی تھا۔ سوچتے سوچتے اسے رات والی جنگ کا خیال آ گیا کل تو فریدی بالکل تنہا تھا۔ وہ ان سے اکیلا ہی بھڑ گیا تھا اور اسے یہ دعویٰ بھی تھا کہ اس نے ان میں سے کئی ایک کو ختم کر دیا ہے۔

چھ بجتے ہی وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنا ریوالتور لے لیا تھا اور کافی تعداد میں کارٹوس بھی۔ اسے دیر تک نہیں بھٹکنا پڑا۔ وہ ایک اونچے اور گھنے درخت کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ اسے اوپر سے ہلکی ہلکی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ فریدی کھنی شاخوں سے سر نکالے جھانک رہا تھا۔ اس نے حمید کو اوپر آنے کا اشارہ کیا اور حمید بھٹا کر رہ گیا۔
”اس وقت آپ جیسے بلند مقاموں تک میری رسائی ناممکن ہے۔ میں آپ کے جنگل خانے تک نہیں پہنچ سکتا۔“

”چپ....!“ فریدی ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولا اور پھر اشارے سے اوپر چڑھنے کو کہا۔ مجبوراً حمید نے جوتے اتار کر پتلون کی جب میں ٹھونے اور درخت پر چڑھنے لگا۔ دفعتاً فریدی نے گلے میں لٹکی ہوئی دو ربین آنکھوں سے لگائی اور مغرب کی طرف دیکھنے لگا۔ ہر آہستہ آہستہ سر گھماتا ہوا یہ راج گڑھی کی سمت پلٹا۔ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا پھر دو ربین چھوڑ کر حمید سے مخاطب ہو گیا۔

”وہ آج بھی باز نہیں آئیں گے۔ ڈھائی تین من سونا کم نہیں ہوتا اور پھر اسی کے ساتھ ہی ساتھ قیمتی جواہرات بھی جو اس تخت میں جڑے ہوئے ہیں۔“

”مجھے تو یہ اب بھی بنڈل ہی معلوم ہوتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”خیر..... خیر..... ذرا اسے دیکھو۔“ فریدی نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ابھی تھوڑی بہت روشنی باقی تھی۔ حمید نے کاغذ پر نظریں جمادیں۔ اس پر سرخ روشنائی سے بچھو کا ڈنگ بنا ہوا تھا اور کچھ ہند سے بنے ہوئے تھے۔ کچھ تیروں کے نشانات تھے۔ ڈنگ کے چاروں طرف سمتوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جو دور بین سے بدھ راج گڑھی کا جائزہ لینے میں مشغول ہو گیا تھا۔

”کیا یہ ذراؤ نے خوابوں کا تعویذ ہے۔“ حمید نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں بیٹے۔“ فریدی نے مڑے بغیر جواب دیا۔ ”کیا تمہیں ان مہمل اشعار کا وہ مصرع یاد نہیں رہا۔“

”کون سا.....!“

”نقارے میں ڈنگ لگا ہے۔“

”ہاں تو پھر.....!“

”یہ وہی ڈنگ ہے جو نقارے میں لگا ہوا تھا۔“

”آپ کو ملا کہاں سے۔“

”کیا تم اس کاغذ پر خون بھری انگلیوں کے نشانات نہیں دیکھ رہے ہو۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ کل رات کو انہیں میں سے کسی کے پاس تھا۔“ فریدی نے کہا۔ وہ ابھی تک بدھ راج گڑھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً حمید کی طرف مڑ کر دور بین اس کے ہاتھ میں دیتا ہوا بولا۔

”ذرا دیکھنا تو یہ کون ہے؟“

حمید نے دور بین لے کر آنکھوں سے لگائی۔ بدھ راج گڑھی میں ایک آدمی دکھائی دیا جو ٹوٹی ہوئی دیواروں کی آڑ میں چھپتا پھر رہا تھا۔

”یہ تو ارسلانوس معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”فی الحال ارسلانوس کو بھول جاؤ۔ ان لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔“

آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور جنگل مختلف قسم کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔

”کچھ معلوم ہے کہ وہ ہیں کتنے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس کی پرواہ مت کرو۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہمارے پاس چھ عدد بہترین قسم کے بندوچی ہیں۔“

”ان کے نام سنو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کیپٹن ابراہیم جلیس، میجر شفیق الرحمن، کرنل

نہالال کپور، سارجنٹ میجر شوکت اور انسپکٹر جاوید۔“

”لیکن یہ سب ہیں کہاں۔“

”درختوں پر۔“ فریدی نے کہا۔ ”انہیں آج ہی اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ لیکن حمید کا ذہن ارسلانوس میں الجھا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فریدی نے اسے ٹھوکا دیا۔ حمید چونک کر سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ بدھ راج گڑھی میں کہیں کہیں پر روشنی کے ہلکے ہلکے متحرک دھبے نظر آرہے تھے۔

”لیکن ایک بات تو سنئے۔“ حمید نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ آج یہاں کی پولیس مداخلت کر بیٹھے۔“

”کوئی ہرج نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”میزے پاس ڈاکٹر بھٹناگر کا وارنٹ ہے۔ اس پر ایک قتل کا بھی الزام ہے۔“

”یہ روشنیاں۔“ حمید نے کہا۔

”شاید انہوں نے راستے کی تلاش شروع کر دی ہے۔“ فریدی نے کہا اور ہولے ہولے سیٹی بجانے لگا۔ قریب کے دو تین درختوں پر سرسراہٹ سنائی دی۔

”آؤ اب اتر چلو۔“ فریدی نے کہا۔

حمید نے اترتے ہی ان چھ آدمیوں کو دیکھا۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ وہ فریدی کے گھر سے دوستوں میں سے تھے۔

وہ جھاڑیوں اور نیلیوں کی آڑ لیتے ہوئے بدھ راج گڑھی کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر گڑھی کے قریب پہنچ کر انہوں نے زمین پر لیٹ کر سینوں کے بل ریٹکنا شروع کر دیا۔

گڑھی میں پندرہ بیس آدمی دکھائی دیئے جنہوں نے قدیم رومن سپاہیوں جیسا لباس پہن

رکھا تھا اور ان کے چہروں پر ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں دو تین جھکے ہوئے نارنجی روشنی میں زمین دیکھ رہے تھے۔ فریدی کے ساتھیوں میں سے کسی نے حیرت کا اظہار نہ کیا۔ میر سوچنے لگا کہ شاید فریدی انہیں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہے۔

جھکے ہوئے آدمیوں میں سے ایک سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حمید نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ ڈاکٹر بھٹناگر تھا۔ اس نے جھکے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا اور وہ بھی سیدھے ہو گئے۔ ”کیا یہ لوگ کل اسی لباس میں تھے۔“ حمید نے فریدی سے آہستہ سے پوچھا۔ ”نہیں! آج انہوں نے ضرور نیا ایسا کیا ہے۔ اگر کل گولیاں نہ چلی ہوتیں تو شاید یہ اتنی احتیاط نہ کرتے۔“

”تو اب کیا کہتے ہو۔“ ساتھیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

”ابھی ٹھہرو....!“ فریدی نے کہا۔

بھٹناگر کا ایک ساتھی اپنے آدمیوں سے ہٹ کر ایک منارے کی طرف گیا۔ پھر وہاں سے اگلے پاؤں لوٹ آیا۔ لیکن وہاں سے کسی قدر اہتمام تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قدم کن رہا ہو۔ اتنی دیر میں فریدی اور اس کے ساتھی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی اوٹ میں ریختے ہوئے ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”بچیں قدم یہاں پورے ہوتے ہیں۔“ بھٹناگر کے ساتھی نے کہا۔

بھٹناگر اس کے قریب آ گیا اور جھک کر نارنجی روشنی میں کچھ دیکھنے لگا۔

”مگر یہاں بھی دیبا نشان نہیں دکھائی دیتا۔“ بھٹناگر نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”اگر یہاں کبھی اس قسم کی عمارت تھی تو کم از کم اس کے آثار تو ہونے ہی چاہئے تھے۔“

”کہیں ہم انکو نہیں بن گئے۔“ کسی نے کہا۔

”یقیناً کوئی معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی بلند آواز میں بولا۔ ”خبردار اگر کوئی ہلا تو کھوپڑی اڑی۔“

آٹا فانا ان کے چہروں کی روشنیاں غائب ہو گئیں اور وہ سب پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔ فریدی اور اس کے ساتھی بلندی پر ضرور تھے لیکن اب انہیں وہ لوگ صاف نہیں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے سر ابھارا ہی تھا کہ ایک فائر ہوا۔ مگر نہ جانے وہ کیسے بچ گیا۔

”فائرنگ شروع کر دو۔“ فریدی نے کہا اور ادھر سے بھی گولیاں چلنے لگیں۔ حمید نے بھا

ریو اور نکال لیا تھا۔ دونوں طرف سے بے تحاشہ گولیاں چل رہی تھیں۔ بھٹناگر کی طرف دو تین چھین بھی سنی گئی۔

”یوں نہیں۔“ فریدی بولا۔ ”ایک ایک آدمی دائرے کی شکل میں کھسکتا چلے۔ وہ لوگ ایسے میں اوپر چڑھنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

سب نے آہستہ آہستہ کھسکا شروع کر دیا۔ لیکن ان کے ریو اور برابر آگ اگلنے جا رہے تھے۔ دوسری طرف پھر ایک چیخ سنائی دی۔ گڑھی کے باہر بھی شور سنائی دے رہا تھا اور باہر بھی ایک آدھ فائر سنائی دیے۔ شاید باہر والے حمید کے پچھلی رات کے تجربے کو دہرا رہے تھے۔

ادھر بھٹناگر کی طرف کے ایک آدمی نے اوپر آنے کی کوشش کی اور حمید کے ریو اور نے اسے پھر نیچے پہنچا دیا۔

”فضول ہے ڈاکٹر بھٹناگر۔“ فریدی نے زور سے کہا۔ ”اب بھی بہتر ہے کہ باز آجاؤ۔“

دوسری طرف سے فائر بند ہو گئے اور فریدی کے ساتھیوں نے گولیاں چلانا بند کر دیا۔

”بولو کیا کہتے ہو۔“ فریدی نے پھر آواز دی لیکن جواب نادرہ۔ فریدی نے ایک فائر بھی کیا لیکن اس کا بھی جواب نہیں دیا گیا۔ فریدی نے دو تین فائر اور کئے.... لیکن بے سود۔

آخر انسپکٹر جاوید نے نارنجی روشنی کی نیچے آٹھ زخمی یا مردے دکھائی دیے۔ فریدی تیزی سے نشیب میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے بقیہ لوگ بھی تھے اور پھر کئی نارنجوں کی روشنیاں قرب و جوار میں پھیلنے لگیں۔ لیکن بھٹناگر اور اس کے بقیہ ساتھیوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔

”اچھا میاں جاوید صاحب سیٹی ہوگی تمہارے پاس۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہونی تو چاہئے کیوں کہ اتفاق سے تم اس وقت وردی میں ہو۔“

”کیا کرو گے سیٹی۔“ انسپکٹر جاوید نے جیب سے پولیس کی سیٹی نکالتے ہوئے کہا۔

”عقل کے ناخن لویا۔“ فریدی نے کہا۔ ”مقامی پولیس کے آدمی باہر موجود ہوں گے۔ اگر انہوں نے اندر گھس کر ہم پر بے تحاشہ گولیاں برسائی شروع کر دیں تو کیا کرو گے۔ اچھا چلو.... بھلاؤ خطرے کی سیٹی۔“

انسپکٹر جاوید نے خطرے کی سیٹی بجائی۔ باہر سے جواب آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد بھاری بھر کم جوتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ فریدی نے نارنج سے اشارہ کیا اور مقامی پولیس کے

جوان دوڑ کر ان کی طرف آئے۔ وہ سب مسلح تھے۔ شاید آج احتیاطاً دوسرے تھانے سے بھی کچھ سپاہی بلوائے گئے تھے۔

”ارے آپ....؟“ سب انسپکٹر فریدی کو دیکھ کر چیخا اور پھر متحیرانہ انداز میں زمین پر پڑے ہوئے آدمیوں کو دیکھنے لگا۔

”ہمیں کچھ اور آدمیوں کی تلاش ہے جو اس وقت بھی یہیں کہیں موجود ہیں۔“ فریدی نے کہا۔
”مگر یہ ہیں کون....؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”قاتل.... سازشی اور خطرناک قسم کے مجرم۔ ان کے وارنٹ میرے پاس موجود ہیں۔ انہیں اٹھوا کر لے جائیے۔ ہم دوسروں کی تلاش میں ہیں اور یہ قصبے والوں کی بھیڑ یہاں سے ہٹا دیجئے۔ کوئی گڑھی کے اندر نہ آنے پائے۔“

سب انسپکٹر زمین پر پڑے ہوئے آدمیوں کو اٹھوانے کا انتظام کرنے لگا اور یہ لوگ دوسروں کو ڈھونڈنے میں مشغول ہو گئے۔

تحتِ عقرب

”آخر گئے کہاں۔“ کیپٹن حامد پر تشویش لہجے میں بولا۔ ”اگر اوپر چڑھتے تو صاف دکھائی دے جاتے۔ ایک نے چڑھنے کی کوشش کی تھی ہم میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔“

”اوپر تو نہیں گئے۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔

”تو پھر زمین میں گھس گئے ہوں گے۔“ حمید طنزیہ لہجے میں بولا۔

”تمہارا خیال درست بھی ہو سکتا ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

وہ تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ انہیں گری ہوئی عمارتوں کے بلبے کے درمیان ایک تنگ ساراہ دکھائی دیا جس کے دونوں طرف کے ڈھیر چھ سات فٹ سے کم بلند نہیں تھے۔ وہ اس میں گھس پڑے۔

”غالباً وہ اسی راستے سے فرار ہوئے ہیں۔“ فریدی مایوسانہ انداز میں بولا۔

”ساری محنت برباد ہو گئی۔ بہت زیادہ دور اندیشی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر میں سیٹی وغیرہ

حکم میں نہ پڑا ہوتا تو وہ نکل کر جا نہیں سکتے تھے۔“

”پھر بھی۔“ انسپکٹر جاوید بولا۔ ”وہ بچ کر کہاں جائیں گے۔ میرے خیال سے تو اب تم وہ کام شروع کر دو جس کے لئے در دوسرے مولیٰ ہے۔ فی الحال راستہ صاف ہو گیا ہے۔“

”اس نقشے کی مدد سے تو ہم عمر بھر وہاں نہ پہنچ سکیں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیونکہ شاید ظاہری نشانات مٹ چکے ہیں۔ میں نے اس نقشے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہٹا کر کا سا تھی نینار سے پچیس قدم تک بالکل ٹھیک چلا تھا۔ اس جگہ بچھو کے ڈنگ کی شکل کی کسی غارت کے آثار ضرور ہونے چاہئیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے، وہاں ایک دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ٹھیک اسی جگہ کھدائی کی جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس تحت کو کسی تہہ خانے ہی میں ہونا چاہئے۔“

وہ لوگ ابھی تک اس تنگ راستے میں چل رہے تھے۔ دفعتاً کچھ دور پر انہیں ایک سایہ سا دکھائی دیا اور پھر فوراً ہی غائب ہو گیا۔ ان کی ٹارچوں کی روشنی دور تک پھیلی چلی گئی۔ لیکن پوری رات سنسن پڑی تھی۔ جس جگہ سایہ دکھائی دیا تھا وہاں پہنچ کر فریدی رک گیا۔ اس کی نظریں پاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔ قریب ہی اسے ایک غار دکھائی دیا جس کے دہانے پر جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ فریدی نے جھاڑیوں کو ہاتھ سے ہٹا کر اندر روشنی ڈالی۔ یہ ایک بڑا سا غار تھا جس کا دوسرا سراد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اندر سیلن کی بدبو پھیلی ہوئی تھی.... اور زمین گیلی تھی۔ فریدی اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

”یہاں دیکھو! پیروں کے یہ نشانات بالکل تازہ معلوم ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں ہیں تو....!“ حمید نے کہا۔ ”اور کئی آدمیوں کے معلوم ہوتے ہیں۔“

”تو آؤ.... پھر انتظار کس بات کا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مگر ڈاکٹر بھٹناگر ہاتھ آگیا تو لگن ہے کہ ہم وہ راستہ بھی پا جائیں ورنہ ویسے تو کوئی امید نہیں ہے۔“

وہ سب غار میں اتر گئے۔ فریدی آگے آگے چل رہا تھا۔ کچھ دور تک زمین بالکل بیگنی ہوئی تھی۔ اندر گھستے ہی ان پر پتھروں نے یلغار کر دی تھی۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کئی ایک اس کی ناک کے راستے پیٹ میں بھی اتر گئے ہوں۔ اتنے پتھروں کی جھنناہٹ اس کے دماغ کی چولیس ہلائے دے رہی تھیں۔ وہ اپنے منہ پر تھپڑ لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے غار تنگ ہوتا گیا اور پھر کچھ اور آگے چل کر صرف اتنا بڑا

سورخ رہ گیا جس سے صرف ایک آدمی لیٹ کر گزر سکتا تھا۔ فریدی نے جبک کر اس میں نارنج کی روشنی ڈالی اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

”تم سب ایک بار اس کی زیارت کر لو۔“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

سب سے پہلے حمید جھکا اور وہ بھی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جواب طلب انداز میں فریدی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ باری باری سب نے دیکھا اور بت بن کر رہ گئے۔

”کیا خیال ہے؟“ فریدی پھر بولا۔

”تو کیا وہ دروازہ....!“ حمید اس سے آگے نہ کہہ سکا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی انہیں تنہا عقرب مل ہی جائے گا۔ اس نے اس سورخ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک دروازہ دیکھا تھا۔

”دیکھو.... دیکھو۔“ فریدی سورخ پر جھٹکا ہوا بولا۔ ”یہ سورخ بھی قدرتی نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے گرد جی ہوئی کائی یہ بتاتی تھی کہ یہ سورخ خاص طور پر بنایا گیا ہے اور پھر یہاں کائی کا کیا کام۔ جب کہ یہاں پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچ پاتی ہوگی۔ ذرا یہ قرب وجوار کی زمین دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کبھی پانی پڑا ہی نہیں۔ پھر یہاں اس دہانے میں کائی کہاں سے آئی۔ اس کا تو یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اس کی سیڑھائی کی جاتی ہے۔“

”ممکن ہے اوپر کا پانی رس رس کر یہاں تک پہنچتا ہو۔“ حمید نے کہا۔

”اگر یہ بات ہوتی تو ہمارے اوپر کا حصہ بھی نم ہوتا۔ لیکن وہ بالکل ہی خشک پڑا ہے۔ خیر تو اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید بے مبری سے بولا۔

”میں ہی شروعات کرتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر لیٹ کر سورخ کے اندر رینگ گیا۔ یکے بعد دیگرے دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔

”اوہو....!“ فریدی ایک پتھر کے ٹکڑے پر جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اسے سورخ پر رکھ دیا۔ بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کسی چیز پر ڈھکن لگا دیا گیا ہو۔ اس نے اسے پھر ہٹا لیا۔

”یہ دیکھو اس میں بھی ایک طرف ویسی ہی کائی لگی ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ جگہ اس سورخ کا ڈھکن ہے۔ اگر اسے اس میں لگا دیا جائے تو دوسری طرف سے راستہ قطعی مسدود

معلوم ہوگا۔“ بھی داود دینی پڑتی ہے اس کا نگہ مری کی۔“

وہ بولتے بولتے خود بخود چوک پڑا اور پھر کہنے لگا۔ ”تو کیا بھٹا کر سے بھی پہلے کوئی اس تہ مانے پر قبضہ کر چکا ہے۔“

”اسے چھوڑو.... اب یہ بتاؤ کہ کیا کیا جائے؟“ انسپکٹر جاوید نے کہا۔

فریدی پتھر کو چھوڑ کر دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی درازوں سے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ فریدی آگے بڑھ کر درازوں سے جھانکنے لگا اور پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ آیا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”میں تم لوگوں کو ہر گز اندر نہ جھانکنے دوں گا۔ ورنہ تم لوگ بھاگ نکلو گے۔“

”کیوں؟ کیوں؟“ سب لوگ آگے بڑھے۔

”نہیں ابھی ٹھہرو۔“ فریدی نے کہا اور دروازے کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ لیکن وہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اس نے کائی زور صرف کیا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

”تڑوانا پڑے گا۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔

حمید مضطربانہ انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے دروازے کی درز سے آنکھ لگادی۔ دوسرے لمے میں وہ چیخ کر فریدی پر آ رہا۔

”کیوں.... بس مر گئے....“ منع کیا تھا۔“ فریدی نے اسے الگ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”بیٹے حمید صاحب یہ وہی باؤلی ہے جس کی مجھے تلاش تھی.... جہاں میں نے چند گھنٹے گزارے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے یہ دروازہ نہیں دکھائی دیا تھا۔ کیا دیکھا؟ میں نے بھی اس وقت کیا دیکھا تھا۔“

کرتل کپور بھی جھپٹ کر دروازے کے قریب آیا۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو حمید کا ہوا تھا۔ ”کیا بات ہے بھی۔“ کیپٹن جلیس نے اپنے کلاک ٹاور جیسے جسم کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں! اور مرمت جاؤ۔“ کرتل کپور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آخر کیوں؟“

”انسانی کھوپڑیاں غلاء میں ناچ رہی ہیں ان میں چراغ چل رہے ہیں۔“

”اے باپ!....!“ کیپٹن ابراہیم جلیس نے بوکھلا کر کہا اور گھبراہٹ میں اونٹ کی طرح

بلبلانے لگا۔

”چھوڑا....!“ شفیق الرحمن نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”روشن دماغوں کی کھوپڑیا ہوں گی۔“

باری باری سب نے اندر جھانکا اور سب کے چہروں پر ہواٹیاں اڑنے لگیں۔ خصوصاً ابراہیم جلیس کی بلبلاہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔

”یار جلیس....!“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم ایک بار نارزن سے لڑ جاؤ۔ تمہاری ساری کلیدی خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بلبلاہٹ بدستور جاری رہی۔

”اس دروازے کو توڑنا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

”تت.... توڑنا.... کیا کہہ رہے ہیں.... حضرت....!“ جلیس نے کانپتے ہوئے کہا۔

”یار میں تمہیں بڑا بہادر سمجھتا تھا۔“

فریدی نے بدقت تمام انہیں راضی کیا اور جلیس کے علاوہ وہ سب مل کر زور لگانے لگے دفعتاً اندر کسی وحشی درندے کی غراہٹ سنائی دی اور وہ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

”تم لوگ نہ جانے کس ریگستانی مٹی کے بنے ہو۔“ فریدی نے جھلا کر کہا۔ ”ارے بابا“

سب کے پاس ریواں اور ہیں۔ وہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”ملنگ.... کون؟“ جلیس پھر ہکھلایا۔

”یار تم چپ ہی رہو۔“ فریدی ہونٹ سکڑ کر بولا۔

غراہٹ برابر سنائی دے رہی تھی اور وہ سب بُری طرح کانپ رہے تھے۔

خصوصاً حمید اور جلیس کی توجہ ان ہی نکل رہی تھی۔

”آخر تم اسے کیا سمجھتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”ہممہ.... بھوت....!“ کیپٹن حامد نے کہا۔

”بکواس۔ اگر وہ بھوت ہے تو اندر ہی سے کیوں غرار ہا ہے۔ باہر کیوں نہیں نکلتا۔ اگر وہ“

بھوت ہو تو اب تک تمہاری گروئیں کس طرح سلامت رہیں۔“

”مگر.... مگر....؟“ حمید نے کچھ کہنا شروع کیا۔

”آپ تو براہ کرم خاموش ہی رہئے.... چند کہیں کے۔“

فریدی انہیں بڑی دیر تک سمجھاتا رہا اور پھر کسی نہ کسی طرح انہیں دروازہ توڑنے پر راضی کر لیا۔

بدقت تمام ایک تختہ نکل سکا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ فریدی نے اندر ہاتھ ڈال کر کنڈی گرا دی اور دونوں پٹ کھول دیئے۔ غراہٹ کی آواز اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ فریدی نے اندر داخل ہوتے ہی غلاء میں ناچتی ہوئی کھوپڑیوں پر فائر کئے۔ سب کی سب.... چٹا چٹا ٹوٹ کر بکھر گئیں اور باؤلی میں اندھیرا پھیل گیا۔ سب نے نار چیں روشن کر لیں۔ انہیں آٹھ دس آدمی زمین پر اوندھے پڑے دکھائے دیئے جن کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ یہ ڈاکٹر بھٹناگر کے آدمی تھے اور غالباً وہ بھی انہیں میں رہا ہوگا۔

فریدی نے اس طرف روشنی ڈالی جدھر سے غراہٹ کی آواز آرہی تھی اور حمید بے اختیار چبڑا۔

”ارے یہ تو ارسلانوس ہے۔“

”ہاں ہاں.... میں ہی ہوں۔“ اوپر کے درپچے سے آواز آئی۔ ”اور اب تم لوگ یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔“

فریدی نے قہقہہ لگایا۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک فائر ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے پاس سے نکل گئی۔ اس نے فائر کر دیا۔ پھر باؤلی کی تنگ فضا پر درپے فائر دوں سے گونج اٹھی۔ فریدی آہستہ آہستہ زینوں کی طرف رینگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ اوپر پہنچ گیا۔ ارسلانوس کے ریواں سے نکلے ہوئے شعلوں نے اس کی رہنمائی کی اور اس کے قریب پہنچ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اندھیرے میں دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے زور آزمائی کر رہے تھے۔

”کیا پکڑ لیا۔“ نیچے سے کسی نے پوچھا۔

آواز سن کر فریدی اس طرح چونکا کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ارسلانوس صاف نکل گیا۔ فریدی اندھیرے میں اس کے دوڑنے کی آواز پر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دروازہ بند کیا گیا ہو۔ اتنی دیر میں اس کے ساتھی بھی اوپر آگئے تھے۔ نارنج کی روشنی میں ایک دروازہ دکھائی دیا۔ انہوں نے زور لگا کر اسے کھولنا چاہا مگر ان کی کوشش بے کار

گئی۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔

”بھٹناگر کے ساتھیوں میں سے ایک کی کمر میں کلبھازی لٹکی ہوئی ہے۔“ فریدی نے کہا اور حمید دوڑتا ہوا اپنے چلا گیا۔

پھر چند لمحوں کے بعد وہ دروازہ کلبھازی کی ضربوں سے ٹل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اسے بھی توڑ کر لیا اور ساتھ ہی اندر سے ایک فائر ہوا اور فریدی کا ساتھی چیخ کر پیچھے لڑھک گیا۔ بقیہ لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ فائروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

”ارسلانوس ریوالور پھینک دو۔“ فریدی نے چیخ کر کہا۔

”نہیں.... ہرگز نہیں۔ تخت میرا.... میرا ہے۔ میرے جیتے جی کوئی نہیں لے سکتا۔“

وہ برابر فائر کرتا رہا اور ادھر سے بھی فائر ہوتے رہے۔ دفعتاً اندر چیخ سنائی دی۔

”ہو.... اف.... باخ.... میرا ہے.... یہ میرا ہے.... کوئی نہیں لے سکتا۔“

”باخ.... خاہ.... میرا باخ....!“

اندر سے گولی چلتی بند ہو گئی تھی۔

فریدی نے اندر نارنج کی روشنی ڈالی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تخت عقرب روشنی میں دمک رہا تھا اور اس میں جڑے ہوئے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ارسلانوس نے اسے اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے وہ انتہائی محبت سے کسی بچے کو پید کر رہا ہو اور اس کے خون کی بوندیں تخت سے زمین پر رس رہی تھیں۔

گولی اس کے سینے میں لگی ہوئی تھی۔

”میرا.... ہائے....!“ وہ ایک بار پھر زپا اور زمین فپر آ رہا۔ اس کا منہ پھیل گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے نکل پڑی تھیں۔

دفعتاً فریدی کو اس ساتھی کا خیال آیا جس کے گولی لگی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹا اور گرے ہوئے ساتھی پر جھک پڑا۔ یہ کیپٹن حامد تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی تھی اور وہ بے ہوش تھا۔ فریدی زخم کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ گولی نے صرف گوشت کو چھیدا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جاوید باہر سے مدد لے آیا اور وہ سوراخ کھود کھود کر بڑھایا گیا جس سے وہ اندر آئے تھے۔ بھٹناگر اور اس کے بے ہوش ساتھی وہاں سے اٹھوائے گئے۔ کیپٹن حامد کو بھی

کالا کیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ ارسلانوس کی لاش اٹھوائی گئی۔ نہ جانے کیوں اس کی موت کے بعد حمید کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی موت کا تین دن پہلے وہ کافی عرصے تک نہ بھلا سکے گا۔ اس کے خیال کے مطابق ارسلانوس بڑا آدمی نہیں تھا۔ اسے اس بے پناہ دولت نے پاگل بنا دیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو انہیں اسی رات کو مار ڈالتا جب وہ پہلی بار زمی میں داخل ہوئے تھے۔

فریدی بھی مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نارنج تھی اور وہ اس کی روشنی میں باؤلی کا جائزہ لے رہا تھا۔

”وہ دیکھو....!“ اس نے حمید کو مخاطب کیا۔ ”اوپر باریک باریک تار نظر آرہے ہیں وہ لوہڑیاں انہیں تاروں پر تارچا کرتی تھیں۔ شاید ارسلانوس نے بھولے بھٹکے آدمیوں کو ڈرانے کے لئے یہ سارا انتظام کیا تھا تاکہ یہاں کے آسپی قصبوں کی شہرت ہو اور لوگ ادھر آنا ہی چھوڑ دیں۔“

نابا نہیں بھی وہ اسی لئے یہاں اٹھالایا تھا۔

حمید کچھ نہیں بولا۔ وہ ارسلانوس کی موت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ارسلانوس کی موت جیسے شاید وہ کبھی نہ بھلا سکے۔ اس نے اس سے پہلے بھی سینکڑوں موتیں دیکھی تھیں کئی خود اس کی گولی کا نشانہ بنے تھے لیکن وہ کسی کی موت سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔

پردہ اٹھتا ہے

دوسرے دن دوپہر کو صولت مرزا کی حویلی کے وسیع ہال میں ضلع کے سارے بڑے بڑے کام جمع تھے۔ تخت عقرب درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی متعلق اندازہ لگایا تھا کہ وہ تین چار من سے کسی طرح کم نہ ہو گا اور اس میں لگے ہوئے جواہرات کی قیمت کے متعلق کوئی خیال آرائی بھی نہ کر سکا تھا۔

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ فریدی کی تقریر بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ شروع سے ملکی داستان بیان کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے ایک سوال کیا۔

”کیا ارسلانوس اس تخت پر عرصے سے قابض تھا۔“

اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سب خاموش تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اپنی جیب سے ایک کتاب نکالی۔

”یقیناً وہ اس پر عرصے سے قابض تھا۔“ اس نے کہا۔ ”اس کا ثبوت اس ڈائری سے ملتا ہے یہ ارسلانوس کی ڈائری ہے۔ میں آپ کو اس کے بعض خاص خاص حصے سناتا ہوں۔“

۲۶ مئی ۱۹۲۸ء مجھے حیرت ہے کہ میں آج خوشی سے مر کیوں نہ گیا۔ میں نے تخت عقرب تک کا راستہ پالیا ہے۔ وہ تخت مجھے مل گیا ہے جسے میں جنوں اور پریوں کی کہانی کا کوئی تخت سمجھتا تھا۔ میرے خدا اتنی دولت اب میں بہت بڑا آدمی ہوں۔ ملک کا دولت مند ترین آدمی۔ میں وہ راستہ بند کر دیا ہے جس کے ذریعے سے تخت عقرب تک پہنچا ہوں اور اوپر کے سارے نشانہ بھی مٹا دیئے ہیں۔ ایک دوسرا راستہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

فریدی خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد بولا۔ ”اب اس کے پاگل پن کی وجہ بھی سنئے۔“ لکھتا ہے۔ ”وہ میرے خدا میں کیا کروں۔ اسے کہاں لے جاؤں۔ اس تخت نے میری رائو کی نیند حرام کر دی ہے۔ دن کا سکون چھین لیا ہے۔ میں اسے کیا کروں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ فریدی نے بہت سارے ورق الٹ ڈالنے کے بعد پھر مجمع کی طرف دیکھا اور آہستہ بولا۔ ”اب اس وقت کی تحریریں سنئے۔ جب سے میں اس لئے میں داخل ہوتا ہوں میں تو انہی ہی کہوں گا۔ مجھے مرنے مرنے سے گہری ہمدردی ہے۔۔۔۔۔ سنئے۔“

گئی رات دو آدمی اس شیطانی کتے کو اس منارے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آئی اور ان کی دلیری پر عیش کھش کرتا رہ گیا۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں وہ تخت عقرب کی تلاش میں نہ ہوں۔ اتفاقاً ان پر ایک دیوار آگری اور میں انہیں تہہ خانے میں اٹھا لایا۔ پھر میں نے انہیں ڈرانے کی اسکیم بنائی تاکہ وہ پھر ادھر کا رخ نہ کریں۔ میں نے تین چار انسا کھوپڑیوں کو جو مجھے اسی تہہ خانے میں ملی تھیں پتلے پتلے تاروں پر پھانسا شروع کیا۔ ان میں قد بلند بھی روشن کر دیں۔ ایک آدمی کو ہوش آیا۔ وہ واقعی بہت دلیر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے ذرہ برابر بھی ہراس نہیں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے ریوالبور سے ان کھوپڑیوں پر گولی بھی چلا چاہی۔ میں نے ایک چمکادڑ اس کے ہاتھ پر کھینچ مارا۔ ریوالبور زمین پر گر پڑا۔ جسے میں نے تار سے پھنسا کر اوپر کھینچ لیا۔ لیکن وہ پھر بھی خائف نہ ہوا۔“

”کیا وہ تم تھے؟“ کئی آوازیں آئیں۔

”خدا بہتر جانتا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اب آگے سنئے۔ ارسلانوس نے اس شیطانی چرنے میں نواب صاحب اور ان کی صاحبزادی کو بھی پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے متعلق بھی اس نے تحریر کیا ہے۔“

”لکھتا ہے۔۔۔۔۔! میں نے انسپکٹر فریدی کو بیوقوف بنانے کے لئے ایک دوسری چال چلی ہے۔ خدا کرے وہ دھوکا کھا جائے۔ اگر یہ داؤ اس پر چل گیا تو وہ اسے سو فیصدی آسبیلی معاملہ سمجھ کر اس سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ اس کے لئے میں جیلہ کا فاؤنٹین پن چرا کر بیدہ راج گڑھی کے اسی ڈمپر پر ڈال آیا ہوں جس میں فریدی اور حمید دب گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کم از کم دن میں تو ابھر ضرور ہی آئیں گے۔“

پھر فریدی نے فاؤنٹین کا قصہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی آخری تحریر بھی سن لیجئے۔ لکھا ہے کل رات کو دیر تک بیدہ راج گڑھی میں گولیاں چلتی رہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فریدی وغیرہ کے علاوہ بھی کوئی اور تخت عقرب کے چکر میں ہے۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ کیا اب یہ تخت میرے ہاتھ لے نکل جائے گا۔ کیا وہ اب میرا نہ رہے گا جسے میں نے رات رات بھر جاگ کر حاصل کیا ہے۔ خدا وہ وقت نہ لائے۔ وہ میرے لئے قیامت کی گھڑی ہوگی۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔

”ہم لوگ آپ کے اس کارنامے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔“ کشر نے اٹھ کر کہا۔ ”شکریہ۔“ فریدی جھک کر بولا۔ ”لیکن ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا۔ تخت نشینی ایک ضمنی دریافت تھی۔ میں تو اس کتے کی آواز کا راز جاننے کی فکر میں تھا۔“

”ہمیں آپ کی صلاحیتوں سے امید ہے کہ آپ اس میں بھی کامیاب ہوں گے۔“ کشر نے کہا۔ شام ہوتے ہوتے تخت عقرب ملٹری کے پہرے میں وہاں سے اٹھوا کر ایک فوجی لاری میں رکھ لایا گیا اور اسے سرکاری خزانے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ شاہی نقارہ ڈاکٹر بھٹناگر کے قبضے سے برآمد کیا گیا۔ سچ چچ اس پر بچھو کے ڈنگ کی تصویر کندہ تھی اور اس میں نقشہ بنا ہوا تھا۔

اسی رات کو کھانے کی میز پر فریدی صولت مرزا کو مہمل اشعار کا مطلب سمجھا رہا تھا۔ ”نقارے میں ڈنگ کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے۔ اب آگے چلئے۔ بچھو پر اٹو بیٹھے گا۔ معاف

کچے گا۔ یہ اشارہ مجھے آپ ہی کے خاندان کے افراد کی طرف معلوم ہوتا ہے اور اس کتبے کا تعلق بھی آپ ہی کے کسی بزرگ سے رہا ہوگا۔ جیسی انہوں نے اُلُو کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس کا مطلب ہو کہ یہ راج کے بعد سے ارسلانوس پہلا آومی نہیں تھا جس نے اس تخت کو اپنی ملکیت سمجھا ہو۔ آپ کے خاندان کے بھی کچھ بزرگوں کی رسائی اس تک ہو گئی تھی۔ ورنہ یہ راج کے زمانے میں اُلُو کا کیا تذکرہ اور پھر ان اشعار کی زبان میر و سودا کے زمانے سے بہت پہلے کی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ راج تو.... اکبر کے زمانے میں تھا۔“

فریدی کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”اب صرف دو مسئلے اور رہ گئے ہیں۔ پہلا تو کتبے کی آواز اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر بھٹناگر کو اصطبل میں نقارے کی موجودگی کا علم کیونکر ہوا۔“
”ہوگا بھی.... مارو گولی۔“ صولت مرزا اکتا کر بولا۔ ”کم بختوں نے جیلہ کی تو جان ہی لے لی۔“
”اب کیا حال ہے کچھ بولتی ہے یا نہیں۔“
”صرف دو باتیں کہتی ہے ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کبھی پوچھتی ہے کہ میں کس طرح جلی اور کبھی کہتی ہے کہ میں وہی ڈرامہ ویکٹور میں نے انگلینڈ میں دیکھا تھا۔“
بس یہی دو باتیں۔

”کیسا ڈرامہ....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”ارے بھئی کیا بتاؤں۔ اس کے اس کہنے پر مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید اس پر اسی ڈرامے کے دیکھنے کے بعد دورہ پڑا تھا۔“

”ڈرامے کی نوعیت یاد ہے آپ کو۔“ فریدی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نوعیت کیا؟ نام ہی یاد ہے۔ انٹونی اور قطوپلر ڈرامہ تھا۔“

”مصر قدیم کے افراد....!“ فریدی زیر لب بڑبڑایا۔ پھر صولت مرزا کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تو وہ دورہ کس طرح پڑا تھا۔“

”جیلہ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے ہی سو گئی تھی۔ جب ڈرامہ شروع ہوا تو میں نے اسے جگا دیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد مجھے یہ شک گزرا تھا کہ جیلہ جاگ تو رہی ہے مگر شاید اپنے ہوش میں نہیں ہے۔“

”اوہ.... سو فیصدی یہی بات رہی ہوگی۔“ فریدی نے کہا۔ ”اچھا اس سے پہلے بھی

انہوں نے اس ڈرامے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔“

”میری یادداشت میں تو کبھی نہیں۔“ صولت مرزا بولا۔ ”جب سے جلی ہے تبھی سے رٹ رہی ہے۔“

”ہوں.... اچھا کیا اس ڈرامے میں بھی آگ لگنے کا کوئی منظر تھا۔“

”اب تو اتنا مجھے یاد نہیں۔“

”ضرور رہا ہوگا۔“ فریدی نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ صولت مرزا استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”دیکھئے.... اس قسم کی ذہنی بیماریوں کا سبب معلوم ہو جانے پر مریض خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ جیلہ صاحبہ کو وہ جوشین یاد آگئی ہے جہاں سے ان کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مجھے تو یقین ہے کہ اب ان پر دورے نہ پڑیں گے اور اگر اب بھی دورے پڑتے رہیں تو آپ انہیں ضرور کسی سائیکو اٹھیلیٹ کو دیکھا دیجئے گا۔ مرض کے شروعات کے وقت کی جوشین تو اب آپ کو یاد آئی گئی ہے۔ محض اسی نکتے سے وہ ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے مرض دور کر دے گا۔“

فریدی کی گفتگو سے صولت مرزا کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

دوسرے دن صبح فریدی اور حمیدیدہ راج گڑھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو مزدور بھی تھے۔ فریدی اس منارے کو کھلوانے کا اجازت نامہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ مزدوروں نے ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر دروازے میں چٹی ہوئی اینٹیں الگ کر دیں۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ ابا بیلوں کے بیٹ کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے داخل ہوتے ہی دو تین ہنگاموں میں نکل کر اجالے میں چکرانے لگیں۔ وہ چکر دار زینے طے کرتے ہوئے اوپر جانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں جیج و تاب کھا رہا تھا۔ اس معاملے میں اسے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ انسانی کارنامہ نہیں ہے۔ آخری میٹر ہیوں پر پہنچ کر فریدی روشندان سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے قریب قریب ہر روشندان سے باہر جھانکا اور پھر اچانک ایک روشندان پر اس کی نظر جم گئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ دوسرے روشندانوں سے اس کا موازنہ کر رہا ہو۔

”لاحول ولا قوۃ....!“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ آڈو ایس چلیں۔ اس

وقت تو بس کو فٹ ہو گئی۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی نہ سمجھ میں آنے والا معاملہ ہوگا۔ کیا دھرا ہے

”آخر کیا بات ہے؟“

”بہت سارے کی بات ہے پیارے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مگر ٹھہرو اس طرح شاید تمہاری سوجھ بوجھ میں نہ آئے۔ لہذا کسی مزدور سے ایک آدھ بالٹی... پانی منگو لو۔“

”کیا مطلب....!“

”او حید کے بچے کبھی کبھی مطلب پوچھے بغیر بھی کوئی کام کر ڈالا کرو۔“

حمید نیچے اترنے لگا۔ اس وقت پھر بارش کے آثار معلوم ہو رہے تھے۔ مغرب سے سیاہ اور بوجھل کھٹائیں اٹھ رہی تھیں۔ ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔ حمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے منارہ مل رہا ہو۔ نیچے صولت مرزا اور اس کے دوست بھی کھڑے ہوئے تھے۔

”کیوں بھی کیا رہا۔“ صولت مرزا نے پوچھا۔

”فی الحال ایک بالٹی پانی ہونا چاہیے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”پانی.... پانی کیا ہوگا۔“

”کتنا پیاسا ہے۔“

”کتا....!“

”جی ہاں اوپر تشریف لے جائیے۔“

صولت مرزا کے ساتھ اس کا ایک نوکر بھی تھا جو اس کے اشارے پر پانی لینے کے لئے چلا گیا اور وہ لوگ منارے پر چڑھنے لگے۔ فریدی دیوار سے ٹکا ہوا سگاری پی رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”آخر تم نہ مانے۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”بھلا مانتا کیسے، جب کہ یہ ساری مشقت میں نے اسی لئے برداشت کی تھی۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔“

”کیوں؟ مایوسی کیوں؟“

”اس لئے کہ ایک بہت ذرا سی بات سینکڑوں برس سے لوگوں کے خوف کا باعث بنی ہوئی ہے۔“

”آخر کیا....؟“

”ذرا پانی آجانے دیجئے۔“

تھوڑی دیر بعد پانی آگیا اور فریدی نے روشندان پر چھینٹے دینے شروع کر دیئے۔

”یہ بھی ٹھیک نہیں۔“ فریدی نے کہا اور بالٹی روشندان کے اوپر بنی ہوئی ایک کارنس پر ماری اور پھر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے بھگو کر اس کا ایک سر بالٹی میں ڈال دیا۔ دوسرا روشندان پر لٹکا دیا۔ اس سے روشندان پر پانی ٹپکنے لگا۔

”ابھی کافی دیر لگے گی۔“ فریدی نے کہا۔ ”آئیے میں آپ کو وہ باؤلی دکھاؤں جہاں تخت قریب رکھا ہوا تھا۔“

حمید کو اس نے وہیں روک کر روشندان کو تر کرتے رہنے کے لئے کہا اور مرزا وغیرہ کو لے کر نیچے اتر گیا۔

وہ تقریباً تین چار گھنٹے تک باؤلی میں رہے۔ انہوں نے وہ راستہ تلاش کر لیا جسے ارسلانوس نے بند کر دیا تھا۔

جب وہ گڑھی سے نکل رہے تھے تو انہوں نے کتے کے رونے کی آواز سنی۔ فریدی بے اختیار ہنسنے لگا۔ لیکن دوسرے لوگ بدحواس ہو گئے۔

”گھبراہٹ نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں نے اس بھوت کو بھی پکڑ لیا ہے۔ آئیے میرے ساتھ۔“

مینار کے قریب پہنچ کر فریدی نے دیکھا کہ حمید مینار سے بہت دور کھڑا طرح طرح کے منہ بنا رہا ہے۔

کتارہ رہ کر رو رہا تھا۔

”کیوں حمید کیا بات ہے۔“ فریدی نے ہنس کر پوچھا۔

”کیا شیطان کے کان بہرے ہو گئے ہیں۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”خیر.... خیر.... آؤ میرے ساتھ....“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

تقریباً سب ہی اوپر جاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ بدقت تمام وہ انہیں اوپر لے گیا۔ بالائی منزل بالکل خالی تھی۔ لیکن کتے کے رونے کی آواز بدستور جاری تھی اور یہاں یہ اتنی تیز تھی کہ ان کے کان پھٹے جا رہے تھے۔

”یہاں ادھر روشندان میں دیکھئے“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”یہاں اس لکڑی کے فریم کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر بھی روشندان بنایا جاسکتا تھا اور پھر دیکھئے کہ اس میں سوران کی ضرورت تھی۔ روشندان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک دواغ قطر رکھنے والا سوران بنادیا جائے ہاں تو اب دیکھئے لکڑی کے بھگینے کی وجہ سے یہ سوران پہلے سے زیادہ تنگ ہو گیا ہے اور سارے والے بڑے روشندان سے آنے والے ہوا کے جھونکے جب اس سوران سے گزرتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے جب یہ خشک ہو کر کشادہ ہو جاتا ہے تو یہ آواز نہیں پیدا ہوتی۔“

”مگر اس طرح آواز کیسے....!“ ایک صاحب نے کہا۔

”کبھی بانسری بجائی ہے آپ نے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بانسری کی آواز کا دارو مدار بھی سوراخوں پر ہوتا ہے۔ ہاں تو نواب صاحب یہ دراصل ایک اشارہ تھا جسے لوگوں نے آسپی غلط سمجھ لیا۔ یہ اشارہ اس بات کا تھا کہ اب اس قریب کی ندی میں سیلاب آنے والا ہے۔ یعنی اتر بارش جس سے بھیگ کر یہ سوران اس قدر تنگ ہو جائے کہ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔ ندی میں سیلاب کی اطلاع لانے کے لئے یہ آواز کافی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ راج کے زمانے میں لوگ اس سے واقف رہے ہوں گے اور اس کی پہلی آواز پر گاؤں خالی کرنا شروع کر دیتے رہے ہوں گے۔“

سب لوگ پر سکوت انداز میں فریدی کی باتیں سن رہے تھے۔ اس کے خاموش ہو جانے پر کوئی نہ بولا۔

”آج بھی یہ کتا رو رہا ہے۔“ فریدی آنکھ مار کر بولا۔ ”لیکن آج سیلاب نہیں آئے گا۔ دیے گاؤں والوں میں بالکل ضرور پیدا ہو گئی ہوگی اور وہ بھاگ بھی رہے ہوں گے۔“

”بھئی خدا کی قسم! تم سے بڑا بھوت بھی آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔“ صولت مرزا نے مسکرا کر کہا۔

”آئیے اب چلیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ورنہ بے چارے گاؤں والے خواہ مخواہ پریشان ہوں گے؟“

راستے میں فریدی حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”کیوں حمید صاحب کیا خیال ہے۔“

”اب شاید آپ میری منہ سے بھی اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں۔“ حمید منہ سکوڑ کر بولا۔

”مالا کہ نواب صاحب نے بڑے مناسب الفاظ میں آپ کی تعریف کر دی ہے۔“

سب ہنسنے لگے۔ گاؤں میں انتشار پھیل گیا تھا۔ صولت مرزا نے فوراً ہی ندی کے کنارے بے ہوئے لوگوں میں آدمی دوڑا دیئے تھے جو لوگوں کو سب کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب تک کھڑکی بھیگی رہی کتے کے رونے کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

اسی شام کو اطلاع ملی کہ ڈاکٹر بھٹناگر نے نہ جانے کس طرح حوالات میں خودکشی کر لی، اس طرح فریدی اپنے ایک سوال کے جواب سے محروم رہ گیا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر بھٹناگر کو اصطبل میں قمارے کی موجودگی کا علم کیونکر ہوا تھا۔

رات کو کھانے کی میز پر شکیلہ فریدی سے کہہ رہی تھی۔ ”ان واقعات کی رپورٹ کی ایک کاپی اپنے دستخط سمیت مجھے بھی بھجوائے گا۔“

”خدا کے لئے اب آپ اپنی شادی کر لیجئے۔“ حمید نے آہستہ سے فریدی کے کان میں کہا اور فریدی دانت پیس کر رہ گیا۔ اگر صولت مرزا وغیرہ موجود نہ ہوتے تو وہ حمید کی پیٹھ پر ایک زوردار گونہ ضرور رسید کر دیتا۔ بہر حال وہ سب حمید کو استغہامیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور فریدی دل ہی دل میں تاؤ کھا رہا تھا۔“

ختم شد

جاسوسی دنیا نمبر 22

کیچڑ میں پھول

پچھلے پہر کی ٹھہری ہوئی چاندنی جنگل کے سرسبز سینے پر محیط تھی۔ چاروں طرف ایک لافانی سکوت پھیلا ہوا تھا۔ ہولے ہولے چلنے والی خنک ہوا ایسی لگ رہی تھی جیسے سونے ہوئے جنگل کی خواب آور اور بو جھل سانسیں۔ دفعتاً تار جام والی سڑک پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دکھائی دی اور پھر سناٹے میں انجن کی ہلکی آواز انتشار پھیلائے لگی۔ انسپکٹر فریدی کی خوبصورت کیڑی لاک سڑک کے سپاٹ سینے پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس وقت تار جام سے واپس آرہا تھا۔ سرجنٹ حمید اس کے برابر بیٹھا جھکولے کھا رہا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گوشت کا ایک لو تھڑا ہو اور جس کا ایک ہلکی سی جنبش پر بھی ہل جانا یقینی ہو۔ ایک آدھ بار تو اس کا سر اسٹیرنگ سے بھی ٹکرا گیا تھا۔ فریدی اسے بار بار سنبھال لیتا تھا۔

حمید نشے میں تھا۔ اسے بڑی طرح پلا دی گئی تھی۔ اگر فریدی نے موقع پر برقت پہنچ کر مداخلت نہ کی ہوتی تو شاید وہ اسے پلاتے پلاتے مار ہی ڈالتے۔ فریدی نے اسے ایک اہم کام کے سلسلے میں تار جام بھیجا تھا۔ وہاں چند پولیس انسپکٹروں نے تفریحات میں پھانس لیا۔ حمید عادتاً شرابی نہیں تھا لیکن انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اسے مجبوراً اپنی ہی پڑی۔ شروع میں اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک آدھ پیگ سے زیادہ نہ پے گا مگر وہ پھر ایک انارزی کی طرح ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اگر فریدی وہاں نہ پہنچ گیا ہوتا تو معلوم نہیں وہ لوگ مذاق ہی مذاق میں اس کی کیا درگت

خون کا دریا

(مکمل ناول)

بنادیتے۔ اس کا وہاں اس طرح پہنچ جانا محض اتفاق ہی پر مبنی نہ تھا۔ نہ اسے اس معاملے کے متعلق کوئی دوسری خاص بات یاد آتی اور نہ وہ وہاں پہنچتا، بہر حال وہ کسی طرح حمید کو اٹھالایا۔ پہلے اس نے اسے پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ لیکن حمید نشے کی حالت میں اول فول بکتا ہوا اچھل کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

اور جب کیڑی کے انجن سے ہلکی ہلکی آواز نکلنے لگی تو دفعتاً فریدی نے اسے کچے راستے پر موڑ لیا۔ یہ علاقہ اس کا اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ قریب ہی ایک تالاب ہے جہاں کچھ آٹے وہ موٹر کے لئے پانی لے سکے گا۔

کار رک گئی اور حمید ایک جھٹکے کے ساتھ فریدی پر آ رہا۔

”ہیں ہیں ہیں۔“ وہ اس کی گردن سے لپٹا ہوا منمنایا۔

”میری جان۔“

”ادھر ہو۔۔۔!“ فریدی نے اسے دھکا دیا۔

”میں تمہارے لئے سونے کا تاج.... محل.... بنوادوں گا۔“ حمید فریدی کے اوپر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

”مگر میری جان.... پہلے تم مر کر.... بھی تو دکھاؤ۔“

”چپ رہو۔“ فریدی نے اس کی گردن دبوچ کر کہا۔

”مار ڈالو۔“ حمید نے کھکھیا کر کہا۔ ”میرا باپ بھی یتیم تھا.... اور میں بھی لاوارث ہوں۔“

پھر اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گا۔

”دیکھو.... سو.... اب اگر تم نے بکواس کی تو۔“

”ہمیں ڈانٹتی ہیں.... آں!“

”ابے میں عورت ہوں۔“ فریدی نے چیخ کر پوچھا اور حمید کی ناک و بادی۔

”نہیں تم ذیوی ہو۔“ حمید نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں پوجتا ہوں۔ تم فرشتوں سے زیادہ نیکو ہو۔“

فریدی نے پھر اس کی پیٹھ پر ایک دھول جڑی اور پٹرول کے خالی ٹین لے کر نشیب میں اترنے لگا۔

تالاب کے مرقش سینے پر چاند کی کرنیں مچل رہی تھیں۔ فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ اسے

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دودھیا چاندنی اس کی ننداسی آنکھوں کی راہ سے روح کی گہرائیوں میں زنی چلی جا رہی ہو۔ نیند کے مارے دماغ کا سناٹا جنگل کے سکوت سے ہم آہنگ سا ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی مدہوشی اس کے ذہن پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے پٹرول کے دنوں ٹین زمین پر رکھ دیئے اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر سگار سلگانے لگا۔

نیند کی حالت میں بعض اوقات بڑے بڑے عجیب خیالات ذہن کے ڈھکے چھپے گوشوں سے نکلنے میں رینگ آتے ہیں۔ فریدی کا ادھونگتا ہوا دماغ بھی کچھ بے نکل خیالات کی آماج گاہ بن گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جس پتھر پر بیٹھا ہوا ہے وہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ پھٹ بھی سکتا ہے۔ اس خیال سے پٹٹی ہوئی کچھ یادیں بھی شعور کی سطح پر ابھر آئیں۔ ان میں ایک گدے دار

ری بھی تھی جس کے گدے میں ایک نائم بم چھپا دیا گیا تھا اور جس نے ایک آدمی کے پرچے اڑا دیئے تھے۔ اسے دوا کی وہ بوتل یاد آئی جس میں کسی نے پھٹ جانے والا آتش گیر مادہ بھر دیا تھا

یک ایسی ربو کی گڑیا یاد آئی جس میں ایک مہلک دوا بھری ہوئی تھی اور جس نے ایک پورے

ماندان کا صفایا کر دیا تھا۔ اس کا ذہن بھٹک ہی رہا تھا کہ اسے پے در پے ہارن کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سچ حمید پر آج بڑا تاؤ آیا تھا۔ پھر یہ معلوم ہونے پر کہ وہ ایک چکر

میں پھنس کر اپنی یہ حالت بنا بیٹھا تھا۔ اس کا غصہ تو رُخ ہو گیا تھا لیکن ابھی قدرے جھلاہٹ باقی

تھی۔ جواب پھر آہستہ آہستہ غصہ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

وہ پٹرول کے ٹین وہیں چھوڑ کر پھر کار کی طرف لوٹ گیا۔ حمید بے تحاشہ ہارن بجاتا جا رہا تھا۔

”ارے کم بخت کیا اب بیڑی کا بھی صفایا کر دے گا۔“ فریدی اسے جھنجھوڑ کر بولا۔

”ارے تم آگئیں.... میری جان.... یہ اونٹ چلتا کیوں نہیں۔“ حمید نے بچوں کی طرح

لنگھ کر کہا۔

فریدی نے اسے اگلی نشست سے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

”بہت ننگری ہو مری جان۔“ حمید بڑبڑایا۔

”لیکن میں اپنے باپ کی دم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.... تمہارے لئے ہاتھی دانت کا تاج

مگر ضرور بنواؤں گا۔“

فریدی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے حمید کی نائی کھول کر اس کے ہاتھ باندھ دیئے

اور اپنی نائی سے پیر۔

”ارے.... ارے!“ حمید رو ہانسا ہو کر بولا۔ ”یہ اچھی محبت باندھتی ہیں.... آں۔“

”شٹ اپ....!“ فریدی نے کہا اور حمید باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

فریدی نے چاہا کہ اس کا گلابا دے۔

وہ اسے چیختا چلاتا اور بڑبڑاتا چھوڑ کر پھر تالاب کی طرف اتر گیا۔ پٹرول کے خالی ٹین اٹھائے

اور انہیں پانی سے بھرنے لگا۔

دونوں ٹین کا پانی موٹر میں ڈال کر پھر تالاب کی طرف بڑھا۔

اسے آج کے محسوس دن پر بھی غصہ آرہا تھا۔ حمید کی اس حماقت کی بناء پر وہ غصے میں رات کا

کھانا بھی بھول گیا تھا۔ تقریباً نو بجے وہ تار جام پہنچا تھا اور پھر حمید کو ڈھونڈتا ہوا اس ہوٹل کی

طرف جانکا تھا جہاں وہ اور اس کے دوست رنگ رلیاں منارہے تھے۔ پھر وہ حمید کو کار پر لاد کر

فوراً ہی وہاں سے چل پڑا تھا۔

اس نے بھرتے ہوئے ٹین زمین پر رکھ دیئے اور سیدھا کھڑا ہو کر سگار سلگانے لگا۔ نہ جانے

کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر اور ٹھہرے۔ اس نیند کے باوجود بھی وہ وہاں ٹھہرنا چاہتا

تھا جو فرصت کے لمحات میں اسے سب سے زیادہ عزیز ہوا کرتی تھی۔ اس کی نظریں تالاب کی

چمکدار سطح سے چلتی ہوئی افق میں جا ڈوبیں۔ جہاں دو سیاہ ٹکڑے ابھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد

چونک کر اس نے ٹین اٹھائے اور چلنے کیلئے مڑا ہی تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر دائی طرف کی جھاڑیوں

میں سرسراہٹ سنائی دی۔ اگر ساتھ ہی اسے ایک سایہ بھی نہ دکھائی دیا ہو تا تو شاید وہ اسے کوئی

اہمیت دیئے بغیر آگے بڑھ جاتا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس نے ٹین پھرتی سے زمین پر رکھ دیئے

اور اچھل کر ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ ہر وہ جرائم پیشہ جس کا اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اس کا

دشمن تھا لہذا ایسے موقع پر اس کا ہوشیار ہو کر احتیاطی تدابیر اختیار کرنا غیر ضروری نہیں تھا۔

وہ کئی سیکنڈ تک پتھر کی اوٹ سے جھانکتا رہا۔ لیکن پھر کوئی دکھائی نہ دیا۔

البتہ جھاڑیاں مل رہی تھیں۔ وہ عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دوسرا قدم اس کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا۔ اس کا نیند کے بوجھ سے دبا ہوا ذہن پہلے کی نسبت کچھ صاف ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی

جسم پر کسل مندی طاری تھی۔ بہر حال یہ غلامت بھی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خائف نہیں

ہو۔ ورنہ خوف کی حالت میں تو جسم میں غیر معمولی طور پر پھرتی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ذہن کی

دسترس سے نکل کر اضطرابی افعال کا شکار ہونے لگتا تھا۔

دفعۃً اسے حمید کا خیال آیا جسے وہ باندھ کر نشے کی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اگر واقعی دشمن

گھات میں تھا تو حمید کے لئے بھی وہ اتنا ہی مہلک ثابت ہو سکتا تھا جتنا کہ خود اس کے لئے۔

وہ پتھر کی اوٹ سے نکل کر آہستہ ریٹکتا ہوا اوپر کی طرف بڑھنے لگا۔ پورے ڈھلان میں لمبی

لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے حرکت کرنے سے جھاڑیاں مل

رہی ہیں لیکن وہ اس وقت اور زیادہ احتیاط برت کر حمید کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

اس دوران میں اس نے سوچا کہ ممکن ہے وہ کوئی جانور رہا ہو۔ لیکن اسے اپنی آنکھوں پر شبہ نہیں

ہو سکتا تھا۔ سایہ کسی آدمی کا ہی دکھائی دیا تھا۔ جھاڑیوں سے نکل کر وہ تیزی سے کار کے قریب

آیا۔ حمید پچھلی سیٹ پر لیٹا گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بدستور بندھے ہوئے

تھے البتہ لباس کی بے قاعدگی سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے سو جانے سے قبل بھی ہاتھ پیر

کھولنے کی جدوجہد کی ہے۔

فریدی پر خیال انداز میں اس ڈھلان کی طرف دیکھنے لگا جدھر سے یہاں تک پہنچا تھا۔

دفعۃً اسے ایک چیخ سنائی دی۔ کسی عودت کی چیخ جو تالاب کی طرف سے آئی تھی۔ پھر

دوسری چیخ سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پانی پر ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

فریدی تیزی سے ڈھلان کی طرف اترنے لگا۔ اس وقت اس کے دل سے کسی قسم کی سازش

کا خیال قطعی نکل گیا تھا۔ چیخ پھر سنائی دی اور تالاب کی سطح پر دو ہاتھ نظر آئے، جو بے بسی کے

عالم میں ادھر ادھر جھول رہے تھے۔ فریدی نے کوٹ اتار کر الگ پھینکا اور جوتے پہنے ہی تالاب

میں پھلانگ لگا دی۔

ڈوبنے والے نے اس کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔ فریدی نے کوئی مزاحمت نہ کی

کیونکہ اس نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تالاب کی گہرائی زیادہ نہیں اور جب وہ ڈوبنے والے کی

مست سیدھا کھڑا ہوا تو پانی اس کی گردن تک تھا۔ وہ آہستہ آہستہ باہر آیا۔

کوئی عورت اس کی گردن سے بُری طرح چٹھی ہوئی تھی اور اسی حالت میں بے ہوش ہو گئی

تھی۔ فریدی نے بدقت تمام اسے اپنے جسم سے الگ کر کے زمین پر لٹا دیا۔ اس کے کپڑے کچھڑ

نہ جانے وہ کون تھی، کہاں کی تھی اور اس گندے تالاب میں کن حالات کے تحت پہنچی اور یہ عجیب اتفاق تھا۔ اگر کار کا پانی کم نہ ہوتا تو تالاب کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آتا اور وہ بکر مر جاتی۔

”سوچنے لگا.... ممکن ہے خود کشی کی نیت رہی ہو۔ لیکن آخر خود کشی کے لئے اس نے تالاب کو کیوں منتخب کیا۔ دفعتاً اس کا خیال پھر دلدلی خطے اور اس کے نشانات کی طرف لہو گیا۔ اگر خود کشی ہی کرنی تھی تو وہ سب سے پہلے دلدل میں کیوں کودی۔ براہ راست اب ہی تک کیوں نہیں چلی گئی۔ دلدل کے نشانات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پہلے دلدل میں لی اور پھر ریختی ہوئی تالاب میں جا پڑی اور پھر اس دوسری کار کے نشانات.... تو کیا کسی نے اس کار سے نیچے پھینک دیا۔ فریدی راستے بھواس گتھی میں الجھا رہا۔

حمید کبھی کبھار چونک کر ادل فول بکنے لگتا تھا۔

دوسری صبح حمید کے لئے بڑی تیر خیز تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ یہ بات تو اسے یاد ہی نہیں رہی تھی کہ وہ گھرنیک پہنچا کس طرح تھا۔ البتہ پہلے کے واقعات کے ذہن پر ابھرے آرہے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فریدی کا سامنا کس طرح کرے گا۔

وہ اٹھ کر برآمدے میں آیا۔ غسل خانے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اسے فریدی کی آواز لادی، جو کسی نوکر کو سمجھاتا ہوا دھر آ رہا تھا۔

حمید بے اختیار ادپری منزل کے زینوں پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک کمرے کے قریب سے رستے وقت اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اچانک ٹھک گیا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے راکر اس جگہ پہنچیں جہاں ایک خوبصورت لڑکی ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں لپٹی ہوئی سو رہی تھی۔ وہ بے اختیار بچوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا اور چند لمحوں تک اس سوئی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

اب وہ بڑے اطمینان سے زینے طے کرتا ہوا اتر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ فریدی اس کے سامنے کھڑا ہے لیکن وہ مخاطب ہوئے بغیر غسل خانے کی طرف جانے لگا۔

”ظہریئے نواب صاحب۔“ فریدی نے آواز دی۔

سے لت پت ہو گئے تھے۔ فریدی نے سب سے پہلے اس کے پیٹ میں پانی نکالنے کی تدبیریں اختیار کیں۔ پھر سگار جلا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

یہ کوئی غیر ملکی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کی رنگت انگریز یا فرانسیسی عورتوں کی طرح صاف نہیں تھی۔ گورے رنگ میں کچھ کچھ سنہرا پن تھا۔ بالوں کی رنگت کے متعلق اندازہ لگا دینا دشوار تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اخروٹ جیسی رنگت کے رہے ہوں۔ اس نے ایک ریشمی اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کچھڑ میں آلودہ ہونے کی بناء پر اس کے جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ فریدی نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی اب خطرے میں نہیں ہے لہذا وہ اسے وہیں چھوڑ کر ان جھاڑیوں کی طرف متوجہ ہو گیا جن میں اسے سایہ دکھائی دیا تھا۔ یہ جھاڑیاں موٹے موٹے تنکوں کی شکل میں کھڑی ہوئی تھیں۔ فریدی کو اس قسم کی وہ جھاڑیاں یاد آ گئیں تھیں جو اس نے اکثر دلدلی خطوں میں دیکھی تھیں۔ اس کا خیال بالکل صحیح نکلا۔ یہاں بھی دلدل ہی تھا اور اس کا سلسلہ براہ راست تالاب سے جا ملتا تھا۔ یہاں سے اسے وہ کچی سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کر رکھی تھی۔ دلدل میں ایسے کچھ نشانات تھے۔

فریدی نے پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ کچھ سوچتا رہا پھر لڑکی کو اٹھا کر کار تک لایا اور اسے اگلی نشست پر ڈال کر دوبارہ تالاب کی طرف لوٹ گیا۔

کار میں پانی ڈال دینے کے بعد اس نے ٹارچ نکالی اور اپنی کار کے آگے کی زمین پر دیکھنے لگا۔ کسی دوسری کار کے پٹیوں کے تازہ نشانات پر ٹارچ کی روشنی دائرہ بنا رہی تھی۔ فریدی پر اطمینان انداز میں سر ہلا کر پیچھے کی طرف لوٹ پڑا۔ اب وہ اس جگہ کھڑا تھا جہاں سے دلدل کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ دیکھتا رہا اور پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔ حمید کے ہاتھ پیر کھول کر اسے پھر اگلی نشست پر لے آیا۔

اور بے ہوش لڑکی کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

”ہام.... فح....!“ حمید نے بڑبڑا کر فریدی کا منہ چوم لیا۔

فریدی نے اس کے سر پر ایک ہاتھ رسید کر کے کار اشارت کر دی۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آرہی تھی۔

حمید رک کر ڈرامائی انداز میں اس کی طرف مڑا۔
”فرمائیے۔“

”فرمائیے کے بچے! تمہاری رات کی حرکت۔“
”اوہو....!“ حمید اس کی بات کاٹ کر بولا۔
”بھلا عورت اور شراب میں فرق کیا ہے۔“

”اب یہ بے حیائی.... شرم نہیں آتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”کل رات تم ایک مرے ہوئے
کتے کی طرح اوک رہے تھے۔“

”شرم تو مجھے ابھی کچھ دیر قبل آئی تھی۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔
”میں اوپر سے آ رہا ہوں۔“

”اچھا تو اسی لئے تم اس سینہ زوری پر آمادہ نظر آرہے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا
”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”اجی ہاں.... میں ابھی تک غلط فہمی میں مبتلا تھا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔
”مگر ہے زور آور۔“

”بکومت....!“ فریدی نے بے زاری سے کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ وہ کن حالات میں یہاں
تک پہنچی ہے۔“

”بھلا میں کیا جانوں گا۔“ حمید بے حیائی کی ہنسی ہنستا ہوا آنکھ مار کر بولا۔

ابھی آپ مجھے ایک درد بھری کہانی سنا کر فرمائیں گے کہ اگر میں اسے یہاں نہ آتا تو کیا کرتا
”پھر بکواس۔“

”لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ حمید اس کی بات سنی ان سنی کر۔
”کہ وہ جس ملک سے تعلق رکھتی ہے وہاں نہ تو یتیم پالے جاتے ہیں اور نہ بیوائیں۔“

”میں کہتا ہوں کہ تم نے شراب کیوں پی تھی۔“ فریدی بگڑ کر بولا۔
”میں کہتا ہوں آپ اس گھر میں ایک جوان عورت کو کیوں لائے جہاں مجھ جیسا نیک

شریف بچہ رہتا ہو۔“

”میں چائنا ماروں گا۔“

”حق بات کہنے پر لڈو نہیں ملا کرتے۔“ حمید نے اسی کے لہجے میں نقل اتاری۔
فریدی نے جھلا کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس طرح شور مچانے لگا جیسے وہ سچ مچ اس کی
ن دبا رہا ہو۔



”توبہ کرو کہ اب کبھی اتنی نہیں پیو گے۔“ فریدی نے کہا۔
”تاؤ نہ دلائیے مجھے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔ ”آپ کی اس محبوبہ پر اس سے کچھ رعب نہیں پڑیگا۔“
”پھر وہی.... میں کہتا ہوں آخر۔“
”آخر....“ واکر سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو بتانا پڑے گا وہ کون ہے۔“

”میں خود نہیں جانتا۔“

”بہت اچھے.... بہت اچھے۔“ حمید نے تہقہہ لگایا۔

”دیکھو گدھے میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“ فریدی نے جھلا کر کہا۔

”میرے ٹوٹے ہوئے سر سے بھی یہی صدا آئے گی۔“

”اچھا آؤ.... میرے ساتھ۔“ فریدی نے کہا۔

”مگر ٹھہرو....!“

وہ اسے برآمدے میں چھوڑ کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ پھر واپسی پر حمید نے اس کے ہاتھ
میں چڑے کا ایک کوڑا دیکھا۔

”اگر وہ میرے لئے قطعی اجنبی نکلی۔“ فریدی نے کوڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”تو

میں تمہاری کھال اتار دوں گا۔“

”کسی قسم کی شرط لگانا قریباً ناجائز ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

”چلو....!“ فریدی اس کی گردن دبوچ کر اسے زینوں پر چڑھانے لگا۔

کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ لڑکی بیدار ہو چکی تھی۔ جیسے ہی فریدی دروازہ
کھول کر اندر داخل ہوا وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔

پہلے تو وہ ٹھٹھکی لگائے فریدی کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر جیسے ہی اس کے ہاتھ میں دے
ہوئے کوڑے پر نظر پڑی۔ وہ بے اختیار چیخ مار کر مسہری پر گر پڑی۔

اور فریدی نے محسوس کیا، جیسے یک بیک اس کی خونی پیاس بڑھ گئی ہو۔
”تواٹھاؤ کوڑا۔“

”کہیں یہ پاگل تو نہیں۔“ حمید نے آہستہ سے اردو میں کہا۔
”پتہ نہیں۔“ فریدی نے کہا اور یک بیک اس کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی۔
اس نے لڑکی کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔
”تم خود کشی کی نیت سے بے تاب ہو کر تالاب میں کودی تھیں۔“
”میں نہیں جانتی۔“

”سنو لڑکی! تم اس وقت ایک پولیس آفیسر سے باتیں کر رہی ہو۔“
وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ لیکن اس ہنسی کا زہر یلا پن کسی طرح چھپ نہ سکا۔
فریدی اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔
”تم لوگ کیا کیا نہیں بنے۔“ اس نے مضحل آواز میں کہا۔

”تم اس سے پہلے بھی پولیس آفیسر بن کر میری تنگی پیٹھ پر کوڑے برسا چکے ہو۔“
”کیوں سرکار یہ کیا کہہ رہی ہے۔“ حمید طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”کیا آپ کی کچلی ہوئی جنسیت
نے تسکین کی کوئی نئی راہ نکالی ہے؟“
”کیوں فضول بک رہے ہو۔“ فریدی نے منہ بنا کر کہا اور کوڑا ایک طرف ڈال دیا پھر لڑکی
سے بولا۔

”تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ مگر ٹھہر دو.... ناشتہ یہیں آجائے گا۔“

فریدی نے حمید کو نیچے چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ ساتھ زینوں کی طرف
بڑھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ کسی چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔“ فریدی بولا۔ ”اور کسی طرح وہاں سے
بھاگنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ حمید نے لا پر دہی سے کہا۔

”مجھے اس قسم کے معمولی کام سے کوئی دلچسپی نہیں اور پھر ابھی تک مجھے آپ کی باتوں پر

یقین نہیں آیا ہے۔“

”مارڈالو.... مجھے مارڈالو۔ وہ اپنا منہ چھپا کر انگلش میں بڑبڑانے لگی۔“

”روز روز کی اذیت سے موت بہتر ہے۔“

پھر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے قطرے تیر رہے تھے۔
دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے اختیار رو پڑی اور فریدی و حمید متحیرانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ
رہے تھے۔

”تم لوگ مجھے بالکل پاگل بنا دو گے۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر بولی۔

”مجھے کالے کوسوں لے آئے۔ پھر میری وہ حالت بنائی کہ میں اب خود کو پہچان بھی نہیں
سکتی اور اب مجھ سے کہتے ہو۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے بھی تو بتاؤ۔“

”لڑکی اب تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”تم دونوں پاگل ہو یا پھر میں ہی پاگل ہو گئی ہوں اور مجھے کسی پاگل خانے میں چند پاگلوں کے
ساتھ بند کر دیا گیا ہے۔“

”یہ پاگل خانہ نہیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”بھائی کا دولت خانہ ہے۔“ حمید دانت پر دانت جما کر بولا۔

فریدی نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر اس اجنبی لڑکی کی طرف مخاطب ہو گیا۔

”کل رات ہم تمہیں ایک تالاب سے نکال کر لائے ہیں۔“ فریدی نے اس سے نرم لہجے

میں کہا۔

”تالاب سے۔“ اس نے کہا اور پر خیال انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے سب کچھ یاد ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے پھر کسی طرح مجھے پکڑ لیا ہے اور

اب میرا امتحان لے رہے ہو۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی تم لوگوں کے خلاف نکلا تو تم بے
دردی سے مجھ پر کوڑے برسانا شروع کر دو گے۔“

”یقیناً تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”میں نے تم دونوں کو ان میں کبھی نہیں دیکھا.... لیکن....!“

”کن میں....!“ فریدی بات کاٹ کر بولا۔

”میں عاجز آگئی ہوں، تنگ آگئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔

”کن باتوں پر۔“

”بہی کہ وہ آپ کے لئے قطعی اجنبی ہے۔“

”کیا تم نے اس کی باتیں نہیں سنیں۔“

”کان پھاڑ کر سنی ہیں اور اب اس بات پر عیش عیش کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ نے اسے

بڑی عمدہ ٹریننگ دی ہے۔“

”پھر بکواس شروع کر دی۔“

”نہیں جناب مجھے کیا مطلب! بہر حال میں بھی اب قطعی آزاد ہوں۔“

”یعنی....!“

”اب یہاں میری دوست بھی آیا کریں گی۔“

”ابے تو کیا وہ میری محبوبہ ہے۔“ فریدی جھلا کر بولا۔

”نہیں صاحب وہ آپ کی پیرومرشد ہے اور آپ قوالی کرنے کیلئے اسے یہاں لائے ہیں۔“

”حمید بکواس بند کرو۔“

”فریدی صاحب مجھے حق کی بات کہنے دیجئے۔“

”جنہم میں جاؤ۔“ فریدی نے جھلا کر کہا اور باورچی خانہ کی طرف مڑ گیا۔

حمید چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے اوپری منزل پر جانے کے لئے مڑ گیا۔

وہ بے دھڑک اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ لڑکی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے بیٹھی

تھی۔ حمید اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

”تم بہت حسین ہو۔“

لڑکی سر اٹھا کر حمید کو گھورنے لگی، پھر تیز آواز میں بولی۔

”کیا تمہیں آرتھر کا انجام یاد نہیں؟“

”کون آرتھر....؟“

”وہی جس نے مجھ سے عشق جتانے کی کوشش کی تھی اور تمہارے چیف نے ایک ہی گھونٹے

میں اس کے سر کی ہڈیاں چور کر دی تھیں۔“

”تم میرے چیف کو کب سے جانتی ہو۔“

”سنو! میں فضول بکواس میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ اس نے منہ سکڑ کر کہا۔

”اب میں اس طرح رہوں گی جس طرح رہنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتی

ں کہ یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے اس بلڈاگ کو میرے پاس بھیج دو۔“

”بلڈاگ....!“ حمید نے تحیر آمیز انداز میں دہرایا۔

”ہاں ہاں بلڈاگ....!“ لڑکی چیخ کر بولی۔

”اب میں اس سے ذرہ برابر بھی خائف نہیں ہوں۔ میں اس پر بھی حکومت کروں گی۔ میں

اگلوں کے ساتھ پاگل ہی بن جاؤں گی۔ مجھے یہ کمرہ پسند ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ میرا سارا

سامان آرائش برابر کے کمرے میں سے لے آؤ۔ جلدی کرو۔“

”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔“ حمید بگڑ کر بولا۔

”غلام کے بچے تو کیا ہے، میں اب تمہارے بلڈاگ کو بھی غلام سمجھوں گی، جاتا ہے یا

اٹھاؤں کوڑا۔“

”شٹ اپ....!“ حمید حلق کے بل چیخا۔ وہ غصہ سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ اتنی شدید توہین

برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب فریدی یہ نہیں چاہتا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔

تقریباً دو سال سے دونوں ایک ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ پہلے حمید الگ رہتا تھا لیکن فریدی اس سے

بے تکلف ہو جانے کے بعد اس کا سامان بھی اپنی ہی کونٹھی میں اٹھوا لیا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ

دونوں افسر اور ماتحت کی بجائے بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہتے آئے تھے اور اب حمید سوچ رہا

تھا کہ فریدی نے اسے گھر سے نکال دینے کے لئے یہ جال بچھایا تھا۔ لیکن اسے اس سے زیادہ

کوشش نہیں کرنی پڑے گی، وہ ابھی اور اسی وقت فریدی کا گھر چھوڑ دے گا۔

حمید کچھ نے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

نیچے فریدی نوکر کو ناشتے کے لئے کچھ ہدایت دے رہا تھا۔

حمید اس سے مخاطب ہوئے بغیر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

”ابھی اور اسی وقت“ وہ ایک کرسی پر گر تا ہوا بڑبڑایا۔ لیکن پھر اچانک ایک دوسرا خیال اس

کے ذہن میں پیدا ہوا کہ وہ اپنا سامان لے کر جائے گا کہاں۔ جگہ مل جائے گی؟ مکان آج کل کہاں

ملتے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو وہ سوچنے لگا۔ سامان یہیں پڑا ہے دیا جائے۔

لیکن وہ خود اب اس چھت کے نیچے نہیں رہ سکے گا۔ وہ سوچتا رہا۔ پھر دفعتاً اٹھا..... ہار سے پہلے فریدی سے دو باتیں کرنی چاہتا تھا۔ وہ باہر نکلا۔ فریدی اس کے کمرے ہی کی طرف اُٹھا۔ حمید رک کر اس کی طرف گھورنے لگا۔

”خیریت.....!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”جی ہاں.....!“ حمید ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”ایک نہیں دو..... ڈھائی تین..... ساڑھے تین.....!“

”کیا میں نے کبھی یہ خواہش کی تھی کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔“

فریدی پہلے تو مسکرایا لیکن حمید کے تیور دیکھ کر اسے تھیر آمیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”کیوں؟ یہ بات پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔“

”آپ نے ناحق کیوں اتنی دوسری مول لی ہے۔“ حمید نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرے۔“

صرف یہ کہہ دینا کافی ہوتا کہ اب اپنا کہیں اور انتظام کر لو۔“

”اچھا جی.....!“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”کیا پھر چڑھالی ہے تم نے۔“

”میں اس وقت قطعی سنجیدہ ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”میں آپ کو بہت صاف گو سمجھتا ہوں

میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ میں اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔“

”آخر کیا بک رہے ہو۔“

”میں نہیں جانتا تھا کہ آپ میری ایک ذلیل عورت سے توہین کرائیں گے۔“

”کیا مطلب.....!“

”کچھ نہیں میں جا رہا ہوں اور کوئی مناسب جگہ مل جانے پر اپنا سامان بھی لے جاؤں گا۔“

حمید جانے کے لئے مڑا لیکن فریدی اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”پاگل ہوئے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟“ اس نے حمید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کس نے توہین کی ہے تمہاری۔“

”خدا را اب مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجئے۔“

”عجیب آدمی ہو کچھ بتاؤ بھی تو؟“

”اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“ وہ آگے بڑھنے کے لئے اسے ہٹانے لگا۔

”ابے حمید کے بچے! تمہارا دماغ ٹھنڈا کر دوں گا۔“

حمید کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ قبل اسکے کہ وہ باہر نکلتا فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”شامت آئی ہے تمہاری! کون سوچتا ہے کہ تم یہاں نہ رہو۔“

”مجھے بولنے پر مجبور نہ کیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب افسری اور ماتحتی ہی کا رشتہ بخوبی

نبھ جائے۔“

”اور تم مجھے اس پر مجبور نہ کرو کہ تمہیں اس وقت کے لئے بند کر دوں جب تک کہ تمہارا

دماغ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“

”اس واقعہ کے بعد میں رکی باتوں کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔“ حمید نے کہا۔

”کس واقعہ کے بعد۔“

حمید کوئی جواب دینے کی بجائے فریدی کو گھورنے لگا رہا۔ اسے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ

فریدی اسے نکالنا چاہتا ہے۔ اسے لڑکی کا یہ جملہ کہ میں اب تمہیں غلام سمجھوں گی اس کے کانوں

میں اب بھی گونج رہا تھا۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اس نے فریدی جیسے کو بھی بلڈاگ جیسے خطاب سے

نوازا تھا۔

”آپ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”ادھر جائیے وہ

اپنے بلڈاگ کو یاد کر رہی ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرح تمہارا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔“

”نہیں..... اس کی طرح نہیں بلکہ ایک شریف آدمی کی طرح۔“ حمید ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”محبوبائیں تو عموماً خردماغ ہوا کرتی ہیں۔“

”پھر وہی محبوبہ محبوبہ کی رٹ.....!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔

”اچھا آؤ میرے ساتھ..... شاید تمہیں میرے بیان پر یقین آجائے۔ میں اسے اقدام خودکشی

کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دیتا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ حقیقتاً وہ اقدام خودکشی نہیں تھا۔“

فریدی اسے زبردستی گیراج میں لایا اور کیڈی لاک کی پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”یہ دیکھو مجھے پاگل کتنے نے نہیں کانٹا تھا کہ خواہ مخواہ سیٹ پر کیچڑ پھیلا کر اسے برباد کر دیتا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ اسے توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔



کافی شور و غل مچانے کے بعد اس نے فریدی سے پوچھا۔

”وہ سو رکاوٹیں بلند کجاں ہے؟ میرے کپڑے کہاں ہیں اور اب تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”اب کیا خیال ہے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”پاگل.... قطعی پاگل۔“

”نہیں پیارے۔“ اس نے کہا اور پھر لڑکی کو مخاطب کر کے بولا۔

”کپڑوں کا انتظام ہو جائے گا.... تم اپنی ناپ بتاؤ۔“

”مجھے باہر لے چلو.... باہر جاؤں گی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں.... لیکن اس طرح تم پھر انہیں لوگوں کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔“

فریدی نے کہا اور سگڑا سلگانے لگا۔

لڑکی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ متذبذب نظر آنے لگی تھی۔

”خیر چھوڑو ناشتہ تیار ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مطمئن رہو.... اب تم پولیس

کی حفاظت میں ہو۔“

وہ سب ڈرائنگ روم میں آئے۔ لڑکی خاموش ہو گئی تھی۔ ناشتہ کے دوران میں اکثر وہ

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد فریدی نے پھر اس قفسے کو چھیڑا۔ لڑکی کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے وہ فریدی کی باتوں پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

میں کسی بات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے خود اپنی بات پر یقین نہیں۔ شاید کسی

دن میں یہ بھی بھول جاؤں کہ میں کون ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تمہیں یاد دلانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں

کہا اور خاموش ہو گیا۔

لڑکی سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ یہ کہ میں تمہیں اقدام خود کشی کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دوں۔“ فریدی پھر بولا۔

حمید متذبذب میں پڑ گیا۔ واقعی پوری سیٹ ہی برباد ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے علاوہ کوئی اور

چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ اس کا تہہ ہی بدل دیا جائے۔ ”پھر وہ آپ کو کس طرح پہچانتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ مجھے قطعی نہیں پہچانتی۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن مجھے وہ بات تو یہ

جس پر تم مجھے چھوڑ رہے ہو۔“

حمید کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا اور ان باتوں کو دہراتے ہوئے اسے کچھ شرم؛

محسوس ہونے لگی تھی۔

فریدی اسے متذبذب میں دیکھ کر بولا۔

”بتاؤ نا.... یہ معاملہ مجھے سیدھا سادھا معلوم نہیں ہوتا۔“ حمید نے برا سامنے بنا کر اس کا

اور اپنی گفتگو دہرا دی۔

فریدی کے ماتھے پر سلوٹیں آگئی تھیں۔

”کیا تم اسے پاگل سمجھتے ہو۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں پوچھا۔ ”اگر آپ کا اس سے کوا

تعلق نہیں ہے تو وہ یقیناً پاگل ہے۔“

”کیوں....؟“

”اس کی بے تکلی باتیں۔“

”وہ ایک دلچسپ کیس ہے اور اس کے ذریعہ ہمیں مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔“

فریدی نے کہا۔

”میری طرف سے جائے وہ جہنم میں۔“

”قطعی قطعی....!“ فریدی سر ہلا کر بولا۔

”لیکن اب تم جانیں رہے ہو۔“

”ابھی تک میرا طمینان نہیں ہوا۔“

”تم گدھے ہو! تمہیں شرم نہیں آتی۔ میرے متعلق ایسا سوچتے ہو۔ اب اگر تم نے لہ

بکواس کی تو خدا کی قسم پیڑوں گا۔“

پھر فریدی اسے دھکیلتا ہوا اندر لایا۔ یہاں وہ لڑکی نیچے اتر آئی تھی اور اس نے نوکر دیا

برسنا شروع کر دیا تھا۔

”ارے نہیں نہیں۔“ حمید ملتجائے انداز میں بولا۔ جس کا موڈ اب بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ تمام فریدی نے اسے یقین دلایا کہ وہ پولیس آفیسر ہے۔ اس سلسلہ میں اسے اپنا شناختی کارڈ دکھانا پڑا۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”کیا تم اس بات پر یقین کر سکو گے کہ میں نے اپنے لئے اجنبی ہوں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”اب اگر میرے ماں باپ بھی دیکھیں تو نہ پہچان سکیں۔“

”تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”ہنگری میں۔“

”انہوں نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟“

”شاید....!“ لڑکی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔“

”کیوں....؟“

”مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں تک کیسے پہنچی۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک رات ایک ریسٹوران میں شومان کے ساتھ کھانا کھا رہی

اس کے بعد آنکھیں کھلنے پر میں نے محسوس کیا کہ میں اسٹیر کے ایک کیبن میں پڑی ہوں۔

میری آنکھ پاگل خانے میں کھلی۔“

”شومان کون تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میرا ایک دوست....!“

”کوئی پرانا دوست رہا ہو گا۔“

”نہیں.... ہماری دوستی کوئی ایک ماہ سے زیادہ پرانی نہیں تھی۔“

”تم وہاں کیا کرتی تھیں۔“

”شیشے کے برتنوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی۔“

”وہ شومان پھر کہیں دکھائی دیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں....!“

”اور بلڈاگ کون ہے؟“

”بلڈاگ....!“ لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔

”میں اس کا نام نہیں جانتی لیکن میں نے اتنا خوفناک اور طاقت ور آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

”پاگل خانے سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میرے خیال سے یہاں اس شہر میں تو کوئی بھی پاگل

ہی ہے۔“

”نہیں ہو گا لیکن میں پاگلوں ہی کے ساتھ تھی۔“

”آخر تم کس بناء پر اسے پاگل خانہ سمجھنے پر مصر ہو۔“

”اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم مجھے اپنی غلام سمجھو اور مجھ سے ویسا ہی برتاؤ کرو پھر اگر تم

ہٹانہ مانو تو میں کیا کروں گی۔“

”کچھ نہیں....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”لیکن وہ اسی بات پر مجھ پر کوڑے برساتے تھے۔“

”کیا....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”جب میں انہیں اپنا ملازم سمجھنے کی بجائے پاگل سمجھتی تھی تو وہ مجھے بے دردی سے مارتے

۔ لڑکی نے کہا۔

”ان میں کوئی بھی آدمی کم حیثیت کا نہیں معلوم ہوتا تھا.... وہ سب کافی تعلیم یافتہ بھی ہیں

بلڈاگ اس نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔“

”یعنی....!“

”اس نے میری شکل ہی تبدیل کر دی۔ پہلی بار چہرے کی پٹیاں کھولنے پر جب آئینہ میرے

نے لایا گیا تو میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ میں بالکل بدل گئی ہوں۔“

”میرے خدا میں اپنے والدین کو کس طرح یقین دلاؤں گی کہ میں ان کی اپنی بیٹی ہوں۔“

”اوہ....!“ فریدی کے منہ سے نکلا اور حمید بھی آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس بلڈاگ نے میرے چہرے کا آپریشن کیا تھا۔“ لڑکی پھر بولی۔

”میرا سارا چہرہ بیٹوں سے ڈھک دیا گیا تھا.... میں پاگل ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے مار مار کر

بچے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ البتہ اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ عمارت کسی دیرانے میں ہے جس کے پاروں طرف گھنے جنگل ہیں۔“

”تم اس تالاب تک کس طرح پہنچی تھیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مجھے کوئی تالاب یاد نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”البتہ اپنے ہوش میں مجھ سے جو حرکتیں ہوئیں انہیں بتانے کی کوشش کروں گی۔“ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

پھر بولی۔ ”باہر نکلنے کے بعد میں جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں گھس پڑی۔ میرا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ دکھن نہیں بلکہ اسے جلن کہنا چاہئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے جسم میں دھکتے ہوئے انگاروں سے لکیریں کھینچ دی گئی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد یہ سوزش اور بڑھ گئی۔ پھر شائد میں دو تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد گر پڑی۔“

”تمہیں سمت کا بھی دھیان نہ ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”قطعاً نہیں! اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ وہ یہ کہ میں آزاد ہو گئی ہوں اور ہر قیمت پر مجھے ان سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑالینا ہے۔“

”ہاں..... خیر تو پھر.....!“

”جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے کہیں قریب کار اشارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میں نے جھاڑیوں سے منہ نکال کر دیکھا تو سڑک کے کنارے ایک پرانی وضع کی کار کھڑی تھی اور کوئی اس کا انجن کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ مجھ میں چلنے کی سکت بالکل نہ تھی۔ دفعتاً مجھے ایک تدبیر سوچھی۔ اس کار کے پیچھے لگج کیر بھی لگا ہوا تھا جیسے ہی کار رینگنی میں جھاڑیوں سے نکل کر لگج کیر پر بیٹھ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ مجھے اس کی فکر نہ تھی۔ میں تو جلد سے جلد ان کی دسترس سے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے تک میرے ہوش و خواں بجار ہے لیکن اس کے بعد سر چکرانے لگا۔ اس سے آگے میں نہیں جانتی کیا ہوا؟“

”ہوں.....!“ فریدی پر خیال انداز میں سگار سلگانے لگا۔ پھر اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”ان میں کسی کا حلیہ بتا سکتی ہو۔“

”قریب قریب سبھی کے بتا سکتی ہوں۔ لیکن نام کسی کا نہیں جانتی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”خصوصاً اس

امیروں کے رہن سہن کے طریقے سکھاتے تھے۔ میں ایک غریب لڑکی جو ناشتے میں صرف ایک اسٹیک کھا کر سارا دن گزار دیتی تھی بڑی بڑی عظیم الشان میزوں پر کھانے کے لئے زبردستی مجبور کی جاتی ہوں۔ میرے پاس صرف تین اسکرٹ ہوا کرتے تھے۔ دو معمولی تھے اور ایک کچھ اچھا جسے میں خاص خاص موقعوں پر پہنتی تھی۔ لیکن اب میرے پاس درجنوں اسکرٹ ہیں اور بڑے دن میں کئی بار لباس تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔“

”اور اس کے باوجود بھی تم وہاں سے بھاگ آئیں۔“ فریدی نے کہا۔

”میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔“

”یہ سوال دلچسپ ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اگر مجھے وہاں اتنی آسائشیں ہوتیں تو میں وہاں سے کبھی نہ بھاگتا۔“

”خواہ تمہاری صورت ہی کیوں نہ بدل جاتی۔“ اس نے بھولے پن سے پوچھا۔

فریدی اس کا جواب دینے کی بجائے کچھ سوچنے لگا۔

دفعتاً حمید کے ذہن میں ایک شبے نے سراہارا۔ ممکن ہے یہ خود ان ہی لوگوں کے لئے کہ جال بچھا رہی ہو۔ اس سے قبل بھی فریدی کے خلاف سازشیں ہو چکی تھیں۔

”وہ لوگ تم پر کوڑے برساتے تھے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

”یقین نہیں آتا.....! بھلا تم جیسی خوبصورت لڑکی پر کوڑے۔“

”تم یقین نہیں کرو گے۔“ وہ جھلا کر کھڑی ہو گئی اور لبادے کے اوپر کے بٹن کھول کر! پشت حمید کی طرف کر دی۔

”دیکھو.....!“ ساری پیٹھ پر ابھری ہوئی نیلی اور سیاہ دھاریاں تھیں۔ حمید لرز اٹھا۔

”بند کرو..... بند کرو۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کل رات بھی انہوں نے مجھے بے تحاشہ پیٹا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن کل رات ہی کو میں وہاں سے نکل بھاگی۔ وہ میرا کمرہ مقفل کرنا بھول گئے تھے۔“

”وہ جگہ بتا سکتی ہو۔“

”شاید میں باہر سے اس عمارت کو پہچان بھی نہ سکوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”کیونکہ مجھے کبھی

”میں تمہیں تصویروں میں دکھاؤں گا میرے ساتھ آؤ۔“

”کیا تمہارے گھر میں کوئی عورت نہیں۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”یہ نہ پوچھو....!“ حمید گلوگیر آواز میں بولا۔ ”ورنہ ہم دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیں گے۔“

”کیوں....!“ لڑکی کے لہجے میں تحیر تھا۔

”ہم لوگ اپنی پیدائش سے پہلے ہی بیوہ ہو گئے تھے۔“

لڑکی بے ساختہ ہنس پڑی۔

فریدی اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور یہاں ایک الماری سے ایک البم نکال کر اسے دیا۔

اس البم میں بہت سی تصویریں تھیں۔ ان میں سے کچھ عورتوں کی بھی تھیں ایک لباس اسے بے حد پسند آیا۔ وہ اسے پہننے پر رضامند ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد فریدی اور حمید نوکروں کو اس لڑکی کے متعلق خاص ہدایت دے کر روانہ ہو گئے۔

”اب کیا کہتے ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بظاہر تو یہ داستان طلسم ہو شر با سے کم نہیں دیے خدا جانے۔“ حمید نے کہا۔

”لڑکی کچھ بے وقوف سی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیوں....!“

”آخر وہ انہیں اپنا غلام کیوں نہیں سمجھتی تھی۔“

فریدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں اور کیڑی پکنی سڑک پر بھسکتی جا رہی تھی۔

دفعتاً اس نے حمید کو مخاطب کیا۔

”میں اس پہلے عقاب کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“

”آپ کی سوچ پر کوئی پابندی نہیں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”آپ ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوچتے

تھا جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“

”اچھا خیر تم ہی کوئی ایسی بات سوچو جو اس سے بھی زیادہ اہم ہو۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔

”میں اس بلڈاگ کے متعلق سوچ رہا ہوں جس کا کوئی وجود نہیں۔“

سے گھر

معرسہ سرجن کی شخصیت تو کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ جسے دیکھ کر بے اختیار بلڈاگ کہنے کوئی چاہتا ہے۔“

”وہی جس نے تمہاری شکل بگاڑی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں اس کا سر چھوٹا ہے اور جڑے اتنے بھاری ہیں کہ چہرہ سینے پر لٹکا ہوا سا ملوم ہوتا تھا، شانے غیر معمولی طور پر چوڑے ہیں۔“ آنکھیں چھوٹی اور سرخ ہیں۔ قد درمیانہ رنگ گندمی، پیشانی کافی کشادہ ہے۔ بال اتنے چھوٹے رکھتا ہے کہ وہ کسی طرف موڑے نہیں جاسکتے اور ہونٹ پتلے ہیں۔“

فریدی نے معنی خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھا جو لا پرواہی سے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اچھا تو تمہیں ٹریننگ کس قسم کی دی جا رہی تھی۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”کیا بتاؤں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ڈرامے کا ہیرو ہو رہی ہو۔ اے موقعوں پر مجھے نہایت قیمتی لباس پہنایا جاتا تھا اور میرے ساتھ باوردی باڈی گارڈ ہوتے تھے جن کے نیروں پر سفید جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں اور ان جھنڈیوں پر پیلے رنگ کے عقاب بنے ہوئے تھے۔“

”پیلے رنگ کے عقاب....!“ فریدی چونک کر سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔

”اس وقت وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ تمہارا نام بور ازیانہ ہے۔“

”اچھا بے بی۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”خیریت اسی میں ہے کہ تم ان کمروں تک محدود رہنا۔“

تم کھڑکیوں کے قریب بھی نہیں جاسکتیں اور اگر اس کے خلاف کیا، تو نتیجے کی تم خود ذمہ دار ہو گی۔ یہ کوئی بہت بڑی سازش ہے۔“

”تو کیا اب تمہاری قید میں رہنا پڑے گا۔“

”قید نہیں بلکہ حفاظت میں۔“ فریدی نے کہا۔ ”اگر ان لوگوں نے تمہیں لکھ لیا تو مجھے

زندگی بھر افسوس کرنا پڑے گا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”ابھی تک جو کچھ تمہارے ساتھ ہونا آیا ہے اسے کب سمجھی ہو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”ڈرو نہیں.... اس گھر میں تم ہر طرح محفوظ رہو گی۔ مجھے اپنے کپڑوں کے سائزے، دادر اگر

ہمارے ملک کا لباس پہننا چاہتی ہو تو اس سے بہتر کچھ نہ ہو گا۔“

”میں نہیں جانتی کہ تمہارے ملک کی عورتیں کیسا لباس پہنتی ہیں۔“

”وجود نہیں....!“ فریدی سامنے دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”جی ہاں.... میں اس لڑکی کے بیان کو ذرہ برابر بھی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”اس نے اقدام خود کشی کیا تھا۔ سزا کے خوف سے داستانیں گڑھ رہی ہے۔ خیر میں یوں بھی آپ کو رائے نہ دیتا کہ آپ اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔ چار دن گھر میں رونق ہی رہے گی۔“

”تم نے اس بلڈاگ کو کبھی نہیں دیکھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حالانکہ وہ یہاں کے مشہور آدمیوں میں سے ہے۔“

”جو حلیہ اس نے بیان کیا ہے ویسا آدمی مجھے آج تک نہیں دکھائی دیا۔“

”خیر دیکھو....!“ فریدی نے کارڈ دفعتاً پاتھ کے قریب روک دی۔

”ادھر دیکھو....!“

بائیں طرف والی عمارت میں ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ڈاکٹر ضرغام تحریر تھا اور کھڑکی کے اندر حمید کو ایک آدمی دکھائی دیا، جو میز پر جھکا ہوا کچھ لکھنے میں مشغول تھا اور پھر اچانک اس کے دماغ میں لفظ بلڈاگ کی گردان شروع ہو گئی۔

”میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا اور پھر کار چل پڑی۔



حمید بارہ بجے تک ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں برج کھلتا رہا۔ فریدی نے اسے ڈاکٹر ضرغام کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ پانچ بجے شام سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس دوران میں اس نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جس کی بناء پر اس پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکے۔ آٹھ بجے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹائٹ کلب میں آیا تھا اور ایک بجے برج چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔ لیکن اس کے دوست وہیں رہ گئے تھے۔ حمید اس کا تعاقب کر رہا تھا اور پھر اسے اس کے گھر پہنچا کر واپس آیا تھا۔ اس نے پھانک پر قدم رکھتے ہی برآمدے میں خلاف معمول تاریکی دیکھی تھی۔ ویسے برآمدے میں ہر حالت میں روشنی رہتی تھی۔ پھانک کا بلب بھی بجھا ہوا تھا۔

رکھوائی کرنے والے السیشن کتوں نے ہلکی ہلکی آوازیں نکالیں۔

اور حمید انہیں چکارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ”کون حمید“ برآمدے کے دوسرے کنارے سے فریدی نے اسے آواز دی۔ ”اوہ.... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“

”اس فیوز ہو گئی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ادھر ہی چلے آؤ۔“

”میرے خیال سے رکھوائی کے لئے کتے ہی کافی ہوتے ہیں۔“ حمید نے کہا اور مٹولتا ہوا آگے بڑھا۔

فریدی نے سگار لائٹر جلا کر اوپر اٹھایا۔ وہ ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ حمید اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا خبر لائے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں.... مجھے تو ایسی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی جس کی بناء پر کسی قسم کا شبہ بائیکے جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ بے ڈھنگا ضرور ہے خوفناک بھی معلوم ہوتا ہے لیکن ہاکیہ مطلب نہیں کہ اس کا کردار بھی خوفناک ہو۔ دوسری بات۔“ حمید نے عقل مندوں کی طرح مخصوص انداز میں سر ہلا کر کہا ”جولیا نے صرف اس کا حلیہ کیوں بتایا۔ ان لوگوں کے متعلق ناوضاحت سے کیوں نہیں بتایا جو اس پر کوڑے برسایا کرتے تھے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے ان کے تاؤاز ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اس قسم کے لوگوں کی ہر چیز ذہن سے بری طرح چپک جاتی ہے جو ہمارے لئے اذیت ناک ہوں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جولیا نے ہمیں آلو بنایا ہے۔“

”وہ کس طرح۔“

”اس سلسلہ میں ایک نقطہ تو عرض کر ہی چکا۔ اب دوسرا ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر ضرغام کی نسبت ایسی ہے کہ کوئی اسے ایک بار دیکھ کر زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ میں نے صبح اس کی صرف نیمٹھک دیکھی تھی اور تھوڑی دیر بعد جب اس کا خیال آتا تھا تو اس کی مکمل تصویر میرے ذہن میں ابھر آتی تھی۔ ممکن ہے جولیا نے اسے پہلے کبھی دیکھا ہو اور آپ کے استفسار پر اس کا حلیہ نکلتا ہو۔“

”تمہاری یہ دلیل قابل قبول نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”پھر تمہیں وہ نشانات بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں جو تم نے اس کی پیٹھ پر دیکھے تھے۔“

”ہو سکتا ہے کہ انکی کوئی اور وجہ ہو۔ آخر آپ اسکی اس کہانی کو حقیقت سمجھنے پر کیوں مصر مزید
”اس سے پہلے بھی کبھی تم نے ڈاکٹر ضرغام کو کوئی اہمیت دی تھی۔“ فریدی نے اس کی بار
کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔“ حمید بولا۔
”حالانکہ وہ کئی سال سے یہاں قیام پذیر ہے۔“ فریدی نے گار سلگاتا ہوا بولا۔
”رہا ہو گا۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ حمید کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا یک برآمدے کے بلب روڑ

ہو گئے۔ حمید نے روشنی میں دیکھا کہ فریدی کے قریب رکھی ہوئی ٹی پائی پر ٹیلی فون بھی موجود ہے
”آج سے تین سال قبل ڈاکٹر ضرغام نے ایک طبی رسالے میں ایک مضمون لکھا تھا جس
مردے کا آپریشن کر کے شکل تبدیل کر دینے کے امکانات پر بحث کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ
عقربت تجربات کرنے والا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”تو آپ نے جولیا کی اس ہوائی پر بھی یقین کر لیا ہے
اس کا چہرہ آپریشن کے ذریعہ بگاڑ دیا گیا ہے۔“
”تم اسے ہوائی کہتے ہو؟“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”امریکہ میں اس قسم کے تجربا
ہو چکے ہیں۔“

”جی ہاں.... میں نے اکثر امریکی رسائل میں اس قسم کے سرجنوں کے اشتہارات دیکھے
جو پھولی ہوئی ناک اور گدھوں جیسے کانوں کا آپریشن کر کے انہیں حسین بنا دیتے ہیں۔ خبر یہا
تک تو یقین کیا جاسکتا ہے لیکن پورے چہرے کے خدو خال بدل دینا اپنی سمجھ سے باہر ہے اور
جولیا کا چہرہ تو بالکل بے داغ ہے کیا یہ آپریشن کرنے والوں کا کمال ہے۔ بہر حال آپ کے پاس
اس کے لئے کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔

”فی الحال منطقی دلیل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ ابھی ہمارے پاس اتنا مواد نہیں ہے
”ہو گا صاحب۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

”یعنی یہ کہ تم نرے گاؤ دی ہو۔“ فریدی اکتا کر بولا۔ ”ارے صاحبزادے جولیا کی تلاش کی
بارہ ہے۔ یہ دیکھو....!“ اس نے میز پر رکھا ہوا کاغذ حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بارہ
یہاں سے اس وقت تک اٹھائیں برقعہ پوش عورتوں کے نقاب نوچے جا چکے ہیں۔“
”کس نے نوچے۔“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔

”چند مجبوظ الجواس آدمیوں نے اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہیں پکڑے جاسکے۔“
حمید سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہے، کچھ ہی دیر قبل وہ اس کی

”میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔“ حمید بولا۔
”حالانکہ وہ کئی سال سے یہاں قیام پذیر ہے۔“ فریدی نے گار سلگاتا ہوا بولا۔
”رہا ہو گا۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ حمید کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا یک برآمدے کے بلب روڑ
ہو گئے۔ حمید نے روشنی میں دیکھا کہ فریدی کے قریب رکھی ہوئی ٹی پائی پر ٹیلی فون بھی موجود ہے
”آج سے تین سال قبل ڈاکٹر ضرغام نے ایک طبی رسالے میں ایک مضمون لکھا تھا جس
مردے کا آپریشن کر کے شکل تبدیل کر دینے کے امکانات پر بحث کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ
عقربت تجربات کرنے والا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”تو آپ نے جولیا کی اس ہوائی پر بھی یقین کر لیا ہے
اس کا چہرہ آپریشن کے ذریعہ بگاڑ دیا گیا ہے۔“
”تم اسے ہوائی کہتے ہو؟“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”امریکہ میں اس قسم کے تجربا
ہو چکے ہیں۔“

”جی ہاں.... میں نے اکثر امریکی رسائل میں اس قسم کے سرجنوں کے اشتہارات دیکھے
جو پھولی ہوئی ناک اور گدھوں جیسے کانوں کا آپریشن کر کے انہیں حسین بنا دیتے ہیں۔ خبر یہا
تک تو یقین کیا جاسکتا ہے لیکن پورے چہرے کے خدو خال بدل دینا اپنی سمجھ سے باہر ہے اور
جولیا کا چہرہ تو بالکل بے داغ ہے کیا یہ آپریشن کرنے والوں کا کمال ہے۔ بہر حال آپ کے پاس
اس کے لئے کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔

”فی الحال منطقی دلیل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ ابھی ہمارے پاس اتنا مواد نہیں ہے
”ہو گا صاحب۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

دفعۃً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔
”ڈرا دیکھنا....!“ فریدی نے حمید سے کہا اور خود آنکھیں بند کر کے آرام کر رہی کی پٹ

سادگی کا مضحکہ اڑا رہا تھا، اب وہ اتنا بے حیا بھی نہیں تھا کہ ان کو اتفاقات کے زمرے میں نہ کر کے کسی نئی بحث کا آغاز کر دیتا۔ اسے اتفاق تو اس وقت کہا جاسکتا تھا۔ جب شہر میں اس سے بھی اس قسم کی کوئی واردات ہوئی ہوتی۔

شہر کی سڑکوں پر روزانہ خطہ الحواس اور مجنوں قسم کے آدمی اسے ہر روز دکھائی دیتے جن کے متعلق اس نے عوام کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ وہ سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ حالانکہ ان سے ایک بھی اس کے محکمہ سے نہیں تھا۔ بہر حال شہر میں ایسے آدمیوں کی تعداد کم نہیں ہے لیکن آج تک ان سے کوئی خطرناک حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی۔ ان کا پگل پن عموماً گالیوں یا ہلکی ہوا کو اس ہی تک محدود رہتا تھا یا پھر کبھی کبھی ان میں سے ایک آدھ پتھر لئے بچوں کے پیچھے ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اکثر وہ ہیک مائلتے وقت راگیروں سے بھی الجھ جاتے تھے اور پھر اگر معاملہ بڑا آدھ کا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ وہاں تو ایک دن میں اٹھائیس عورتوں کے نقاب نوپے تھے۔ اسے تو کوئی بچہ بھی کسی غیر معمولی سازش پر محمول کر سکتا تھا۔

حمید نے ہارے ہوئے جواری کی طرح ہاتھ پیر ڈال دیئے۔ فریدی کے ہونٹوں پر اب زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اب کیا کہتے ہو۔“

”فی الحال میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“

”کہو گے کیا۔“ فریدی نے کہا۔

”اگر جو لیا ڈاکٹر ضرغام کا حلیہ نہ بیان کرتی تو شاید مجھے بھی یقین نہ آتا۔“

”کیا آپ کے پاس اس کا کوئی خراب ریکارڈ موجود ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں لیکن اس کا وہ مضمون....!“

”آپ بھی مضمون کو لئے پھرتے ہیں۔“

”میں اس مضمون کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں جسکے متعلق ابھی بتایا تھا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”یہ ایک دوسرا مضمون ہے، جواب سے ڈیڑھ ماہ قبل شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے

سال قبل والے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ میں تین سال سے انتخابی تجربات کے

اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تبدیلی ہیئت کے لئے چہرے کا آپریشن کامیاب نہیں ہوتا۔ اب سے

سال قبل جو میں نے لکھا تھا وہ میری خام خیالی تھی.... امریکی ڈاکٹروں کے کامیاب تجربوں

مخلوق اس کا خیال ہے کہ وہ زیادہ تر اتفاقات پر مبنی ہیں۔“

”تو پھر....!“

”تو پھر کیا....! سوچنے کی بات ہے کہ تین سال بعد پہلے والے بیان کی تردید کی ضرورت

کیوں محسوس ہوئی۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں اور سر میں جھانک جھانک شروع ہو گئی تھی۔

”چالاک سے چالاک آدمی بھی کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتا ہے۔“ فریدی پھر بولا۔

”اگر وہ تین سال بعد اپنا تردیدی مضمون نہ چھپواتا تو....!“

”جو لیا کہاں ہے۔“ حمید اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”سو رہی ہے۔“

”تو اسی لئے آپ یہاں بھاگ آئے ہیں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”کیوں؟ اس سے کیا۔“

”بھلا ایک غیر عورت کیساتھ اکیلے گھر میں.... آپ بڑی بوڑھیوں کو کیا منہ دکھاتے۔“

”کیا بکواس ہے۔“

”اے ہے۔“ حمید نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”ذرا دانتوں تلے انگلی بھی دبائی ہوتی۔“

”شٹ اپ....!“

”انشاء اللہ آپ حشر کے دن کنواری لڑکی بنا کر اٹھائے جائیں گے۔“

”کیا لو فروں کی طرح دو پیسے والے جملے بول رہے ہو۔“ فریدی کی ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”میں آپکے دکھوں کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں۔“ حمید اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر بولا۔

فریدی بڑا سامنے بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”میں آپ کے دل کی گہرائیوں تک اتر گیا ہوں۔“ حمید نے منہ لہجے میں کہا۔

”مت ٹائیں ٹائیں کرو۔“

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر

کہ تاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جان پر

”میں نے دیکھا جیسے اس نے گھونسا مار کر میرے سر کی ہڈیاں چور کر دیں۔“
 ”اس خواب کی وجہ خوف ہے اور کچھ نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم خواب کی حقیقت
 مل نہیں ہو۔“

”کبھی کبھی میں نے ایسے ایسے خواب دیکھے ہیں جو پورے ہو چکے ہیں۔“
 ”اتفاقات ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن یہ خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ میرا ایک گھونسا
 بے سر کی ہڈیاں چور نہیں کر سکتا۔“

”میں اس بلڈاگ کے گھونسنے کی بات کر رہی ہوں۔“

”وہی سہی وہ اتنا طاقتور نہیں ہے۔“

”تو کیا تم اسے جانتے ہو۔“ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ اس شہر کا ایک معمولی سا ڈاکٹر ہے۔“

”تب تم اسے نہیں جانتے۔“ جولیا مسکرا کر بولی۔ ”نہ اس کی طاقت سے واقف ہو۔ کوئی
 مولی طاقت والا آدمی ایک گھونسنے میں کسی کے سر کے پرچے نہیں اڑا سکتا؟ آرتھر کا سر میرے
 اٹنے ہی پھٹا تھا اور اس نے میرے سامنے ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔“
 ”آرتھر کون....؟“

”ان ہی میں سے ایک تھا۔“

”مگر تم نے کہا تھا کہ ان میں سے کسی کے نام سے واقف نہیں تھی۔“

”وہ دراصل مجھ سے عشق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ جولیا نے سادگی سے کہا۔ ”اس سلسلہ
 میں وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا اور اسی نے مجھے اپنا نام بھی بتایا تھا۔ ایک دن اس خوفناک آدمی
 نے اسے مجھ سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسی جگہ بے چارے آرتھر کو تڑپ تڑپ کر
 جان دینی پڑی۔“

”آرتھر....!“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا پھر جولیا کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”وہی تاجس کے بائیں کان کی لوکٹی ہوئی تھی۔ داہنے نتھنے پر بڑا سا تل تھا۔“

”وہی وہی....!“ لڑکی جلدی سے بولی اور فریدی کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ فریدی کسی
 کوچ میں پڑ گیا۔

”خدا کے لئے مجھے ایسے سڑے بے شعر مت سنایا کرو۔“

”اصغر گونڈوی کا شعر ہے جناب۔“

”اللہ تعالیٰ کا تو نہیں ہے۔“

”کیوں صاحب کیا خرابی ہے اس شعر میں۔“

”اس قسم کی کیفیت صرف کافی مقدار میں بھنگ پی جانے پر پیدا ہو سکتی ہے۔“ فریدی نے
 مسکرا کر کہا۔

”ایسی حالت میں ستاروں کی چمک تو کیا ستاروں کے خیال سے بھی رگ چمکنے لگتی ہے۔“

آپ اتنے پیارے خیال کا خون کر رہے ہیں۔“

”خیال کیا میں تو تمہارا خون کر دینے کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔“

”آخر آپ عورت کے نام پر بدکتے کیوں ہیں۔“

”یاد کیوں پور کر رہے ہو۔“ فریدی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”نہند نہیں آرہی تمہیں۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

فریدی نے مڑ کر دیکھا۔ جولیا دروازے میں کھڑی پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھ

رہی تھی۔ ”تم نے میرا کہنا نہیں مانا۔“ فریدی نے سخت لہجے میں کہا۔

”اندر آ جاؤ.... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ پیچھے ہٹ کر تارکی کی میں جاتی ہوئی بولی۔

”کیوں....!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔

وہ دونوں اندر چلے گئے۔

”میں نے ابھی ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔“

”کیا....!“ حمید نے پوچھا۔

لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ وہ فریدی کی طرف دیکھ رہی تھی اور فریدی کے

انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس خواب کو سننے کا خواہش مند نہیں ہے۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

حمید نے پھر خواب کے متعلق استفسار کیا۔

”وہ بلڈاگ....!“ لڑکی کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یک یک رک گئی۔

”ہاں.... آں....!“ فریدی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجبوری ہے۔“

جولیا بدستور گھونگھٹ نکالے بیٹھی رہی۔ وہ اسی طرح چائے پینے لگی تھی۔ کیا تمہارے یہاں سب کی سب عورتیں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں۔ جولیا نے پوچھا۔

”ہاں....!“

”ہمیشہ....!“

”ہاں....!“

”وہ زندہ کس طرح رہتی ہیں۔“

”خود تمہیں دو چار دن کے بعد اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔“

”تو کیا مجھے بھی اس طرح رہنا ہوگا۔“ جولیا گھبرا کر بولی۔

”قطعاً.... اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔“

”میں تو مر جاؤں گی۔“

”ہمارے یہاں کی عورتیں سو سال سے قبل نہیں مرتیں۔“

”تعب ہے۔“

”بھلا اس میں تعب کی کیا بات ہے۔“

”تمہارے یہاں کی عورتیں دنیا کا آٹھواں نمبر معلوم ہوتی ہیں۔“ جولیا نے کہا۔

”اور مرد اس سے بھی زیادہ اُلو کے پٹھے ہیں۔“

”کیوں....؟“

”اس لئے کہ ہمارے یہاں شادی سے پہلے میڈیکل ٹسٹ کا رواج نہیں ہے۔“

”کیا اوٹ پٹانگ بکواس اگر رکھی ہے۔“ فریدی نے جھنجھلا کر کہا اور پھر جولیا کو مخاطب کر کے

کہنے لگا۔

”اپنا منہ کھول دو، یہ خواہ مخواہ تنگ کر رہا ہے۔“ جولیا نے ہنس کر گھونگھٹ ہٹا دیا۔ پھر حمید

سے کہنے لگی۔ ”یقیناً یہاں کے مرد اُلو کے پٹھے معلوم ہوتے ہیں۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جولیا بولی۔

”کیا اس کو نقاب کہتے ہیں۔“



دوسرے دن صبح حمید کی طبیعت کسلند تھی۔ پچھلی رات کافی رات تک جاگتا رہا تھا۔ جولیا سے گفتگو کرنے کے بعد فریدی اُنھ کو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حمید آر تھر کے متعلق اس سے استفسار کرنا چاہتا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اس نے اس سے پہلے بھی یہ نام سنا تھا لیکن ذہن پر کافی زور دینے کے باوجود بھی یہ نہ یاد آیا کہ نام کس سلسلہ میں تھا اور پھر اس نام پر فریدی کے چہرے پر تشویش کے آثار بھی دکھائی دیئے تھے۔ آخر کیوں، اور وہ اسے کچھ بتائے بغیر چپ چاپ اٹھ گیا تھا۔ حمید کافی دیر تک الجھتا رہا۔

اور شاید یہ الجھن اور زیادہ بڑھ جاتی مگر ناشتے کی میز پر جولیا کی ہیئت کڈائی دیکھ کر اس کی الجھن رفع ہو گئی۔ وہ اس وقت لیڈی ہملٹن کے غرارے اور جینر میں ملبوس تھی اور دوپٹے گردن میں ڈال کر نائی کی گرہ لگائے ہوئے تھی۔

”ارے اس طرح نہیں استعمال کیا جاتا۔“ حمید نے کہا۔

”او نہہ....!“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”چلنے بھی دو۔“

”پھر کس طرح۔“ جولیا نے کہا۔

”ظہر و بتاتا ہوں۔“ حمید بولا اور اٹھ کر اسے باقاعدہ دوپٹے اوڑھا دیا اور پھر بڑا سا گھونگھٹ

نکال کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

وہ چند لمحوں تک اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ پھر منمناتی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں چائے کس طرح پیوں گی۔“

”یہ بھی کچھ مشکل نہیں۔“ حمید نے کہا اور چائے کی پیالی گھونگھٹ میں لے جا کر اس کے

ہونٹوں سے لگادی۔

فریدی حمید کو گھور رہا تھا اور بولا کچھ نہیں۔

”اس طرح تو بڑی دشواری ہوگی۔“ جولیا آکتا کر بولی۔

”میں تمہیں اپنے ملک کے لباس کا صحیح استعمال بتا رہا ہوں۔“ حمید نے کہا اور اس کا ہاتھ

ایک سلائس سمیت گھونگھٹ میں گھس گیا۔

”مجھ سے نہیں بنے گا۔“ جولیا نے کہا۔

”نہیں گھونگھٹ.... کیوں؟“

”کیا یہ دونوں لفظ ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔“

”نہیں، نقاب اور گھونگھٹ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ بہر حال وہ بھی چہرے کو چھپانے ہی کے

لئے استعمال کیا جاتا ہے۔“

”میں آج صبح کا اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس میں یہ خبر کافی دلچسپ تھی کہ کل چند پاگل آدمیوں

نے اٹھائیس عورتوں کے نقاب نوچ ڈالے۔ لیکن میں انہیں پاگل نہیں سمجھتی ہوں۔ انہوں نے

نہایت عقلمندی کا کام کیا ہے۔“

”انہیں میں بھی عقل مند سمجھتا ہوں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں تم کسی بڑی گہری

سازش میں شریک کی جانے والی تھیں۔“

”میری عقل ہی خطہ ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس دنیا میں ہوں یا عالم

ارواح میں۔ کہیں میں سچ مچ پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔“

”گھبراؤ نہیں۔“ فریدی نے اسے دلاسا دیا۔ ”آہستہ آہستہ سارے سازشی میری گرفت

میں آتے جا رہے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ مجھے اس گورکھ دھندے سے نجات بھی مل جائے۔“ جولیا مغموم لہجے میں

بولی۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے والدین کو کس طرح یقین دلاؤں گی کہ میں ان

کی بیٹی ہوں۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا.... تم مت گھبراؤ۔“

”لیکن آخر یہ سب کچھ ہوا کیوں.... میری زندگی کیوں اس طرح برباد کی گئی۔“

”میں اسی سوال کے جواب کی تلاش میں ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن تمہیں زیادہ محتاط

رہنا پڑے گا۔ وہ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں اور ان کا گردہ بہت منظم معلوم ہوتا ہے اگر تم سے

ذرا بھی لغزش ہوئی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔“

”حتی المقدور احتیاط برتوں گی۔“

”تمہیں ناچنا آتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”مجھے کبھی تفریحات کا موقع ہی نہیں ملا۔“ جولیا نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا تو خیر اس مکان میں تمہیں بہت سی تفریحات ملیں گی۔“

حمید ابھی اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن فریدی کے اشارے پر اٹھنا ہی پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر جانے کے لئے لباس تبدیل کر رہے تھے۔

”یہ آر تھر کون تھا۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”تم آر تھر کو نہیں جانتے۔“ فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔ ”تب تو تمہیں اس محکمے میں نہیں

ہونا چاہئے۔“

”یہ تو وہی بات ہے۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”تم خدا کو نہیں جانتے۔ تب تو تمہاری پیدائش ہی

غلط ہوئی ہے۔“

”تمہیں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ تو معلوم ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ اس کا ریکارڈ کافی عرصہ

تک تمہاری فائل میں رہا ہے۔“

”مجھے یاد نہیں۔“

”خیر وہ ایک عادی مجرم اور ایک خطرناک بلیک میلر تھا۔ آج سے چھ ماہ قبل تین سال کی قید

بامشقت سے رہا ہوا تھا، بہر حال جو لیانے یہ ایک بڑے کام کی بات بتائی ہے۔“

”مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔“

”کس طرح....!“ فریدی نے پوچھا۔

”وہی بکو اس کر رہی تھی۔“

”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“

”اس وقت میں اسے پاگل سمجھتا تھا۔“

”ہوں.... خیر.... آؤ چلیں۔“

”لیکن جانا کہاں ہے....“ حمید نے پوچھا۔

”فی الحال آوارہ گردی کے موڈ میں ہوں۔“

”مگر میں بڑا شریف بچہ ہوں۔“

”چلو چلو....!“ فریدی اسے دروازے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔

پھر چند لمحوں کے بعد فریدی کی کینڈلاک بڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

”کیا آپ نے کوئی طریقہ متعین کر لیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ابھی نہیں.... ابھی تو میں بقول شخصے اندھیرے میں ہاتھ مار رہا ہوں۔“

”ایک بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔“

”کیا....!“

”آخر ہم پر ہی کیوں اس قسم کی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔“

”کیسی بلائیں۔“

”کیا یہ ضروری تھا کہ وہ بڑی آپ ہی ہا ملتی۔“ حمید نے کہا۔ ”میں شروع سے دیکھ رہا ہوں

کہ جس زمین پر آپ کے قدم پڑتے ہیں وہاں سے کوئی نہ کوئی نیا فتنہ ضرور ابھر رہا ہے، پتہ نہیں

کہ آپ کی تقدیر کس بنا سیتی ستارے سے وابستہ ہے۔“

”تقدیر کی بات نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”تم بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھو تو تمہیں ہر

راہ پر ہر موڑ پر کسی نہ کسی عجیب واقعہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

”میں آنکھیں بند نہیں رکھتا۔“

”اگر آنکھیں بند نہیں رکھتے تو تم نے اسے پاگل کیوں سمجھ لیا تھا۔“

”میں کیا ہر ایک ایسا ہی سمجھتا۔“

”ہر ایک نہ کہو.... اپنی کہو۔“

”خیر ماریے گولی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

فریدی یوں ہی بلا مقصد اپنی ناراض اور دھڑکتا پھر رہا تھا۔ کبھی اس سڑک پر کبھی اس

پارک کے سامنے روک دی اور کبھی کسی رستہ پر ان کے سامنے.... ڈاکٹر ضغام کے مطب کا بھی

ایک چکر لگا چکا تھا اور اسے کل ہی کی طرح پر جھکا ہوا پایا تھا۔ آج بھی اس کے یہاں مریضوں

کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔

دندو پر ایک آدمی کھڑا شاید دوا بہا تھا اور دو بوڑھیاں اس کی میز کے قریب پڑی ہوئی

کرسیوں پر اونگھ رہی تھیں۔

اب اس کی کار بائم روڈ کی طرف سے بلی روڈ کی طرف جا رہی تھی۔

”یہ کیا....!“ دفعۃً حمید بولا۔

ایک جگہ کافی بھیڑ دکھائی دی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کچھ لوگ کسی کو گھیر گھیر کر پکڑنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ فریدی نے ایک لخت کار روک دی اور اتر کر بھیڑ کی طرف بڑھا۔

ایک آدمی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ایک دیوانے نے ایک طالبہ کا نقاب نوجوا

... وہ بچاری ایک طرف کھینچی تھی۔ فریدی بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر گھسنا۔ دیوانہ ہر بار

نے والوں کی گرفت سے نکل جاتا تھا، وہ خود بھی لہو لہان ہو رہا تھا اور کئی آدمیوں کو اپنے بڑے

ہاتھوں اور چمکیلے دانتوں سے زخمی کر چکا تھا۔

فریدی چند لمحوں تک کھڑا اسے بغور دیکھتا رہا پھر خود بھی اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے اس کے

ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے، لیکن لاکھ احتیاط کے باوجود بھی اس کے دانتوں سے نہ بچ سکا۔

انے اس کے شانے پر منہ مارا تھا مگر فریدی کی گرفت سے نکل جانا آسان کام نہ تھا۔

حمید بھیڑ کو ہٹانے لگا۔ فریدی نے اس کو کار کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ دفعۃً کسی اور

ف سے ایک اور آدمی بھی دیوانے پر ٹوٹ پڑا۔

”مارڈالوں گاسالے کو۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”میری بیٹی کا نقاب.... کل اسی نے....!“

فریدی اسے ہٹانے لگا۔ اس جدوجہد کے دوران میں کسی طرح دیوانہ اس کی گرفت سے نکل

اور دوسرا آدمی فریدی پر آ رہا۔

حمید بے ساختہ اس دیوانے کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ دوڑے اور یہی چیز

کے نکل جانے کا سبب بن گئی اگر وہ ایک ساتھ نہ دوڑتے تو اس نے اس خطی کو پکڑ لیا ہوتا۔

گلے موڑ پر پہنچ کر وہ ایک بیک بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

واپسی پر حمید نے فریدی کو اس آدمی سے اچھے ہوئے پایا جس کی وجہ سے وہ اس کی گرفت

سے نکل گیا تھا۔

”کیا ضرورت تھی آپ کو خواہ مخواہ بیچ میں کودنے کی۔“ فریدی بگڑ رہا تھا۔

”اس نے کل میری بیٹی کا نقاب نوجا تھا۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس پاگل کتے کو۔ اگر

حکومت ان پاگلوں کا کوئی انتظام نہیں کر سکتی تو ہم خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔“

فریدی اسے جواب دینے کی بجائے قہر الود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس

سکھڑے پر تھپڑ مار دے۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پایا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس

نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن میں نے اسے پکڑ ہی لیا تھا۔“

”اب کیا بتاؤں....!“ وہ آدمی خفیف ہو کر بولا۔ ”اسے دیکھ کر میں خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ کل اس نے سر راہ شرمندہ کیا تھا۔“

”خیر ہو گا۔“ فریدی نے بے تعلقانہ انداز میں کہا اور اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔ لیکن وہ اب بھی کنکھیوں سے اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں اس نے حمید کو کچھ اشارہ کیا اور وہ کار کے قریب سے ہٹ کر سڑک کے کنارے پر چلا گیا۔

فریدی نے کار اشارت کر دی۔

حمید سڑک کی کنارے کھڑا رہا۔ اتنے میں وہ آدمی جس نے دیوانے کو مارا تھا ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ حمید اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

وہ دو تین سڑکوں کا چکر لگانے کے بعد ڈاکٹر ضرغام کے دواخانے کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور حمید کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈاکٹر ضرغام کے مطب میں داخل ہو گیا۔ دواخانے کے سامنے ہی فٹ پاتھ پر پرانے ناولوں اور رسالوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ حمید وہاں رک کر کاؤنٹر پر لگی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگا۔

اس کی نظریں کبھی کبھی اس کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں جس کے پیچھے ڈاکٹر ضرغام کی میز تھی۔ یکایک ڈاکٹر ضرغام اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی منھیاں بھنجی ہوئی تھیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دب گیا تھا۔ ”میں اسے دیکھ لوں گا۔“

حمید نے سڑک کے شور کے باوجود ڈاکٹر ضرغام کی آواز صاف سن لی تھی۔ ”کسے دیکھ لے گا۔“ حمید کے ذہن نے سوال کیا۔

کیا یہ جملہ اس نے فریدی کے لئے کہا تھا۔ کیا وہ شخص جس کا وہ تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ تھا فریدی کو پہچانتا تھا اگر یہ بات ہے تو وہ اسے بھی پہچانتا ہو گا اور یہ بھی جانتا ہو گا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری بات کو اس کے ذہن نے قبول نہ کیا۔ اگر یہ بات ہوتی تو وہ ضرغام کے مطب میں آتا ہی کیوں، یا اگر کسی وجہ سے آیا ہی تھا تو اس کے داخل ہوتے ہی ڈاکٹر ضرغام استھسکوپ اٹھا کر اس کا معائنہ شروع کر دیتا اور وہ اسی سلسلہ میں اپنی رپورٹ بھی سناتا۔ حمید نے

برڈاکٹر ضرغام کی طرف دیکھا جو کھونٹی سے لٹکا ہوا کوٹ اتار رہا تھا۔ پھر اس نے ٹائی کی گرہ رست کی اور انگلیوں سے سر کے بال ٹھیک کرتا ہوا فٹ پاتھ پر اتر آیا۔

وہ آدمی بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر ضرغام نے حمید کے قریب سے گزرتے وقت اسے گھور کر دیکھا اور سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ حمید چکر اگیا کہ اب اس کا تعاقب کرے یا اس آدمی کے انتظار میں وہیں کھڑا رہے۔

وہ آدمی تھوڑی دیر تک اوجھتا رہا پھر وہ بھی باہر نکل آیا۔

حمید پھر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ دفعتاً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اسے ہر حالت میں ڈاکٹر ضرغام کا تعاقب کرنا چاہئے تھا۔

اس نے سوچا کہ وہ اس بات کا تذکرہ فریدی سے نہ کرے گا کیونکہ اس طرح اس کا احقر قرار باجائز یقینی تھا۔ فریدی گھنٹوں اس کا مذاق اڑاتا۔

وہ آدمی تھوڑی دیر ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کے بعد ایک چھوٹے سے کیفے میں گھس گیا جس میں بار بھی تھا۔



رات اپنے سیاہ بازو پھیلائے کائنات پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ حمید اور جو لیا رات کے کمانے سے فارغ ہو کر بیٹھے فریدی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ صبح سے غائب تھا۔ آج اس کی تفتیش کا پانچواں دن تھا۔

حمید کو حیرت تھی کہ آخر فریدی اس بار اتنی احتیاط کیوں کرتا رہا ہے۔ قاعدے کے مطابق تو اسے اب ڈاکٹر ضرغام سے الجھ ہی جانا چاہئے تھا۔

”تمہارا چیف تو مجھے ان آدمیوں سے بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔“ جو لیا نے کہا۔

”کیوں....!“ حمید نے پوچھا۔

”اس نے پورے مکان کو اچھا خاصا عجائب خانہ بنا رکھا ہے۔“

”کیا تم نے یہاں سب کچھ دیکھ لیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”سب کچھ سے کیا مراد ہے۔“

”مطلب یہ کہ تم نے مجھے بھی دیکھا یا نہیں۔“

”کیوں نہیں تمہارے جیسا Laughing Beast (ہنسنے والا درندہ) آدمی تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔“ جولیا نے ہنس کر کہا۔

”تم غلط سمجھیں.... میں بہت روتا ہوں۔“

”کیوں....!“

”ایک ستم رسیدہ آدمی ہوں۔“

”تم....!“ جولیا ہنس کر بولی۔ ”بھلا تم پر کس نے ظلم کیا ہے۔“

”مجھے ان کے نام تک یاد نہیں رہے۔“

”ظلم کی قسمیں بتاؤ۔“

”میا کروگی سن کر تمہیں دکھ ہو گا۔“

”پھر بھی۔“

”ایک بار ایک آدمی نے میرے منہ پر کہہ دیا تھا کہ تمہاری ناک ٹیزھی ہے۔“

”ٹھیک تو کہا تھا اس نے....!“

”ہائیں....!“ حمید اچھل کر بولا۔ ”تم بھی یہی کہتی ہو۔“

”نہیں نہیں سیدھی ہے۔ میں نے تو یونہی مذاق کیا تھا۔ اچھا دوسرا ظلم؟“

”دوسرا ظلم یہ ہے کہ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے شادی کی درخواست نہیں کی۔“

”یہ تو واقعی ظلم ہے۔“ جولیا مسکرا کر بولی۔

”مجھے اُلو بنا رہی ہو۔“

”نہیں نہیں.... تیسرا ظلم۔“

ایک بار مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ بڑی سنجیدہ اور حلیم تھی۔ میں نے اسے کبھی ہتے!

مسکراتے حتیٰ کہ بات کرتے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے اسے کئی بار متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر“

صرف دیکھ کر رہ گئی۔

”پھر....!“

”ایک بار ایک جگہ تہا مل گئی۔ میں نے اس سے گفتگو کرنی چاہی، جانتی ہو اس نے کیا کہا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ جولیا اسے سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

”کیا کہا....!“ وہ تھوڑی دیر بعد اکتا کر بولی۔

اس نے کہا۔ ”لوع.... باغ.... بوق.... بوق.... بوق....!“

”کیا مطلب....!“

”وہ کم گو تھی۔“ حمید غمزہ لہجے میں بولا اور اداسی کی اینٹنگ کرتا ہوا اس کی آنکھوں میں

پھینے لگا۔

جولیا بے اختیار ہنس پڑی اور کافی دیر تک ہنستی رہی۔

”تم نے شادی کیوں نہیں کر لی اس سے۔“ جولیا ہنس کر بولی۔

”میں نے سوچا کہیں اس بے چاری کو میرے ساتھ رہ کر بولنا ہی نہ پڑ جائے۔“

”تو تم زندگی بھر کنوارے ہی رہو گے؟“

”ہاں....!“

”آخر کیوں؟ تم لوگ تو کافی دولت مند ہو۔“ جولیا نے کہا۔

”میرا چیف عورتوں سے ڈرتا ہے اور میں....!“

”کیوں....؟“ جولیا نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

”میں نہیں جانتا.... لیکن جب سے تم یہاں آئی ہو وہ گھر میں بہت کم رہتا ہے۔“

”کیا مجھ سے بھی ڈرتا ہے۔“

”ہاں تم سے بھی بڑی طرح خائف ہے۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں....!“

”عجیب بات ہے تم تو کہہ رہے تھے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے فول مین کی آمدھی اور

بیرون آئی لینڈ کی پُر اسرار آبادی کا پتہ لگایا تھا۔“

”ہاں ہاں میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“

”اور وہ عورتوں سے ڈرتا ہے۔“

”عجیب لڑکی ہو تم بھی۔“ حمید نے کہا۔ عورتوں سے خائف رہنے میں اس کی دلیری اور بلند

کُن میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے دیکھو میں کتنا بہادر آدمی ہوں لیکن اندھیرے میں کسی کالی بلی

کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ سنائے میں آواز سن کر میرا دم بڑھ گیا ہے۔ اگر اندھیرے میں تم ہی چوٹ کر مجھے ڈراؤ تو میں چیخ مار کر تم سے لپٹ جاؤں گا۔
جولیا کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ چوٹ کر آواز کی طرہ دیکھنے لگی۔ فریدی اپنی بغل میں ایک فائل دبائے اندر داخل ہوا۔ ابھی وہ بیٹھنے ہی پایا تھا کہ جو پوچھ بیٹھی۔

”مسٹر فریدی! کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو۔“

فریدی نے بُرا سا منہ بنا کر حمید کی طرف دیکھا اور پھر جولیا کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اس کی اطلاعات صرف تمہیں اس سے مل سکتی ہیں۔“

”یہ کہتا ہے کہ تم میری وجہ سے ادھر ادھر بھاگے پھرتے ہو۔“ جولیا نے کہا۔ ”خیر بھائی دوڑ تو میری ہی وجہ سے ہو رہی ہے، لیکن اس کا کہنا ہے کہ تم مجھ سے اس قدر خائف ہو کہ تم گھر میں نہیں رہتے۔“

”ممکن ہے کہ یہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔“ فریدی لا پرواہی سے بولا۔ ”تم لوگ کھانا کھا چکے؟“

”لیکن تم مجھ سے ڈرتے کیوں ہو۔“ جولیا نے پوچھا۔

”بھئی اس سے پوچھو، وہی کوئی معقول وجہ بتا سکتا ہے۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

پھر اس نے باورچی کو آواز دے کر بلایا۔

”میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”بس جلدی سے کافی اور دو پیسٹریاں دے جاؤ۔“

”دیکھا تم نے۔“ حمید چپک کر بولا۔ ”ڈر کے مارے بھوک بھی غائب ہو گئی۔ صرف کانڈ پئیں گے۔“

”کیوں بے کار بکواس لگا رکھی ہے۔“ فریدی اردو میں بڑبڑایا۔

”میں کہتا ہوں آخر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ حمید نے انگریزی میں کہا۔ ”یہ بے چاری

نہ شیر ہے نہ بھیڑیا۔“

”شٹ اپ!...!“

”اچھا خوف کی وجہ ہی معلوم ہو جائے۔“

”حمید چپ رہو، ورنہ سر توڑ دوں گا۔“ فریدی نے اردو میں کہا۔
”اوہو!...!“ حمید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جولیا کی طرف مڑا۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ اس

نے کل رات کو تمہیں اپنے کتے سے لڑتے دیکھا تھا۔“

”میں!...!“ جولیا متحیر ہو کر بولی۔ ”نہیں یہ سراسر جھوٹ ہے۔“

”یہ تمہیں خواہ مخواہ بے وقوف بنا رہا ہے۔“ فریدی نے جولیا سے کہا۔ ”اس کی باتوں میں نہ آؤ۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔“ جولیا حمید کی طرف مڑی۔

”یہ غلط ہے۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کو بے وقوف نہیں بنایا۔ ہمیشہ خود بنتا رہا ہوں۔“

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ تم نے بہتری لڑکیوں کو بے وقوف بنایا ہو گا۔ میں قسم کھانے کے

لے تیار ہوں۔“ جولیا بولی۔

”البتہ بعض لڑکیوں نے مجھے اس قدر بے وقوف بنایا ہے کہ اب مجھے خود کو بے وقوف کہتے

ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے۔“ حمید نے منغوم لہجے میں کہا۔

”اچھا کس طرح بے وقوف بنایا تھا۔“

”ایک دو کیس ہوں تو بتاؤں۔“

”پھر بھی ایک آدھ!...!“ جولیا چوٹ کر بولی۔

”خدا خیر کرے۔“ فریدی اردو میں بڑبڑایا۔ ”حمید کے بچے خدا را اس مظلوم لڑکی پر رحم کرے۔“

”ابھی کچھ دنوں کی بات ہے۔“ حمید فریدی کی بات کو نظر انداز کر کے بولا۔ ”ایک لڑکی مجھ

سے بہت قریب ہو گئی اور اس نے رورو کر مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ہرگز مجھ سے شادی نہ کرے گی۔

اس بات پر مجھے سچ سچ اس سے محبت ہو گئی، لیکن اس نے مجھے بے وقوف بنایا۔ مجھے کہیں کانہ رکھا۔“

”کیوں کیا کیا اس نے۔“ جولیا نے حیرت سے کہا۔

”منمنانے لگی!... تاکہ کے بل بولنے لگی۔“

”کیوں! منمنانے کیوں لگی۔“

”تاکہ میں اس سے نفرت کرنے لگوں۔ اسے بھلا دوں۔“

”عجیب بات ہے!... بھلا اس میں نفرت کی کیا بات ہے۔“

”میں ہر اس عورت سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، جو ناک کے بل بولتی ہے۔“

”عجیب آدمی ہو تم....!“

”لیکن میں نے اس معاملہ میں بڑا دھوکہ کھایا۔“

”کیا....؟“

”اسے دراصل زکام ہو گیا تھا۔“

”تو پھر بھلا اس میں اس کا کیا قصور....!“ جولیا ہنس کر بولی۔

”قصور سراسر اسی کا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اسے بتادینا چاہئے تھا کہ وہ زکام میں مبتلا ہے۔ مگر

خیر حقیقت معلوم ہو جانے پر بھی مجھے اس سے نفرت ہی رہی۔“

”پھر نفرت کیوں رہی۔“

”اس لئے کہ زکام ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ ممنعتی رہی۔“

”تو پھر زکام ہی رہا ہو گا۔“

”خدا جانے....!“ حمید نے کہا۔ ”تم نے رستم و سہراب کا لکھا ہوا فردوسی نامہ پڑھا ہے؟“

”حمید سو راب چپ بھی رہو۔“ فریدی نے کہا۔

استے میں کافی آگئی اور وہ تینوں اپنی اپنی بیالیاں سیدھی کرنے لگے۔ کافی کے دوران میں

فریدی نے اپنا فائل کھول کر جولیا کے سامنے رکھ دیا۔

”ارے یہ تو آر تھر کی تصویر ہے۔“ جولیا ایک فارم میں چمکی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ

کر کے بولی۔

”ہوں....!“ فریدی نے دوسرے ورق الٹتے ہوئے کہا۔ ”اسے بھی دیکھا ہے کہیں؟“

”نہیں....!“ جولیا بولی اور فریدی نے دوسرے ورق الٹا۔ اس طرح وہ بدستور ورق الٹتا رہا۔

ایک جگہ جولیا بے اختیار چیخ پڑی۔

”یہ بھی تھا.... ان میں یہ بھی تھا اور زیادہ تر اس نے مجھ پر کوڑے برسائے ہیں۔“

”ٹھیک....!“ فریدی نے کہا اور سگڑا سگڑا لگا۔

جولیا نے پورا فائل الٹ دیا لیکن اور کسی تصویر کے متعلق اس نے کچھ نہیں کہا۔ فریدی

نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور کافی کی پیالی پکڑ کر پر خیال انداز میں سگڑا کے ہلکے ہلکے

کش لینے لگا۔

”میا تم نے ان کا پتہ لگایا ہے۔“ جولیا نے پراشتیاق لہجہ میں پوچھا۔

”ہاں.... لیکن ابھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انہوں نے یہ سب کیا کیوں؟ وہ اب بھی

تمہاری تلاش میں ہیں۔“

”تم انہیں پکڑ کیوں نہیں لیتے۔“

”اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ میں ان کے خلاف ثبوت کہاں سے مہیا کروں گا۔ اگر کسی

طرح آر تھر کی لاش مل جاتی تب بھی غنیمت تھا۔“

”کیا میری شہادت کافی نہ ہو گی۔“

”قطعاً نہیں.... عدالت تمہارے اس بیان پر ہرگز یقین نہ کرے گی کہ تمہاری شکل

تبدیل کر دی گئی ہے کیونکہ تمہارے خدوخال سو فیصد قدرتی معلوم ہوتے ہیں اور تم خواہ خواہ ایک

جہال میں پھنس جاؤ گی کہ تم بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے داخل کیسے ہو گئیں۔“

”جولیا خاموش ہو گئی۔“

کافی ختم کرنے کے بعد فریدی نے جولیا کو سونے کے لئے اوپری منزل میں بھیج دیا اور خود

باہر جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے حمید کو بھی تیار ہو جانے کو کہا۔ حمید طوعاً و کرہاً تیار

ہو گیا۔ اس وقت وہ کہیں باہر جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

راستے میں حمید نے فریدی سے کہا۔

”آپ کہہ رہے تھے کہ کسی عدالت کو جولیا کے بیان پر یقین نہیں آسکتا۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

”تو پھر آپ نے کیسے یقین کر لیا۔“

”اس لئے کہ اب میں یہ بات اچھی طرح جان گیا ہوں کہ اس واقعہ سے تعلق رکھنے والے

لوگ کپے سازشی ہیں۔ آر تھر کے متعلق میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ اب تمہیں اس کے ساتھی

کے پاس لئے چل رہا ہوں۔ اسی کے پاس جس کی تصویر جولیا نے شاخت کی تھی۔“

فریدی نے چرچ روڈ پر اپنی کار روک دی۔

”کیوں یہ وہی کیفے ہے نا جہاں تم نے میجر سلمان کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔“ فریدی

نے پوچھا۔

”کون میجر سلمان.....!“

”وہی جس کا تعاقب تم نے کیا تھا۔“

”اوہ ہاں.....!“ حمید نے کہا۔ ”یہی وہ کیفے ہے۔“

فریدی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ حمید بھی اس کے پیچھے تھا۔ یہاں قریب قریب ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ زیادہ تر لوگ شراب پی رہے تھے۔

حمید کی نظریں کاؤنٹر پر رک گئیں جہاں ایک دبلا پتلا آدمی کھڑا اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ پتھر قبل اس نے اس کی تصویر فائل میں دیکھی تھی۔

فریدی پر نظر پڑتے ہی وہ بے اختیار چونک پڑا۔ پھر اس نے کاؤنٹر کی کھڑکی کھولی اور تیز چلتا ہوا ان کے قریب آیا اور بولا۔

”فرمائیے سرکار.....!“ وہ قدرے جھک کر بولا۔ ”آج ہمیں کیسے عزت بخشی؟“

”مجھے آر تھر کا پتہ چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ تو..... ضرر..... ضروری نہیں کہ مجھے اس کا پتہ معلوم ہو۔“ اس نے کہا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں آج کل باعزت طور پر زندگی بسر کر رہا ہوں اور مجھے اب کسی کا پتہ نہیں معلوم۔“

”ہوں.....!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”مجھے دراصل اس سے ایک کام لینا تھا۔“

”اوہ حضور والا تو کون سا کام ہے۔ میں نہ کر سکوں گا۔ مجھ سے فرمائیے۔“

”تمہارے بس کا نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ میں جانتا ہوں کہ کون کیا کام کر سکتا ہے۔“

”کیا کسی کو بلیک میل کرتا ہے؟“

”ہاں.....!“

”ہاں تو یہ واقعی میں نہ کر سکوں گا۔“

”اچھا خیر، اگر آر تھر کہیں دکھائی دے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔“

”بہت بہتر.....!“

واپسی پر فریدی حمید سے کہہ رہا تھا۔

”اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ آر تھر سچ مچ مار ڈالا گیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”کیا تم نے غور کیا تھا کہ وہ ضرغام کا نام لیتے لیتے رہ گیا تھا، تم نے اسے چونکتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ اس نے ضرغام کے ”ضرر“ کو ضروری میں کھپا دیا تھا۔“



”تو بس اتنی سی بات کے لئے آپ یہاں دوڑ آئے تھے۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔ ”بظاہر تو تمہیں بھی یہی معلوم ہو گا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”باطن وہ ہر وقت چلتا ہی رہتا ہے۔“ حمید نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ فریدی کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”کہ آج گھر کی رکھوالی کرنے والے کتے بھی بند تھے۔“

”یعنی.....!“ حمید نے چونک کر پوچھا۔

”اور جس وقت ہم لوگ گھر سے روانہ ہوئے دو تین آدمی ہماری نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون تھے.....!“

”ضرغام کے ساتھی۔“

”تو کیا وہ اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ جو لیا ہمارے پاس ہے۔“

”قطعاً.....!“ فریدی نے کہا اور کار کی رفتار سست کر دی۔

”اور آپ جو لیا کو چھوڑ آئے ہیں۔“ حمید تقریباً چیخ کر بولا۔

”میں بہرہ نہیں ہوں۔“ فریدی ہونٹ سکڑ کر بولا۔

حمید دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

”اور رکھوالی کے کتے بھی بند ہیں۔“ اس نے پھر کہا۔

”ہاں.....!“ فریدی جھلا کر بولا۔ ”سینکڑوں بار سمجھا دیا کہ سمجھ میں آئی ہوئی بات کے متعلق دوبارہ مت پوچھا کرو۔“

”فی الحال شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے، فریدی نے پراطمینان لہجے میں کہا اور شاید اس کی ضرورت پڑے تو میرا ہی رویہ اور کافی ہوگا۔ ویسے میں بھی آج کل خون بہانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”لیکن آپ نے بازار میں ایک بیک یہ کیسے کہا تھا کہ کام بن گیا۔“
 ”اشارہ کیا تھا۔“
 ”نکس کو.....!“

”اپنے ایک آدمی کو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وحید، راجندر اور رمیش بھی میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔“

”لیکن اس بار آپ نے یہ کیسی بد پرہیزی کر ڈالی۔“ حمید نے کہا۔
 ”اس کیس میں بڑا پوچھایاؤ ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ضرغام ایک بہت بڑے گروہ کا سرغنہ ہے اور یہ سب کچھ مجھے اس کیس کے سلسلے میں معلوم ہوا ہے، ورنہ پہلے تو میں اسے کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔“

”انہیں کس طرح معلوم ہوا ہے کہ جولیا ہمارے پاس ہے۔“
 ”خود میں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا ہے۔“

”وہ کس طرح۔“ حمید نے بے چینی سے پوچھا اور اپنا پاپ ٹولنے لگا۔ ”نہیں حمید صاحب فی الحال تمباکو پینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“
 ”آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔“
 ”بھئی یہ لمبی داستان ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر مختصر آسنو۔ ضرغام کے آدمی اس دن سے میرے پیچھے لگ گئے تھے جس دن میں نے تمہیں میجر سلمان کا تعاقب کرنے کو کہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر ضرغام نے یہ جملہ برے ہی لئے کہا تھا کہ میں اسے دیکھ لوں گا۔ بہر حال اس دن سے وہ مجھے باقاعدہ دیکھ رہا ہے، ہاں تو اسی دن سے ایک دو آدمی برابر میرا تعاقب کر رہے ہیں، لیکن مکان کے کمپاؤنڈ میں قدم رکھنے کی ہمت کسی نے بھی کی نہیں۔ اس وقت تک انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ جولیا ہمارے پاس ہے۔ غالباً ضرغام اس خیال میں رہا ہوگا کہ کہیں میں کسی دیوانے کو پکڑ کر اس سے کچھ اگوانہ لوں،

”آپ نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ حمید گڑبڑ کر بولا۔

”کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔“ فریدی نے دانے ابرو کو جنبش دے کر کہا۔

”میں کہتا ہوں کہ آپ ایسی حالت میں اسے تنہا کیوں چھوڑ آئے ہیں۔“

”ہاں یہ سوال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ.....!“ فریدی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظریں دانے فٹ پاتھ پر ریگ، رہی تھیں۔ دفعتاً اس نے کار کی رفتار تیز کر دی اور پھر اسے ایک بالکل ہی غیر متعلق راستے پر موڑ دیا۔

”کیوں یہ کیا.....!“ حمید چونک کر بولا۔

”کام بن گیا۔“ فریدی نے کہا اور کار کو ایک تاریک گلی میں موڑ دیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ ایک سڑک پر آگئے۔ لیکن یہ سڑک بالکل سنسان تھی اور دیہی علاقوں سے گزرتی ہوئی سعید آباد کی طرف چلی گئی تھی۔

فریدی نے کار کو سڑک کے کنارے لگی ہوئی جھازیوں میں اتار دیا اور اسے موڑ کر اس کارخ پھر سڑک کی طرف کر دیا۔

”اس بیچاری کیڈی پر تو رحم کیجئے۔“ حمید نے کہا۔

”سب چلتا ہے۔“

”میں گاڑیوں کو خوبصورت رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”لیکن آخر یہ سب ہے کیا..... کون سا کام بن گیا۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”کام یہ بن گیا کہ انہوں نے جولیا پر قابو پایا ہے۔“

”اوہ.....!“

”شور مچانے کی ضرورت نہیں۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ اسے فریدی پر غصہ آ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ سمجھتا تھا کہ فریدی شاذ و نادر ہی کوئی غلط قدم اٹھاتا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ پانچ دن کی خاموشی دراصل طوفان سے قبل کی خاموشی تھی اور فریدی سچ سچ کوئی خطرناک اقدام کرنے جا رہا ہے۔

”میں رویہ اور نہیں لایا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

لہذا اس نے میرے پیچھے آدمی لگا دیئے۔“

”خیر آج کا لطیفہ سنو۔ مگر نہیں پہلے میں تمہاری الجھن کو بھی رفع کرتا چلوں۔ جولیا کو دوبارہ ان کے حوالے کر دینے میں ہمارا فائدہ ہی ہے اس طرح ہم یہ بھی معلوم کر سکیں گے کہ آخر انہوں نے اس کی صورت کیوں تبدیل کی۔“

”میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ اسے ماری ڈالیں۔“

”میرے بیٹے یہ ناممکن ہے۔“ فریدی خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ ”جولیا پر انہوں نے بہت محنت کی ہے۔ ایک بار پھر وہ اُسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔“

ڈاکٹر ضرغام خود کو اسی لئے محفوظ سمجھتا ہے کہ ابھی تک میرا ذہن اس تک پہنچائی نہیں اور آج کے واقعہ نے تو اس کا ذہن بالکل ہی صاف کر دیا ہوگا۔

”وہ کیا....؟“

”وہی تو بتانے جا رہا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہاں تو آج شام کو میں اور وحید کیفے ڈی فرانس میں کافی پی رہے تھے اور ہمارا ہمزاد یعنی ڈاکٹر ضرغام کے گروہ کا ایک آدمی بھی ہمارا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا اور میرے قریب ہی بیٹھا ایک کپ کافی پر اخبار لے کر ابھی رہا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں وحید سے گفتگو شروع کر دی۔“

”اوہ....!“ فریدی خاموش ہو کر کچھ سننے لگا۔ ”گاڑی کی آواز۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

چند لمحوں کے بعد حمید نے بھی کسی موٹر کے انجن کی گھڑ گھڑاہٹ سنی اور پھر اس کے دیکھنے ہی دیکھتے ایک بڑی سی دیو پیکر لاری ان کے سامنے سے گزر گئی جس کی ہیڈ لائٹس بھیجی ہوئی تھیں اور پیچھے حصے کی سرخ روشنی بھی غائب تھی۔ تھوڑی دیر بعد فریدی نے کار اشارت کر دی اور اسے سڑک پر نکال لایا۔

اس کی کیڑی بھی اندھیرے میں آگے بڑھ رہی تھی۔

”تو کیا اس لاری پر....!“ حمید نے پوچھا۔

”قطعاً....!“ فریدی بولا۔

”آپ یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔“

”انہوں نے لائٹ کیوں بجھا رکھی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور پھر میں اس لاری کو دن میں

بھی دیکھ چکا ہوں اور میں نے اس پر جھشید کو بھی دیکھا تھا۔“

”کون جھشید....!“

”وہی جس سے مل کر ابھی آرہے ہیں، اس کیفے کا مالک۔“

”مگر اندھیرے میں آپ نے لاری کو کیسے پہچان لیا....؟“

”ریڈیو کا ایریل تم نے کسی لاری یا بس میں آج تک نہ دیکھا ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ریڈیو نہیں بلکہ پرانے قسم کے ٹرانسمیٹر کا ایریل ہے۔“ لاری کی آواز گھڑ گھڑاہٹ قریب معلوم ہونے لگی تھی۔ اس لئے فریدی نے کار کی رفتار کچھ کم کر دی۔

”آپ نے وہ بات نہیں بتائی جو وحید سے کہی تھی۔“ حمید بولا۔

”لاری کی آواز پر کان رکھنا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہاں تو میں نے بلند آواز میں جولیا کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ آج

کلیں پاگل لڑکی میرے قبضہ میں ہے، جو مجھے تار جام کے راستے میں ملی تھی۔ وہ نہ جانے کیسی اوٹ ہانگ باتیں کرتی ہے۔ کہتی ہے میری صورت بدل گئی ہے۔ کبھی کہتی ہے، مجھے مت مارنا۔ میں نہیں اپنا غلام سمجھوں گی۔ اپنا پتہ نشان بھی نہیں بتاتی۔ میرا ارادہ ہے اُسے پاگل خانے بھجوا دوں وغیرہ وغیرہ۔“

فریدی تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر بولا۔

”میرا اندازہ قطعی درست نکلا۔ انہوں نے آج ہی اسے غائب کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میرے یہاں جولیا کی موجودگی سے ناواقف تھے اور ہاں پھر اس کے بعد میں نے ان بائوں کی بات چھیڑ کر کہا کہ پتہ نہیں کیوں آج کل شہر میں پاگلوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور اس نمائندہ جانے کیا راز ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن جولیا کا دوبارہ ان کے ہاتھ لگ جانا بہتر معلوم نہیں ہوتا۔“

”کیوں....؟“

”وہ اس سے ساری باتیں اگلا کر اسے قتل کر دیں گے۔“

”میں جولیا کو اتنا حق نہیں سمجھتا کہ وہ ساری باتیں اگل دے گی۔“

”یہ لاری کس کی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں نہیں بتاتا اور کیوں بتاؤں۔ آپ کون ہیں پوچھنے والے؟“

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ فریدی نے کہا اور ڈرائیور کی سیٹ پر چڑھ گیا۔ اس نے لاری میں لگے ہوئے ریڈیو پر ہاتھ پھیرا جس کا اوپری ڈھکن ایک جگہ ہاتھ لگتے ہی کھٹا کے ساتھ زمین پر آ رہا۔

”اوہ ٹرانسمیٹر....!“ فریدی نے ڈرائیور کو گھور کر کہا۔ ”میری جان تم مجرم ہو۔ اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس۔“ ڈرائیور کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”خبردار ہاتھ اوپر اٹھاؤ....!“ فریدی نے اس کا ہاتھ جیب کی طرف جاتے دیکھ کر ریوالور نکال لیا۔ ”پیچھے ہٹو....!“ فریدی نیچے اترا آیا۔

”آگے بڑھو....!“ وہ اسے اپنی کار کی طرف لے جا رہا تھا۔ دفعتاً کسی طرف سے فائر ہوا اور ڈرائیور چیخ مار کر گر پڑا۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا اور اس کی پیٹھ سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ فریدی اچھل کر اپنی کار کی اوٹ میں ہو گیا اور اس کے پستول سے بھی ایک شعلہ نکلا۔ پھر اس نے لاری کے اشارٹ ہونے کی آواز سنی۔ حمید بھی دوڑ پڑا تھا۔ فریدی نے بیٹھے بیٹھے دوسرا فائر کیا لیکن لاری چل پڑی تھی۔

فریدی نے اپنی کار اس کے پیچھے لگادی۔ لیکن تھوڑی دور گیا تھا کہ پورا جنگل فائروں سے گونجنے لگا۔ ایک گولی کار کے شیشے سے بھی ٹکرائی۔ فریدی بال بال بچا۔ لیکن حمید کی پیشانی شیشے کے ٹکڑوں سے زخمی ہو گئی۔ اگر اس نے سر نہ جھکا لیا ہو تا تو شاید آنکھوں ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ پھر کیڈی کے دونوں پچھلے نائز زور دار دھماکوں کے ساتھ پھٹ گئے۔ فریدی نے پھرتی سے کار روکی اور پھر حمید کا ہاتھ پکڑ کر جھاڑیوں میں کود گیا۔ ابھی تک برابر فائر ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا کہ چار پانچ متحرک سائے آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”خبردار....!“ انہوں نے ایک آواز سنی۔ ”اپنا ریوالور باہر پھینک دو۔“

”آخر آپ اس کے متعلق اتنی خود اعتمادی کے ساتھ کیوں باتیں کر رہے ہیں؟“

”اس لئے کہ وہ بھی اس پلان میں شریک ہے۔“

”کیا مطلب....!“ حمید چونک کر بولا۔

”میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ میں دوبارہ اسے ان لوگوں میں پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”اس نے انکار نہیں کیا۔“ حمید نے محجبانہ انداز میں پوچھا۔

”اسے پوری بات سمجھادی تھی نا؟ اب وہ ان کے سامنے شاندار اداکاری کا مظاہرہ کرے گی۔“

”کیسی اداکاری۔“

”پاگل پن کی....!“ فریدی نے کہا۔

”اور میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ بے چوں و چراں ان کے احکام کی تعمیل کرتی رہے گی۔“

”آپ کچھ کہیں، لیکن مجھے تو اس کی خیریت نظر نہیں آتی۔“

”تم ڈیوٹ ہو.... ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ تم اسے میری محبوبہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اگر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ تمہیں اپنے گھر سے نکلوانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ار لئے تمہاری عقل کی تو سند نہیں۔“

”پھر آپ کیوں مجھ جیسے اُلو کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔“ حمید گڑ گڑا کر بولا۔

”محض اس لئے کہ کوئی مادہ اُلو مل جائے تو تمہارے ساتھ جوڑ دوں۔“

دفعتاً آگے جانے والی لاری کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں اور پچھلی سرخ روشنی بھی نظر آ گئی۔ وہ رکی ہوئی تھی۔ اگر فریدی پھرتی سے بریک نہ لگاتا تو اس کی کیڈی لاری سے ٹکرائی ہوتی اس نے روشنی میں دیکھا کہ ڈرائیور انجن کھولے اس پر جھکا ہوا ہے۔ حمید نے گردن اونچی کر لاری کے اندر بھی روشنی تھی لیکن وہ خالی پڑی تھی۔ فریدی کے ہونٹ بھیج گئے۔ وہ کار سے اُتار آیا اور ڈرائیور کے قریب جا کر بولا۔

”تم نے سچ سڑک لاری کیوں کھڑی کر رکھی ہے۔“

”پٹرول ختم ہو گیا ہے صاحب۔“ ڈرائیور درشت لہجے میں بولا۔

فریدی کی نظریں لاری کے اندر بھٹک رہی تھیں۔

”چلے آؤ چپ چاپ۔ الو کہیں کے۔“ وہ ہنس رہا تھا۔



دوسری دن صبح حمید بہت زیادہ بور نظر آرہا تھا۔ پچھلی رات کی بدحواسیاں ابھی تک اس کے بن پر چھائی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھاگ بھاگ پیدل چل کر گھر تک پہنچے۔ حمید تو دو ایک جگہ گرا ی تھا اور چوٹیں بھی کھائی تھیں۔ لیکن وہ سب معمولی تھیں۔

فریدی کا موڈ زیادہ خراب تھا۔ شاید یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے بُری طرح است کھائی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے ایک کپ کافی منگوائی تھی، جو رکھے ہی رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ادھ جلا سگار اس کی انگلیوں میں دبا وا تھا اور اب اس میں سے دھوئیں کی لکیر بھی نہیں نکل رہی تھی۔

”اب ایشیا کا شر لاک ہو مز کیا سوچ رہا ہے۔“ حمید نے بیٹھے بیٹھے چٹکی لی۔

فریدی نیم باز آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر کچھ اس قسم کی مسکراہٹ تھی جیسے اس وقت مسکرانے میں بھی کاہلی محسوس کر رہا ہو۔

”مجھے شر لاک ہو مز کہہ کر میری توہین نہ کرو۔“ اس نے مضحل آواز میں کہا۔

”حرکت تو آپ سے اسی قسم کی سرزد ہوئی ہے اور اب دل چاہتا ہے کہ آپ کو آرام کرسی والے سراغ رساں کا خطاب دیا جائے۔“

”دل کھول کر کہہ لو فرزند ارجمند.... میں بھی انسان ہی ہوں۔ آخر تم مجھ سے غلطی کی توقع کیوں نہیں رکھتے۔“

”تو بہر حال آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”تم اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے تم نے سچ مچ میری غلطی پکڑ لی ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ میں نے غلطی کہاں پر کی ہے۔“

”آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے وہ کوئی بڑی ڈھکی چھپی غلطی ہو۔“

”بتاؤ نا آخر....!“ فریدی نے بجا ہوا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ اب وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے چہرے سے کاہلی اور تھکن کے آثار بالکل غائب ہو گئے تھے۔

”کسی چھوٹے غلام کے بچے سے رجوع فرمائیے۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔

انہوں نے خالی کار کو اپنے نرغے میں لے لیا اور شاید ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

”یار بڑی چوٹ ہو گئی۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن وہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے۔“

دوسری طرف سڑک پر وہ لوگ نارنج کی روشنی میں کار کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

”کیوں کیا کہتے ہو؟“ فریدی نے کہا۔ ”بادوں ان کی جہالت....؟“

”میرے خیال میں چپ چاپ چلئے۔“ حمید بولا۔ ”اب تو کار بھی بے کار ہو چکی ہے۔“

”بہر حال بڑی زبردست چوٹ ہو گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ آج سے میں بھی اپنا شمار احمقوں میں کروں۔“

”بہت پہلے سوچتی تھی یہ بات۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔ ”یہ شکست بھی زندگی بھر یاد رہے گی۔“

”تلاش کرو۔“ کار کے قریب کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے گرج کر کہا۔ دونوں دور تک گھنی جھاڑیوں میں گھستے چلے گئے۔

”گھبراؤ نہیں فرزند۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ جنگل میرا جانا بوجھا ہے۔“

ایک گولی ان کے سروں پر سے سنسنائی ہوئی نکل گئی اور پھر سارا جنگل رائفوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

فریدی نے پھر ریو اور نکال لیا۔

”کیا کر رہے ہیں آپ۔“ حمید اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”مفت میں جان دینے سے کیا فائدہ۔“

”عادت.... مجبور ہوں۔ گولیوں کی آواز سن کر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔“

”خدا ار میرے اور اپنے ہونے والے بال بچوں پر ترس کھائیے۔“

”چپ....!“ فریدی نے کہا اور آوازوں کی طرف فائر کر دیا۔ ایک چیخ سنائی دی اور فریدی بڑبڑایا۔ ”ہات تیرے کی۔“

پھر اس نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنا شروع کر دیا۔

دفعتاً فریدی نے ایک زوردار چیخ ماری اور راستہ کاٹ کر جھاڑیوں کے دوسرے سلسلے میں گھس گیا۔

”کیا ہوا....!“ حمید گھبرا کر بولا۔

”میں تمہیں اس سے زیادہ نہیں سمجھتا۔“

”اچھا تو چھٹکارا....!“ حمید تھلا کر بولا۔ ”آپ نے جولیا کو ان کے حوالے کل کے بلی ہنڈل گلتی کی ہے۔“

”خدا کی قسم ایک سال کا بچہ بھی یہی کہتا۔“

حمید منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے دراصل حبشید سے مل کر بڑی غلطی کی ہے۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔

مجھے اس سے نہ ملنا چاہئے تھا اور پھر آر تھر کے تذکرے نے انہیں بہت بُری طرح چونکا دیا

ہو گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے ضرغام کو اپنی خطرناک پوزیشن کا خیال بھی آ گیا ہو۔ ایک گھونے

میں کسی کا سر پھوڑ دینا بڑی حیرت انگیز حرکت ہے۔ اس قسم کے واقعات ساری زندگی یاد رہے

ہیں۔ ضرغام کو کم از کم اس کے متعلق تو یقین ہو گیا ہو گا کہ جولیا نے اس کا تذکرہ مجھ سے ضرور کیا

ہو گا۔ لاری کا اس طرح خالی ہو جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ضرغام تو کم از کم میری اسکیم

سے واقف ہو گیا تھا اور وہ لاری.... مجھے دھوکہ دینے کے لئے شروع ہی سے خالی رکھی گئی تھی۔

جولیا کو وہ لوگ کسی اور راستے سے لے گئے، لیکن انہوں نے غلطی سے اس میں ٹرانسمیٹر لگا رہے

دیا ورنہ انہیں اتنی گولیاں بھی برباد نہ کرنی پڑتیں اور میں سیدھا سادھا الو ہونا ہو اگھر واپس آ جاتا۔

حمید خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”بہر حال اب جولیا کی خیریت نظر نہیں آتی۔“ حمید مضطربانہ انداز میں بولا۔

”اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”تو پھر اب کیا کریں گے۔“

”ضرغام کی نگرانی جاری ہے۔“ فریدی تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”مفت میں ایک دوسرا خون

اور ہوا۔ میری گولی ٹھیک نشانہ پر بیٹھی تھی۔“

”مگر وہاں جنگل میں کوئی لاش نہیں ملی۔ حتیٰ کہ خون کے دھبے بھی مٹا دیے گئے ہیں۔“

”آپ کو کس طرح معلوم ہوا۔“ حمید نے کہا۔

”یہ قوف آدمی میں تمہاری طرح سوتا نہیں رہا۔ آخر گاڑی کی تلاش میں بھی تو جانا ہی تھا۔“

”تو کیا وہ مل گئی۔“ حمید نے پوچھا۔

”قطعاً مل گئی ہے۔“

”کہاں ہے۔“

”میراج میں۔“

”اتنی جلدی لائے کس طرح۔ اس کے تو دونوں نائز پھٹ گئے تھے۔“ فریدی ہنسنے لگا۔

”آؤ میرے ساتھ....!“ فریدی اٹھتے ہوئے بولا۔

وہ اسے گیراج میں لایا۔ کیڑی وہیں کھڑی تھی۔ اس کے دونوں نائز بالکل صحیح و سالم تھے۔

”ارے....!“ حمید کی نظریں بے ساختہ ونڈا سکرین کی طرف اٹھ گئیں۔ ”یہ ٹوٹ گیا تھا۔“

”اچھی طرح یاد ہے اور اس کے ٹکڑوں سے میری پیشانی زخمی ہوئی تھی۔“

”قطعاً ٹوٹ گیا تھا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”پھر اتنی جلدی۔“

”حمید صاحب وہ بڑے ذہین لوگ ہیں۔“ فریدی نے قہقہہ لگایا۔

”یہ مجھے اسی جگہ اسی حالت میں ملی ہے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”مگر اس پر نائز بھی چڑھا دیئے گئے ہیں۔“

”تب تو یقیناً وہ لوگ پاگل ہیں۔ جولیا ٹھیک کہتی ہے۔“

”وہ تو نہیں لیکن تم ضرور پاگل ہو۔“

”کیوں....!“

”انہوں نے میرے منہ پر وہ چائٹا مارا ہے کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔“

حمید تمحیرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”انہوں نے کل رات کے حادثہ کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔

لہذا میں سرکاری طور پر اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ حد ہو گئی۔ بعض درختوں کے تنے

بچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح انہوں نے ان پر لگی ہوئی گولیوں کے

نشانات مٹائے ہیں اور نشانات کچھ اس قسم کے بنائے گئے ہیں جیسے کسی نے درختوں کی گوند اکٹھا

کرنے کے لئے ان کے تنے چھیل دیئے ہوں۔ حمید صاحب بڑا منظم گروہ ہے بلکہ اسے بین

الاقوامی گروہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہنگری میں انہوں نے شومان نامی آدمی سے کام لیا تھا۔
حمید بُری طرح چکر اگیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فریدی اس طرح شکست کھائے
اور اس شکست کے افسوس سے زیادہ اسے جولیا کے انجام کا خیال ستا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے
زندہ نہ چھوڑا ہوگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر فریدی کو اسے دوبارہ ان لوگوں تک پہنچانا تھا تو اس کے
لئے خود اس کا گھر موزوں نہیں تھا۔ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ کام بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اسے
گھومنے پھرنے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا اور پھر اس طرح وہ ان لوگوں تک پہنچ ہی جائے
کیونکہ ان کے آدمی سارے شہر میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس صورت میں پردہ نشین عورتوں کے
نقاب بھی نہ نوچے جاتے۔“

”تو اب فی الحال آپ کے ذہن میں کوئی سکیم نہیں۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔
”فی الحال میرا ذہن کسی جھیل کی سطح کی طرح صاف ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اور اگر
پر رنگین خیالات کی سبک رفتار بطین تیر رہی ہیں۔“

”آپ جیسا اذیت پسند بھی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔
”زندگی میں ایسے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں۔“ فریدی نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”اگر
آدمی ہر ایک پر مغموں ہو کر بیٹھ جائے تو اسے میری ترقی میری فانی بدیونی کہیں گے۔“

”آپ کے لہجے میں سفاکی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے اس بے چاری...!“
”مجھے بھی اس سے ہمدردی ہے۔“ فریدی اس کی بات کاٹ کر بولا۔
”لیکن تم ہی بتاؤ کہ ایسی صورت میں کیا ہو سکتا ہے۔“

”اس کی حفاظت...!“ حمید بولا۔
”اس کی طرف سے تو میں قطعی مطمئن ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
”نہ جانے آپ کس بناء پر مطمئن ہیں۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”یہ نہ بھولو کہ اسے اس کام کے لئے ہنگری سے لایا گیا تھا۔ بھلا ہنگری ہی کیوں یورپ کا
کوئی اور ملک کیوں نہیں اور انہوں نے تفرینا محض تجربے کے لئے اس کی شکل تبدیل کی تھی تو
اس کے لئے اتنے لمبے سفر کی کیا ضرورت تھی۔ یہیں سے کسی لڑکی کو پکڑ لیتے۔ کسی بد صورت
لڑکی کو جسے اپنی بد صورتی کا غم رہا ہوتا۔ بد صورت لڑکیاں عموماً اپنی بد صورتی پر مغموں رہا کرتی

کوئی نہ کوئی اس قسم کی بد صورت لڑکی نہایت آسانی سے اس تجربے کے لئے تیار ہو جاتی۔“
حمید خاموشی سے فریدی کی طرف دیکھتا رہا۔ فریدی کی یہ دلیل اس کے ذہن میں جڑ پکڑنے
نہی۔ وہ خود سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی ہنگری سے کیوں لائی گئی۔

”بہر حال...!“ فریدی بولا۔ ”وہ قطعی محفوظ ہے اور میری ہدایت کے مطابق وہ ان کے
پر عمل کر رہی ہوگی۔“

”وہ سب کچھ بے چون و چرا سیکھ رہی ہوگی، جو وہ اُسے سکھانا چاہتے ہیں۔“ حمید سوالیہ انداز
بولا۔

”اچھا تو کیا اب تک تم انہیں پاگل ہی سمجھ رہے ہو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ بدستور خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سازش کا کیا مطلب
سکتا ہے۔ بہتری سازشوں سے اس کا سابقہ پڑچکا تھا۔ لیکن ایسی سازش سے دوچار ہونے کا پہلا

فائق تھا اور وہ تذبذب میں تھا کہ اس سازش کا پتہ لگانے میں کامیاب بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔
ب سے زیادہ الجھن اسے اس بات کی تھی کہ ابھی تک اس کیس کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں

نہی۔ ناشتے کی میز پر وہ دونوں خاموش رہے اور آفس جاتے وقت راستے میں بھی ان میں کوئی
نقلمو نہیں ہوئی۔ فریدی کے ماتھے پر سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں اور وہ بار بار کیڈی کے سیٹ پر پہلو

بل رہا تھا۔ حمید کو یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ خود اپنی زندگی میں کبھی اتنا سنجیدہ ہوا ہو۔ اسے صحیح
منوں میں جولیا سے ہمدردی تھی۔ اکثر راتوں میں جب وہ کروٹ لیتے وقت کراہتی تو اس کے

ذہن میں کوڑے کے نیلے اور سیاہ داغ ابھر آتے۔ ایک رات اس نے اسے بے خبری میں روتے سنا
تھا جب وہ جگائی گئی تو اس نے یہ سن کر ہنسا شروع کر دیا تھا کہ وہ نیند میں رورہی تھی۔ حمید کو اس

وقت ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسا مار دیا ہو۔ کتنی خوش مزاج لڑکی تھی۔ ہو سکتا ہے
کہ اپنی اصل شکل میں اور زیادہ حسین لگتی رہی ہو۔ اس کے ساتھ کتنی بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی لیکن

وہ پھر بھی ہنستی تھی۔ بے تحاشہ قمقمے لگاتی تھی اور ہنستے وقت شاید یہ بھول جاتی کہ وہ اپنے وطن
سے کالے کوسوں دور پڑی ہوئی انجانے حادثات کے تھیزوں میں ادھر ادھر بہتی پھر رہی ہے۔

حمید نے ایک سسکی سی سی اور کھڑکی پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ آفس میں پہنچ کر وہ دونوں
اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ حمید کی میز فریدی کی میز سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ سر جھکائے

فالکوں میں دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے ماتھے پر ابھری ہوئی سلوٹیں اور آنکھوں کی بے چینی صاف بتا رہی تھی کہ اس کا ذہن فالکوں سے کہیں دور بھٹک رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چڑیا فریدی کی میز پر فائل رکھ گیا جس پر اشد ضروری کی سلف لکھی ہوئی تھی۔ فریدی نے دوسرے فائل الگ رکھ دیئے اور نئے آئے ہوئے فالکوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دفعتاً حمید نے اسے بے تحاشہ چونکتے ہوئے دیکھا۔

”اوہ میرے خدا....!“ فریدی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور فائل بند کرنے کے بعد سر پڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ خالی نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسی دیرانی حمید نے اس کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے سارے جسم میں خوف کی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ قبل اس کے کہ وہ فریدی کو مخاطب کرتا۔ فریدی فائل اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ پھر حمید نے اسے ڈی آئی جی کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ حمید اس کے غیر متوقع رویہ کے متعلق الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے کبھی فریدی کو اتنے تھیر کے عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ حمید بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ فریدی واپس آیا تو اس کے چہرے سے فکر مندی کے سارے اثرات دور ہو چکے تھے اور اس کی آنکھوں میں پہلے جیسی خود اعتمادی کی جھلک نمایاں تھی۔

”آؤ چلیں۔“ وہ حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ وہ فائل ابھی تک اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

”کہاں؟ اور یہ فائل؟“

”ہم گھر چل رہے ہیں۔“ فریدی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ حمید چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس کی الجھن اور بڑھ گئی۔

”میں تمہیں خوش نظر آ رہا ہوں نا....!“ فریدی نے کار اشارت کرتے ہوئے حمید سے پوچھا۔ سوال بڑا عجیب سا تھا۔ بہر حال حمید صرف بے دلی سے سر کو ہلا کر رہ گیا۔ ”میں تمہیں کچھ بے وقوف بھی معلوم ہو رہا ہوں گا۔“

”میں اس وقت ہنسنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ حمید بے زاری سے بولا۔

”افوہ.... میں آج تمہاری زبان سے یہ کیا سن رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”کہیں میں خوشی کے مارے عقل مند نہ ہو جاؤں۔“

”آخر آپ یک یک چپکنے کیوں لگے؟“ حمید نے زہر لیے لہجے میں کہا۔

”مجھے اپنی شکست پر رونا نہیں آتا۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیونکہ وہ میری ہی طرح ہیں۔ اگر ہونٹ سور کی تھو تھنی جیسے ہوتے تو میں انہیں کاٹ کر پھینک نہ دیتا۔“

”تو اس وقت تو آپ کسی علامہ دل جلے ادیب کی سی باتیں کر رہے ہیں۔“

”حمید بیٹے میں دنیا کا احق ترین آدمی ہوں۔“

”کتنی بار دہرایئے گا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔ ”لیکن میں اس وقت وجہ پا پوچھوں گا۔“

”تم پوچھو یا نہ پوچھو....! اس وقت میں اپنی حماقتوں کا قصیدہ پڑھنے کیلئے بے تاب ہوں۔“

”شاید آج آپ نے بھی کچھ شوق فرمایا ہے۔“

”نہیں پیدارے میں نشے میں نہیں ہوں، بلکہ اس پیلے عقاب کی حیثیت مجھ پر روشن ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب....!“ حمید یک بیک سنجیدہ ہو کر بولا۔

”پیلے عقاب بوہیمیا کے خاندان کے امتیازی نشان ہے۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا تھا۔“

”یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ لیکن میرے ذہن نے اتنی لمبی جست لگانے سے انکار کر دیا۔ لاکھ جولیا کا ہنگری سے تعلق ہونا اس کے سو فیصدی امکانات پیدا کر رہا تھا۔ مگر انسانی ذہن ہے نوک کہ کھائی گیا۔“

”آخر آپ صاف کیوں نہیں بتاتے۔“

”اس فائل کو دیکھو....!“ فریدی نے کہا۔

حمید فائل کھولتے ہی اچھل پڑا۔ اس کی نظریں ایک تصویر اور اس کے نیچے کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

”ارے یہ تو جو لیا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ ”مگر.... مگر....!“

”جی نہیں....!“ فریدی کے ہونٹوں پر ایک خشک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”بوہیمیا کی شہزادی بورا زیانہ۔“

”مگر یہ تو ج.... جولیا....!“ حمید پھر ہلکایا۔

”نہیں جناب بوہیمیا کی شہزادی بورا زیانہ۔“ فریدی ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”جولیا کو اس کا ہم

شکل بنایا گیا ہے۔ آگے دیکھو اس کے باپ کی تصویر ہے، جو بوہمیا کا موجودہ حکمران ہے۔“
”میں سمجھ گیا.... بالکل سمجھ گیا۔“ حمید بے اختیار چیخ پڑا۔

”کیا سمجھ گیا....؟“

”اصلی شہزادی بور ازیانہ کو غائب کر کے اس کی ہم شکل جولیا کو نقلی شہزادی بنایا جائے گا۔“
”یہ تو میں بھی سمجھ گیا ہوں۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”لیکن اس میں کئی زبردست گتھیاں ہیں جن کا سلجھانا فی الحال بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ٹھہرو جلدی نہ کرو۔ گھر پہنچ کر اطمینان سے گفتگو کریں گے۔ ابھی بہت وقت ہے۔“



گھر پہنچ کر فریدی نے باورچی سے کافی بنانے کو کہا اور غسل کرنے چلا گیا۔ حمید کی جھنجھلاہٹ پھر بڑھ گئی۔ وہ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس معاملے کے صاف ہو جانے کے باوجود کون سی گتھیاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا سلجھانا فریدی کی دانست میں آسماں نہیں۔ فریدی غسل سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر جم گیا۔ کافی تیار ہو چکی تھی۔ کیتلی سے اٹنے والی بھاپ کے ساتھ ساتھ اس کی ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ فریدی نے ایک کپ حمید کے آگے سرکادیا۔ اس کے انداز سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس نے کچھ دیر قبل کوئی بات ادھوری نہیں چھوڑی تھی۔

حمید کا غصہ تیز ہو گیا۔ فریدی اس کی طرف نکلیوں سے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”اب اس دزدیدہ نگاہی میں جان نہیں رہ گئی۔“ حمید جل کر بولا۔

”ایسا نہ کہو ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“ فریدی نے خاص رومانی انداز میں کہا۔

”میں کہتا ہوں وہ گتھیاں۔“

”میں پوچھتا ہوں تم نے فائل کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔“

”کر لیا....!“

”کیا سمجھ گیا....!“

”وہی جو کچھ پہلے کہہ چکا ہوں۔“

”اس کے علاوہ کوئی قابل اعتراض بات۔“

”کوئی نہیں....!“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”تب تو تم پر ہزار بار پھٹکار....!“ فریدی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ”میں تمہیں اتنا بدھو نہیں

بھتا تھا۔ آخر تمہارے والدین نے تمہارا نام اُلو کیوں نہیں رکھا۔“

”بد نصیبی ہے آپ کی۔“

”نہیں میں اکثر سنجیدگی سے اس بات پر غور کرتا ہوں کہ تم روز بروز گاؤ دی کیوں ہوتے

بارہے ہو۔“

”اس مسئلے پر پھر کبھی غور کر لیجئے گا۔“ حمید ہونٹ سکڑ کر بولا۔

”خیر کافی پیو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی.... ذرا ادھر سے سگار اٹھا دینا۔“

فریدی نے تھوڑے توقف کے بعد سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”جب کہیں کا کوئی بادشاہ یا حاکم کسی دوسرے ملک جاتا ہے تو اس کے استقبال کی کتنی تیاریاں ہوتی ہیں اور تم نے کبھی کسی مملکت کے وزیر اعظم یا بادشاہ کے متعلق یہ نہیں سنا ہو گا کہ اس نے کسی دوسرے ملک کی حکومت سے یہ استدعا کی ہو کہ اس کی آمد کو راز میں رکھا جائے۔ نہ تو اخبارات میں خبریں شائع ہوں اور نہ ان کی تصاویر، استقبال بھی نہ کیا جائے۔“

”واقعی ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا۔“ حمید نے کہا۔

”تم نے فائل کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔“ فریدی اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”شروع سے اب

تک بور ازیانہ کی تصویر دیکھتے رہے۔ نہ جانے کب آدمی بنو گے یا۔ اب میں تمہیں سچ مچ کتوں کے

ساتھ باندھنا شروع کر دوں گا۔“

”اس وقت آپ پر اتنی عقلمندی کیوں سوار ہو گئی ہے۔“ حمید بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ”اپنا بیان

جاری رکھئے۔“

”اوہو یہ انداز۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”خیر تم نے فائل کا مطالعہ نہیں کیا۔ بوہمیا کا

بادشاہ اپنی لڑکی سمیت اس طرح ہمارے ملک میں داخل ہو رہا ہے۔ مقصد سیر و سیاحت ہے۔ اس

رازداری کے لئے اس نے جو عذر لنگ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ پریس کے نمائندوں کی بھیڑ

بھاڑ سے گھبراتا ہے۔ سیر و سیاحت میں وہ استقبال جیسے رسمی ڈھکوسوں کا قائل نہیں، ایسے موقعوں

پر وہ ایک معمولی انسان کی طرح لطف اٹھانا چاہتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”بہترے بڑے آدمی یہی چاہتے ہیں۔“

”چاہتے ہوں گے۔“ فریدی بچھا ہوا سرگارسا کر بولا۔ ”لیکن بیسویں صدی کے بادشاہوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔“

”مگر دنیا کا ہر انسان چاہے چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو بعض اوقات یہی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر دلچسپی میں دل کھول کر آزادی سے حصہ لے سکے۔ ممکن ہے وہ آج کل عام ذہنی سطح پر آگیا ہو۔“ حمید نے کہا۔

”قطعی ناممکن ہے۔ ذہنی سطح اور چیز ہے۔ اسے بعض اوقات خیالات ہی تک محدود رہنا پڑتا ہے۔ بعض مجبوریوں اسے عملی جامہ نہیں پہننے دیتیں۔ بادشاہوں کے ساتھ جان کا خوف بھی تو لگا رہتا ہے۔“

”تو گویا آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ بھی نقلی ہے۔“

”میں یہ قطعی ثابت نہیں کرنا چاہتا۔“ فریدی نے کہا۔

”اصلی ہو یا نقلی اسے جان کا خوف تو ہونا ہی چاہئے۔“

”دوسری بات....!“ حمید اپنے پائپ میں تمباکو بھرتا ہوا بولا۔

”ممکن ہے اسے اس سازش کا علم ہو گیا ہو۔ اس لئے اس نے احتیاطی اقدام کے طور پر اپنی

آمد کو راز میں رکھنے کی استدعا کی ہو۔“

”کوئی زیادہ دور کی نہیں لائے۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”اگر اسے سازش کا علم ہو گیا تھا تو

وہ یہاں آیا ہی کیوں اور پھر اس نے یہ استدعا قاہرہ کے دوران قیام کی ہے، وہ اپنے ملک سے روانگی کے بعد قاہرہ میں بھی ٹھہرا ہے اب یہ بتاؤ کہ اس نے یہ استدعا اپنے ملک سے روانگی کے وقت کیوں نہیں کی تھی ہاں.... ہاں....!“

”اس سے تو میرے نظریے کو تقویت پہنچتی ہے۔“ حمید میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

”یعنی....!“

”یعنی یہ کہ اسے اس سازش کا علم قاہرہ کے دوران قیام میں ہوا۔“

”تب تو اسے وہیں سے واپس لوٹ جانا چاہئے تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”تم سچ سچ بعض اوقات بچوں کی سی باتیں کرنے لگ جاتے ہو۔ ارے میاں اگر وہ اس سازش

م ہو جانے کے بعد بھی یہاں آ رہا ہے تو اس سے بڑا پاگل شاید روئے زمین پر نہ مل سکے اور پھر سری بات یہ کہ اگر اس پر سیر و سیاحت کا بھوت اس طرح سوار تھا تو اس نے یہ خواہش کیوں کی کہ اس کے لئے مخصوص انتظامات نہ کئے جائیں۔ ایسی صورت میں تو اسے اپنی حفاظت کے لئے فوج کا ایک پورا دستہ مانگنا چاہئے تھا۔“

حمید سچ چکر اکر رہ گیا۔

فریدی کے دلائل بہت وزنی تھے، لیکن وہ تو بادشاہ کے نقلی ہونے کے متعلق بھی کوئی بات بنی کے ساتھ کہنے سے انکار کر چکا تھا۔ پھر آخر اس گورکھ دھندے کا کیا مطلب؟

حمید کو خاموش دیکھ کر فریدی ہنس پڑا۔

”یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے جتنا تم سمجھتے ہو۔“ اس نے دوسری پیالی لبریز کرتے

کے کہا۔ ”اور پیو! ابھی کافی وقت ہے۔“

”کیسا وقت....!“ حمید نے کہا۔

”ان کا جہاز یہاں اب چار بج کر پچیس منٹ پر پہنچ رہا ہے۔“

”آج ہی؟“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں.... ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ فکر مت کرو۔“

”تو آپ کیا کریں گے؟“

”پھر وہی احمقوں کی سی باتیں، ارے یہ فائل میرے سپرد کیوں کیا گیا ہے۔“

”تو گویا قرعہ فال بنام من دیوانہ نردند....!“ حمید نے ہونٹ بھیٹتے ہوئے کہا۔

”قطعی....!“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”ان کی محافظت ہمارے ہی ذمے آ پڑی ہے۔“

”مگر انہوں نے تو استدعا کی ہے۔“

”کی ہوگی۔“ فریدی نے کہا۔ ”ہماری حکومت ان کی طرف سے مطمئن نظر نہیں آتی۔“

”کیا کیا فلا بازیاں کھائی ہیں.... اس کیس نے بھی۔“

”دیکھو ابھی اور کتنی کھاتا ہے۔“

”سچ سچ عقل چکر اگئی ہے۔“

اگر میں نے پہلے عقاب کو صحیح معنوں میں اہمیت دی ہوتی تو بہتیری گھٹیل اسی وقت سلجھ جاتیں۔“

”وہ کس طرح۔“ حمید نے پوچھا۔

”قوی اور خاندانی نشان کی انسائیکلو پیڈیا میں‘ میں نے اس کے متعلق پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ کاش مجھے یہ بھی معلوم ہو تاکہ بوہیمیا کی آئندہ حکمران لڑکی ہوگی۔ بورازیانہ کا نام میں نے جو لیا کی زبانی سنا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے اسے اہمیت نہ دی۔“

”تعب ہے کہ آپ اتنا بھی نہیں جانتے تھے۔“

”تو گویا آپ جانتے تھے۔“ فریدی نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔

”میں بھلا کیا جانتا۔ میں تو ٹھہرا ایک گاؤں۔“

”اور میں کونن ڈائیل کے مضحکہ خیز جاسوس شرلاک ہومز کی طرح ہمہ داں ہوں، جو آنکھ

بند کر کے اور سزا سا پاپ منہ میں دبا کر ساری دنیا کے حالات بتا دیا کرتا تھا۔“

”پھر بھی آپ کو اتنا تو معلوم ہونا چاہئے تھا۔“

”بوہیمیا جیسے بہترے پس ماندہ ملکوں کے متعلق میں بھی کچھ نہیں جانتا۔“

”تب آپ ایک اچھے سراغ رساں نہیں بن سکتے۔“ حمید اسے تاؤ دلانے لگا۔

”شکریہ....!“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”اب میں ایک اچھا سراغ رساں بننے کی کوشش کروں

گا۔ اچھا بھئی.... اب اٹھو، چلنے سے پہلے ہم تھوڑا سا میک اپ بھی کریں گے۔ کیونکہ وہاں

ضرغام کے آدمی ضرور ہوں گے۔“

”مگر افسوس ہے کہ آپ بوہیمیا....!“ حمید اٹھتے ہوئے بولا۔

فریدی ہنس پڑا۔

”بننے کی بات نہیں واقعی افسوس معلوم ہوتا ہے۔“

”افسوس تو مجھے بھی ہے جلدی کرو۔“

دونوں نے اپنی شکلیں تبدیل کیں۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کے چشمے لگائے اور ایک

نیکیسی کر کے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی ساڑھے تین بجے تھے اور جہاز آنے میں

پچیس منٹ کی دیر تھی۔ یہ لوگ سب سے پہلے مسافروں کے کمروں کی طرف گئے جن میں بہت

زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ فریدی مجسمانہ انداز میں ہر ایک کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر

بعد وہ باہر نکل آئے۔

”ابھی تو خیریت نظر آئی ہے۔“ فریدی نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ جہاز کی آمد میں ف پچیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔

”کیا وہ کسی خاص ہوائی جہاز سے آرہے ہیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”میں ایک معمولی مسافر بردار جہاز ہے۔ کہہ تو دیا کہ وہ معمولی آدمیوں کی طرح آرہے ہیں۔“

”نہ جانے کیا راز ہے۔“

”جو کچھ بھی ہو ظاہر ہو جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں

ہیں گے۔ حمید صاحب اگر انہیں اس سازش کا علم ہو گیا ہو تا تو کسی ہوٹل میں تو کبھی نہ ٹھہرتے۔“

”بہر حال ان دونوں کی شخصیتیں بھی بڑی پراسرار ہیں۔“

”مسافروں کا استقبال کرنے کے لئے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن ان میں زیادہ تر عورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ مردوں میں صرف ہوائی اڈے کے عملہ

کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔“

”تو کیا آپ ضرغام یا اس کے ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”شاید....!“

”لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی آمد سے باخبر ہوں۔ قاہرہ سے اس قسم کی ہدایت یا

تدعا کرنے کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ بوہیمیا سے چلتے وقت ان کا پروگرام نہیں تھا۔ ورنہ وہ

ان کی استدعا کرتے میرا خیال تو یہی ہے کہ ضرغام وغیرہ اس سے باخبر نہیں۔“

”ممکن ہے۔ تمہارا خیال صحیح ہو۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈچ ایئر لائن کا دیو پیکر مسافر بردار جہاز فضا میں چکر کاٹتا ہوا دکھائی دیا اور

فریچے اتر آیا۔ مسافر اترنے لگے۔ استقبال کرنے والے اور ہوٹلوں کے ایجنٹ بے تحاشہ ان کی

طرف دوڑنے لگے۔

بوہیمیا کے بادشاہ کو پہچان لینے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی کیونکہ وہ بڑی دیر تک اس کی

تصویر کو دیکھتے رہے تھے۔ وہ ایک معمر مگر قوی الجشہ آدمی تھا۔ چہرے پر گھٹی اور چڑھی ہوئی مونچھیں

تھیں۔ آنکھوں پر ہلکے سرمئی رنگ کی عینک لگائے تھا۔ پیشانی بہت کشادہ تھی اور سر پر سفید رنگ

کے گھنگھریالے بال تھے۔ اس کے ساتھ بورازیانہ بھی تھی۔

ہی پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ ان دونوں میں سر مو فرق نہیں۔ وہی وہی چال ڈھال، کچھ بالوں کی رنگت گہری تھی لیکن اس فرق کو بھی وہی محسوس کر سکتے تھے۔ انہوں نے دونوں کو قریب سے دیکھا ہو اور اس فرق پر خاص طور پر دھیان دیا ہو۔ پیروں کی اوٹ میں بھی تھوڑا سا فرق تھا۔ جولیا کے پیروں کی انگلیاں اس کے پیروں کی انگلیوں سے زیادہ ہلکی اور نازک تھیں۔ لیکن بورا زیانہ کے پیر بھی کم حسین نہیں تھے۔ اس نے گرمی کی شدت سے تنگ آکر اپنے اسٹانگ اتار دیئے تھے اور مرمر سے تراشی ہوئی پنڈلیوں پر بار بار ہاتھ پھیر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا باپ غسل کر کے نکل آیا۔ اب وہ تیاری کرنے لگی۔ حمید آمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بورا زیانہ غسل خانے میں جا چکی تھی۔ دفعتاً تھوڑی دیر بعد حمید نے ایک چیخ سنی۔ فریدی بھی چونکا۔ وہ تیزی سے اس کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے اس کے باپ سے پوچھا، جو غسل خانے کے قریب کھڑا اسے غائب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اندر سے بورا زیانہ نے کچھ کہا۔ اس پر اس کے باپ نے بھی کچھ کہا، جو فریدی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ البتہ اس نے اس کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش کے آثار دیکھے۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اوہ کوئی بات نہیں.... وہ پھسل کر گر پڑی تھی۔ چوٹ نہیں آئی۔“

تھوڑی دیر بعد بورا زیانہ بھی غسل کر کے باہر نکل آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ نکھر آئی تھی۔ اس کی گردن کی ایک ہلکی سی سلوٹ میں دو چار بال پھنسے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں حمید کے سینے میں کلبلاہٹ ہونے لگی۔

فریدی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہا تھا۔

”خدا کی قسم یہ بورا زیانہ نہیں ہے۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”تو اتنی جلدی یہاں....!“

”تم یہیں ٹھہرو....!“ فریدی نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ حمید بیٹھا اور دفعتاً اس کی نظریں بورا زیانہ کے پیروں پر پڑیں اور وہ بے اختیار چونک پڑا۔ یہ تو سو فیصدی بورا زیانہ کے پیر تھے۔ ویسے سبک اور نازک، حمید کو خوبصورت پیروں سے عشق تھا۔ اگر اسے ایک

”خدا کی قسم اس میں اور جولیا میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں۔“ حمید آہستہ سے بڑبڑایا اور اپنے منہ سے آگے بڑھا۔

شاہ بوہیمیا کے پیچھے ہوٹلوں کے ایجنٹ لگ گئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا صاحب ہوٹل ڈی فرانس، اعلیٰ انتظام، شاندار جگہ، دنیا کے بڑے بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ گھر کا سا آرام، ونڈر فل لائف۔ دوسرا ریک رہا تھا۔ ”مے پول ہوٹل بادشاہوں کے ٹھہرنے کی جگہ۔ عظیم الشان کمرے۔“

”تو پھر کیا خیال ہے۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”انہیں ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چاہئے۔“

”اچھا....!“ حمید نے کہا اور خود آگے بڑھ کر ایجنٹوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”پرائیویٹ انتظام، ہوٹل سے بڑھ کر شاندار اور آرام دہ شاندار کمرے۔ شاندار پائیں باغ، دل بہلانے کے لئے عظیم الشان لائبریری، اندرون خانہ قسم کے سارے کھیل، عمدہ نسل کے بہترین اور سیدھے سادھے کتے، نہانے کے لئے شاندار اور خوبصورت تالاب۔ دنیا بھر کے لذیذ ترین کھانے وغیرہ وغیرہ۔“

فریدی اس کی اس حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

حمید محسوس کر رہا تھا کہ شاہ بوہیمیا کسی کانوش نہیں لے رہا ہے۔ وہ چپ چاپ جہاز کے ایک آدمی کے ساتھ مسافر خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”کیا آپ نے پہلے ہی کوئی انتظام کر لیا ہے۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”نہیں....!“

”تو پھر میرے ساتھ چلئے۔“ حمید نے کہا۔ ”آپ جیسے باسلیتہ اور شاندار آدمی کے لئے وہی جگہ مناسب رہے گی۔“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر چلتا رہا۔ پھر مسافر خانے کے قریب پہنچ کر ہوٹل ”ڈی فرانس“ کے ایجنٹ سے باتیں کرنے لگا۔ حمید صرف اتنا ہی سن پایا تھا۔ ”ہم غسل کرنے کے بعد چلیں گے۔“

پھر وہ ایک کمرے میں مڑ گئے، جو بالکل خالی تھا۔ حمید برآمدے میں ٹھہر گیا۔ فریدی تھوڑے ہی فاصلہ پر کسی مسافر سے باتیں کر رہا تھا۔

بوہیمیا کا بادشاہ ٹریک سے کپڑے نکال کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ بورا زیانہ ایک آرام

”ناممکن قطعی ناممکن۔“ فریدی نے کہا۔

”جولیا کے پیروں کی بناوٹ بورازیانہ کے پیروں سے بالکل مختلف ہے۔“ حمید نے کہا۔
 ”اس چیز نے تو مجھے بھی اتنی جلدی اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔
 ابن کوئی باپ بیٹی کے پیروں کو اس طرح نہیں دیکھتا جس طرح تم دیکھتے ہو۔ تمہارے دیکھنے
 اجمیت کو دخل ہے۔ اسی لئے تم اسے اہمیت دیتے ہو.... اور پھر اس نے اسے اس بات کا
 قی ہی کب دیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے میرے جانے کے بعد فوراً ہی اسٹانگک پہن لئے
 گئے۔“

”پہن تو لئے تھے۔“ حمید فکر مندانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو بورازیانہ کا باپ بھی نقلی ہی
 لوم ہوتا ہے۔“

فریدی پھر جھک کر زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید ایک پتھرے میں ہوا کم تھی۔ وہ آہستہ سے
 بڑایا۔ ”یہ نشان دیکھو۔“

”ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

کچھ دور چل کر سیاہ اور پختہ سڑک شروع ہو گئی۔

”اگر وہ سڑک پر نکل گئے ہیں تب تو یہاں آتا ہی بے سود رہا۔“ حمید نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔
 فریدی زمین پر بیٹھ کر سڑک کو انگلی سے ٹٹولنے لگا۔ ”قطعی بے سود نہیں رہا۔ حمید
 صاحب۔“ وہ سڑک کے پار ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔ ”وہ سڑک پر ہی ہوئے ہیں کیونکہ دوسری
 طرف نشانات نہیں۔ دن بھر کی تیز دھوپ میں سڑک کا کوئی آثار کچھل کر نرم ہو گیا ہے۔“ فریدی
 نے کہا۔

”تو آپ سڑک پر نشانات ڈھونڈیں گے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔ ”اس طرح تو آپ کو
 بیگزوں نشانات مل جائیں گے۔“

”یہ نہ بھولو کہ مطلوبہ موٹر کے ایک پتھرے میں ہوا کم تھی اور شاید وہ پچھلا پتھر تھا۔ اس نے
 ناقص قسم کا نشان ڈالا تھا۔ میرے خیال سے اس میں اتنی ہوا کم تھی کہ اس کا ریم زمین سے لگ رہا
 تھا۔“ فریدی جھک کر دیکھنے لگا۔

حمید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بار بھی کہیں خوبصورت پیر نظر آ جاتا تو پھر اس کی بناوٹ عرصہ تک اس کے ذہن سے چپکی رہے
 تھی اور پھر جولیا کے پیر جنہیں اس نے کئی دنوں تک دیکھا تھا کیسے بھول جاتا۔ اس کا دل بڑے
 شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ قطعی خاموش تھی۔ بوہیمیا کے بادشاہ نے کئی بار گفتگو کی۔ لیکن وہ
 صرف نفی یا اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ ہوٹل ڈی فرانس کا نمائندہ بھی آگیا تھا۔ اس نے اسے
 سامان اٹھوانا شروع کیا اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔ حمید بدستور بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں
 نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ فریدی واپس آیا تو اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھیں انگارا ہو رہی
 تھیں۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے کمرے میں
 داخل ہوا۔ حمید نے بھی اس کی تقلید کی۔ فریدی غسل خانہ میں دیکھ رہا تھا۔

”وہ فرش پر پھسل کر گری نہیں تھی۔“ فریدی آہستہ سے بڑایا۔ ”یہ دیکھو کسی مرد کے پیر
 کے نشانات بالکل تازہ ہیں اور یہ.... اوہ.... خون.... کی بوند بخدا وہ اسے لے گئے۔“ فریدی
 نے دوسرے دروازے کو دھکا دیا۔ یہ ایک دوسرا کمرہ تھا، جو باہر سے بند تھا۔ اس نے نیچے جھک کر
 کوئی چیز اٹھائی۔ یہ سر میں لگانے کا کلپ تھا۔ چمکدار ٹائلیس لگے ہونے کی وجہ سے قدموں کے
 نشانات نہیں مل سکے۔ البتہ یہاں بھی کئی جگہ خون کی بوندیں ملیں۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ اس
 کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ سامنے کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ باہر کی روشنی اندر آرہی تھی۔ یہ
 کمرہ دیوار ٹوٹنے سے پہلے بالکل تاریک رہا ہو گا کیونکہ اس میں کوئی روشن دان بھی نہیں تھا۔ یہاں
 پرانا اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ فریدی تیزی سے آگے بڑھا اور دیوار کے خلاء سے باہر نکل
 گیا۔ حمید بھی اس کے ساتھ ہی بڑھا۔

”دوسری چوٹ....!“ فریدی آہستہ سے بڑایا۔ ”یہاں بھی خون ہے۔“ اس نے زمین کی
 طرف اشارہ کیا۔ ”اور کسی کار کے پتھروں کے نشانات! وہ لوگ اسے ادھر ہی سے لے گئے۔“
 سامنے دور تک جنگل کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور وہ ہوائی اڈے کی عمارت کی پشت پر کھڑے
 تھے۔ پھر انہوں نے کار کے پتھروں کے نشانات پر چلنا شروع کر دیا۔



”مجھے اس وقت خود اپنی ذات سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن بورازیانہ کا باپ اسے پہچان ہی لے گا۔“ حمید نے کہا۔

”موٹر یہاں سے مڑی ہے۔ اچھا اس نشان کو دیکھو۔ ان دونوں میں کچھ فرق معلوم ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”یہ نشان اسی پپے کا ہے جس میں ہوا کم تھی۔ بس چپ چاپ چلے آؤ.... خواہ وہ ہونٹ تک ہی کیوں نہ لے جائے۔“

”اس طرح کب تک چلتے رہیں گے۔“ حمید منہ بنا کر بولا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو زیادہ دور تک نہ جانا پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔ تھوڑی دور کے بعد وہ لوگ محکمہ جنگلات کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں سے فریدی نے کسی کو فون کیا۔

”کس سے بات کی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ڈی۔ آئی۔ جی صاحب سے۔“

”اس کیس کے متعلق....!“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.... وہ تو فائل ملنے کے بعد ہی میں نے ان سے اپنے شعبے کا اظہار کر دیا تھا اور اس میں نے انہیں نئے لیکن متوقع حادثے کی خبر دے دی ہے۔ چونکہ اس سے نکل کر وہ پھر نشانات پر پڑے۔ ابھی کچھ کچھ دھوپ باقی تھی لیکن اس میں سرخی پیدا ہو چکی تھی۔

”اب اندھیرے میں کہاں بھٹکتے پھریں گے۔“ حمید نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ میرے مینٹل میں ایک چھوٹی سی نارنج پڑی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اگر مقابلہ کی نوبت آگئی تو۔“

”مقابلہ کریں گے۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔

”ریو الوور....؟“ حمید بولا۔

”وہ بھی موجود ہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”مجھے تو پہلے ہی سے کھٹکا تھا کہ ہوائی اڈے پر ہی

نہ کوئی واردات ضرور ہو جائے گی۔“

”وجہ....؟“ حمید بولا۔

”بوہیمیا کی بجائے قاہرہ سے ہدایات کا موصول ہونا۔“

”آپ وہی ایک لکیر پیٹ رہے ہیں۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔

”وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”ٹھہرو....“ وہ پھر زمین پر جھک گیا۔

”یہاں سے کار یا لاری ادھر کچے راستے پر مڑ گئی۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا اور پھر سیدھا

کھڑا ہو گیا۔ ”حمید صاحب میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس علاقے میں صرف دو عمارتیں ہیں۔ ایک

تو محکمہ جنگلات کی چوکی اور دوسری یہاں سے تین میل کے فاصلے پر۔“ فریدی نے کچے راستے کی

طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”دوسری عمارت بالکل ویران مقام پر ہے۔ جنگ کے زمانے میں وہ فوجی رسد

گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اب شاید ویران پڑی ہے۔ میرے خیال سے اسے کسی تعلقہ دار

نے خرید لیا تھا اب وہاں کیا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔“

”تو آپ نے پہلے ہی وہاں پر چھاپہ کیوں نہیں مارا۔“

”سمجھ تو رہا ہوں کہ وہ محض اندازہ تھا۔ لیکن اس وقت یقین آ گیا ہے اور یونہی خواہ مخواہ چھاپہ

مار کر کیا کرتا۔ اب اگر بورازیانہ وہاں سے برآمد ہو جاتی ہے تو سارا کام بن جائے گا۔ پہلے میرے

پاس ان کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور اب دونوں ہم شکلوں کی موجودگی میں مجھے ان

کے خلاف جرم ثابت کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔“ وہ کچے راستے پر چل پڑے تھے۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جولیا کے بلبل۔“ حمید نے کہا۔

”بالوں کی رنگت....!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”صاحب زادے ہلکے کتھی رنگ کے

خضاب کے ذریعہ یہ دشواری بھی حل کی جاسکتی ہے۔ جولیا نے بورازیانہ کے بالوں کے رنگ کا

خضاب لگا رکھا تھا۔“ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ کپکپاتی ہوئی دھوپ اونچے درختوں کی چوٹیوں پر

آہستہ آہستہ ریگ رہی تھی اور جنگل انواع و اقسام کے شور سے گونجا ہوا تھا۔ کچے راستے کے

دونوں طرف گھنی جھاڑیوں میں جھینگروں نے اپنی ریں ریں، ٹیس ٹیس شروع کر دی تھی۔

وہ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ انہیں کسی کار کی آواز سنائی دی۔ دونوں جھاڑیوں میں گھس

گئے۔ چند لمحوں کے بعد ایک کار گرداڑاتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

”تم نے دیکھا....؟“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”بھلا اتنی بڑی چیز کیسے نہ دیکھتا۔ اگر اندھا بھی ہوتا تو کم از کم آواز تو سن ہی لیتا۔ کار پر کون

تھا؟ میں غور نہیں کر سکا۔“

”جہشید تھا....!“

”وہی اس کیفے کا مالک....!“

”شکر کرو.... بندروں ہی جیسی ہو جاتی ہے۔ ورنہ اس زمانے میں زندگی کہاں ملتی ہے۔“
پی بیس کر بولا۔

”اگر یہیں سے ٹپک پڑوں تو قیامت تک کی زندگی کا مزہ آجائے۔“
”ارے یار.... تو اپنی جان کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”تیرے مر جانے
ع زندگی تو فنا ہوگی نہیں۔ پھر خوف کس بات کا۔ بس ذرا زندگی کا ایک مظہر کم ہو جائے گا۔“
”لیکن میں زندگی کے دو چار اور مظاہر بنالینے سے پہلے نہیں مرنا چاہتا۔“
”خوش فہمی ہے تمہاری.... ورنہ تم میں رکھا ہی کیا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔
”خیر چھوڑیے اس بحث کو....!“ حمید اکتا کر بولا۔ ”مایوسی کی صورت میں زنانہ دوا خانے
سے ساڑھے تین روپے میں ایک بچہ خرید لوں گا۔“

پھر وہ دونوں کافی دیر تک ادھر ادھر کی تفریحی باتیں کرتے رہے۔ حمید کے لئے یہ پہلا
اتفاق نہیں تھا۔ اس نے بار بار فریدی کو ایسے موقعوں پر ادھر ادھر کی بے تکی باتیں کرتے سنا تھا۔
ان کا ہمیشہ یہ قاعدہ تھا کہ وہ مجرموں کے گرد اپنا جال بن کر اس طرح مطمئن اور بے تعلق ہو جاتا
تھا جیسے اس نے اس کے ہتھکڑیاں ہی لگادی ہوں۔ بہر حال ایسی حالت میں حمید کسی سخت اور خطرناک
مقابلے کی توقع ضرور رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں سڑک پر ایک کار دکھائی دی جس کے اندر
کسی نے دیاسلائی جلا کر سنگریٹ سلگائی اور اس کی روشنی میں اس کا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا۔
”پچھانا....!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”نہیں....!“

”ڈاکٹر ضرغام....!“

پھر حمید نے کار کو کچے راستے پر مڑتے دیکھا۔ تھوڑی دیر تک سنانے میں انجن کی آواز سنائی
دیتی رہی۔ پھر سکوت طاری ہو گیا۔ بہت دور کی جھاڑیوں میں کار کی لائٹس کا عکس کبھی کبھی چمک
اٹھتا تھا۔

”چلو یہ بھی بڑا اچھا ہوا۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ وہ بھی یہیں ہے۔“
”میرا خیال ہے کہ جشید اسے اپنی کامیابی کی اطلاع دینے گیا تھا۔“ حمید بولا۔ تھوڑی دیر تک
ناموشی رہی پھر فریدی بولا۔ ”ابھی تک وہ نہیں آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ضرغام کی

”ہاں اچھا اب آؤ لوٹ چلیں۔“ فریدی نے کہا اور جھاڑیوں سے نکل آیا۔ وہ جھکا ہوا زمین کی
طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

”یہی کار تھی یہ نشان دیکھو۔ مگر شاید واپسی کے لئے بھی اسے جلدی ہی تھی۔ جیسی تو اس
نے پہنچیں ہوا نہیں بھری تھی۔“ وہ دونوں پھر سڑک کی طرف واپس جا رہے تھے۔
”کیوں! کیا معاملہ کل پر چھوڑ دینے کا ارادہ ہے۔“ حمید نے کہا۔
”نہیں ابھی اور اسی وقت ورنہ بورازیانہ نہ جانے کہاں جا پہنچے۔“ فریدی نے جواب دیا۔
”تو کہاں چلے؟“

”ڈی۔ آئی۔ جی کو فون پھروں گا۔ اب اس معاملہ کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہئے ورنہ میرے
دماغ کی گیس پھٹ جائیں گی۔“

”فکر نہ کیجئے۔“ حمید طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر ضرغام بڑا اچھا سرجن ہے۔“
”فکر کس بات کی اس کی مدد کے بغیر بھی تمہارے ساتھ شادی کر ہی نہ سکوں گا۔“
”خیر اس سلسلے میں کئی بار آپ کی خدمت میں ہمدرد دوا خانے کا لٹرچر پیش کر چکا ہوں۔
حمید نے مسکرا کر کہا۔

”اس قسم کے برستہ جواب پسند آتے ہیں۔“ فریدی اس کی پیٹھ پر گھونسا جھا کر بولا۔
وہ ممکنہ جنگلات کی چوکی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ فریدی نے پھر اندر جا کر فون کیا اور واپس
آ گیا۔

”کوئی خاص انتظام....!“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں صرف پندرہ آدمی۔“

”صرف پندرہ کیوں؟“ حمید نے کہا۔ ”کیا آپ مجرموں کی صحیح تعداد سے واقف ہیں۔“
”نہیں! لیکن وہ عمارت میری دیکھی ہوئی ہے۔ اس کی چوبلیشن ایسی ہے کہ اگر سلیقے سے
حملہ کیا جائے تو پندرہ ہی کافی ہوں گے۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کیا فائدہ۔“

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نو دس بجے سے قبل چاندنی کی توقع بھی نہیں تھی۔ انہوں نے چوکی
کے قریب ہی ایک گھنٹا درخت منتخب کیا اور اس پر چڑھ گئے۔

”آپ کے ساتھ رہ کر بھی بالکل بندروں کی سی زندگی ہو جاتی ہے۔“

رف چھوٹی چھوٹی میز پر بھی ہوئی تھیں جن میں چار چار کی ٹولیوں میں بیٹیں آدمی بیٹھے ہوئے
زب یا کافی پی رہے تھے۔ ڈاکٹر ضرغام ٹہل رہا تھا۔ ایک آرام کرسی پر بورازیانہ پڑی ہوئی تھی۔
ن کے چہرے پر بے چارگی کے اثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ضرغام بار بار رک کر اس کی طرف
بکھنے لگتا تھا۔

دفترا فریدی نے ایک ہوائی فائر کیا جس کے جواب میں محاصرہ کرنے والوں نے بھی عداوت
پہاڑہ ماری۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔
”ڈاکٹر ضرغام۔“ فریدی اوپر سے چیخا۔ ”تم ہار گئے۔“ چپ چاپ خود کو ہمارے حوالے
”رہ۔“

ایک بیک اندر سے تین چار فائر ہوئے اور صحن میں لگے ہوئے لیمپ چمکنا چور ہو گئے۔ پھر
ایک طویل کرب ناک اور بتدریج مضطرب ہوتی ہوئی چیخ سنائی دی۔ کسی عورت کی چیخ، ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر اتار دیا ہو۔ فریدی نے اندھا دھند فائر کرنے شروع
کر دیے۔ حمید بھی بڑی مستعدی سے اندھیرے میں فائرنگ کر رہا تھا اور اب نیچے سے بھی فائر
ہونے شروع ہو گئے۔ اندر شائد مجرموں نے بھی اپنی رائفیں سنبھال لی تھیں۔ کبھی کبھی ایک
آدھ چیخ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ نیچے دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دے
رہی تھیں۔ شاید فریدی کے ساتھیوں نے دروازوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ فریدی آہستہ آہستہ نیچے
جانے والے زینوں کی طرف ریٹکے لگا۔

”یہ خطرناک ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”فکر مت کرو۔۔۔۔۔ تم اپنی جگہ پر مستعد رہو اور فائرنگ جاری رکھو۔“

پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے حمید کی نظروں سے غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد حمید کو ایسا
نوس ہوا جیسے اندر بہت ہی شدید قسم کی جنگ چھڑ گئی ہو۔ پے در پے چیخیں سنائی دے رہی
تھیں۔ شاید باہر کے لوگ بھی اندر گھس گئے تھے۔ دفترا اس نے فریدی کی آواز سنی جو چیخ کر کہہ
”ہا تھا“ اوپر اپنا آدمی ہے۔“ حمید بھی ریگ کر زینے کے قریب آ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی
اولی اس کے کسی ساتھی کو نہ لگ جائے۔

متواتر دو گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں۔ پھر یک بیک سناٹا چھا لیا۔ البتہ چیخنے اور کراہنے کی

موجودگی ہی میں ان پر حملہ کر دیا جائے۔“ حمید سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس گروہ کی طاقت کا حال اس پر
اچھی طرح ظاہر تھا۔ اس کے افراد چالاک بھی تھے اور دلیر بھی۔ دن دہاڑے ہوائی اڈے سے کسی
کو اغوا کر کے لے جانا آسان کام نہیں تھا اور اغوا بھی کیسا۔ ایک شکل کو دوسرے ہم شکل سے بدلنا
تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حکمہ سراغ رسانی کا ایک آفسر ان کے کرتوت سے واقف ہو چکا
ہے۔ ایسے آدمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف پندرہ آدمی؟

دفترا اس کی نظر فریدی کی طرف اٹھ گئی، جو اپنی چھوٹی سی نارنج روشن کر کے ہلا رہا تھا۔ پھر
اسے نیچے کچھ دور پر ایک دوسری نارنج دکھائی دی۔
”اتر چلو۔۔۔۔۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ آگئے۔“

پھر تھوڑی دیر بعد سترہ آدمیوں کی پارٹی گھنے جنگل میں گھس رہی تھی۔

فریدی نے مختصر راستہ اختیار کیا تھا اور بے دھڑک جھاڑیوں میں گھستا پھر رہا تھا۔ نارنج
استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ محض اپنی یادداشت کے سہارے اندھیرے میں اس
پراسرار عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ لوگ منزل مقصود پر
پہنچ گئے۔ عمارت کافی طویل و عریض تھی اور اس کی بند کھڑکیوں کے دھندلے شیشوں سے روشنی
دکھائی دے رہی تھی۔ فریدی نے دو دو تین تین آدمیوں کو جھاڑیوں میں چھپانا شروع کر دیا۔
ترتیب کچھ ایسی تھی کہ پوری عمارت چاروں طرف سے گھر گئی۔ پھر وہ انہیں ضروری ہدایات
دے کر عمارت کی پشت پر آیا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ اکثر عمارت کے اندر سے قہقہوں کی
آواز سنائی دے رہی تھی۔

”حمید۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اوپر چلنا ہے۔ یہ لوریو اور کار توں۔۔۔۔۔!“
”اوپر۔۔۔۔۔ لیکن کیسے؟“

”یہ درخت دیکھ رہے ہو۔ اس کی ایک شاخ چھت پر جھکی ہوئی ہے۔“

حمید نے ایک گہری سانس لی اور درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ دوسرے لمحہ میں وہ درخت پر
چڑھ رہا تھا۔ فریدی بھی اس کے بعد چڑھنے لگا۔ دونوں بہ آسانی چھت پر اتر گئے۔ چھت بالکل
سپاٹ تھی۔ البتہ نچلے صحن کے چاروں طرف دو دو فٹ اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ
دونوں ریٹکے ہوئے دیوار کے قریب آئے۔ صحن میں جھانک کر دیکھا۔ وسیع صحن میں چاروں

آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً صحن میں روشنی دکھائی دی۔ فریدی ہاتھ میں ایک پٹر و میکس لیمپ لٹکائے ہوئے باہر آیا۔

”حمید اگر زندہ ہو تو نیچے آجاؤ۔“

اس نے نیچے سے آواز دی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بورازیانہ کی لاش کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔

اس کے سینے میں ایک خنجر پیوست تھا اور چہرہ اس قدر بگاڑ دیا گیا تھا کہ خدا کی پناہ۔ حمید نے اتر آیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بورازیانہ کے چہرے کا سارا گوشت کاٹ لیا گیا تھا۔

دوسری طرف صحن کے پختہ فرش پر گویا خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ بے شمار لاشیں پڑی ہوئی تھیں، جن میں ان کے ساتھیوں کی بھی لاشیں تھیں۔ کچھ تو اب تک سبک اور کراہ رہے تھے۔

فریدی تھوڑی دیر تک بورازیانہ کی لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر کمروں کی طرف پلٹ آیا۔ حمید بھی اس کے ساتھ تھا۔ فریدی کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اس کی آنکھیں غم ناک تھیں۔

حمید نے ضرغام کو دیکھا جو فرش پر بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔

”اس کے گھونسنے نے میرا سر پاش پاش کر دیا تھا۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن سامنے والی دیوار نے اس کا ہاتھ توڑ دیا۔“ پھر وہ ضرغام کو مخاطب کر کے بولا۔

”کیوں ضرغام.... تم واقعی بہت دلیر ہو اور بہت ذہین بھی، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ میرے علاقے میں سازشیں بہت کم بار آور ہوتی ہیں۔“ ضرغام کچھ نہیں بولا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب وہ اپنی ہی بوئیاں نوپنے کے متعلق غور کر رہا ہو، پھر وہ برآمدے میں آگئے۔ انکے ساتھیوں میں سے صرف آٹھ زندہ بچے تھے۔ سترہ مجرم حراست میں آگئے اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو زخمی نہ رہا ہو۔ فریدی کے چہرے پر بھی دو تین خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

”آپ کے چوٹ کس طرح آئی۔“ حمید نے پوچھا۔

”ضرغام کے ناخن۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں تو ہمت بار چکا تھا۔ خدا کی پناہ۔ اتنا طاقت ور

آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اگر اس کا ہاتھ نہ ٹوٹتا تو وہ کبھی قابو میں نہ آتا۔ وہ تو کبوتر میں پھرتی سے ہٹ گیا اور اس کا گھونسنہ دیوار پر پڑا.... ورنہ خیر.... اف فوہ.... کتنا خون بہہ

گیا.... اور وہ بے چاری۔“

وہ رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔ وہاں سے واپسی پر فریدی ہوٹل ڈی فرانس میں پہنچا۔

بوہیمیا کے فرمانروا کو اس حادثے کی خبر سنائی اور وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ”شاید تم زیادہ پی گئے ہو۔“

اس کی لڑکی جو ابھی جاگ پڑی تھی اور اس کے رویے پر تو فریدی خون نے گھونٹ پی کر رہ گیا اور حمید کے سینے میں تو نفر توں کا جوالا مکھی پھوٹ رہا تھا۔ جو لیانے نہ صرف انہیں پہچاننے سے

انکار کر دیا بلکہ ان کے اس خیال کا مضحکہ بھی اڑایا کہ بوہیمیا کی شہزادی بدل دی گئی ہے۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ چپ چاپ چلے نہ جائیں گے تو وہ پولیس کو فون کر دے گی کہ دو شرابی ان کے

کمرے میں گھس آئے ہیں۔“

تھکن کی وجہ سے اس وقت فریدی کا ذہن کسی آخری فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ لہذا وہ ان کی نگرانی کے لئے دو آدمی چھوڑ کر وہاں سے لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ڈی۔ آئی۔ جی نے فریدی اور حمید کو اپنے بنگلے پر طلب کیا۔

”بھئی اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے فریدی سے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”بورازیانہ والا معاملہ.... اوپر سے یہی حکم آیا ہے کہ اس مسئلہ پر اب کوئی مزید تحقیق نہ کی

جائے۔ البتہ اگر ضرغام کے خلاف کچھ اور چارج لگائے جائیں تو بہتر ہے۔“

”آخر کیوں....!“ فریدی نے حیرت سے پوچھا۔

”اب یہ نہ پوچھو....!“

”تو یہ خون کا دریا مفت میں بہایا گیا۔ بورازیانہ کی لاش بھی موجود ہے۔ لیکن اس کی شناخت

نہ ہو سکے گی۔“

”خود اس کے باپ نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔“

”لیکن میں ثابت کر دوں گا۔“ فریدی جھلا کر بولا۔

”ہماری حکومت اس کے لئے تیار نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“

ہی۔ آئی۔ جی تھوڑی دیر تک پر خیال انداز میں فریدی کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”جولیا ہی تیرے تاج کی صحیح وارث ہے۔“

”بس طرح....!“ فریدی بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

”بورازیانہ حقیقتا شہنشاہی کی بیٹی نہیں تھی۔ اس نے اسے بیٹی کی طرح پالا تھا۔ جولیا حقیقتا اس کی بیٹی تھی اور اس کی پرورش ہنگری کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ شاہ کو تخت کے ہندو شمنوں کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو زندہ نہیں رہنے دیں گے لہذا اس نے جولیا و شیر خوار بیٹی کے عالم میں ہنگری بھجوا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک لادارث بچی کو دے دی تھی۔ وہ بھی بورازیانہ ہی کہلاتی تھی۔ جوان ہو کر وہ بھی اپنی قوم میں بہت مقبول ہو گئی۔ شاہ کو فکر تھی کہ اب وہ اپنی لڑکی کو کس طرح واپس بلائے۔ اس دوران میں اس کے وہ دشمن بھی ختم ہو چکے تھے جن کی طرف سے اسے خدشہ تھا۔ وہ اس راز کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لہذا اس نے یہی تدبیر سوچی کہ جولیا کی شکل تبدیل کر کے اسے بورازیانہ کی شکل میں لایا جائے۔ یہ کام امریکہ میں بھی آسانی سے ہو سکتا تھا لیکن وہاں اس بات کے پھیلنے کا خطرہ تھا۔ اس دوران میں اس کی نظروں سے ڈاکٹر ضرغام کا کوئی مضمون گذرا جس میں اس نے اپریشن کے ذریعے شکل تبدیل کرنے کے امکانات پر بحث کی تھی۔

اس نے اس سلسلہ میں ضرغام سے خط و کتابت کی اور وہ اس پر تیار ہو گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ جولیا کو کچھ بتایا جائے۔ اس کی شکل تبدیل کر کے اسے بورازیانہ کے رت و اطوار اور آداب شاہی سکھائے جائیں۔ جب وہ سب کچھ سیکھ جائے تو اسے اس راز سے آگاہ کیا جائے۔ ورنہ شروع میں خوشی کے مارے اس کے پاگل ہو جانے کے امکانات بھی ہو سکتے تھے۔ بورازیانہ کے متعلق یہ پروگرام تھا کہ اسے جولیا کی پہلی شکل میں لا کر ہنگری بھجوا دیا جائے۔ اسے مار ڈالنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اگر وہاں کسی سے اس تبدیلی کا ذکر بھی کرتی تو لوگ اسے اگل سمجھتے۔ ہنگری والے جنہوں نے جولیا کی پرورش کی تھی شاہی خاندان کے خاص وفاداروں میں سے تھے کسی سے اس واقعے کا تذکرہ نہ کرتے اور اگر بورازیانہ انہیں جولیا کی شکل میں مل جاتی تو اسے اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے اور مشہور کر دیتے کہ کسی اچانک حادثے کی وجہ سے ان کی لڑکی کا یا تو واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے یا پھر وہ اچانک غائب ہو جانے کے باعث بازیافت پر

”اگر ٹھیک ہے تو پھر مجھے یہ معلوم کرنے دیجئے کہ ایک باپ نے اپنی بیٹی کو پہچاننے کیوں انکار کر دیا۔ اگر چہرہ بگاڑ دیا ہے تو کیا ہوا۔ اس کے دوسرے اعضاء تو صحیح و سالم ہیں۔“

”بھئی اس قصے کو ختم کرو۔ ضرغام کو پھانسی پر چڑھانے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ اس نے تین خون کئے جن میں سے ایک گم نام لڑکی بھی ہے۔“

”گم نام لڑکی....!“ فریدی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ بورازیانہ ہے۔“

”مجھے یقین ہے۔“

”پھر آخر حکومت کیوں....؟“

”بھئی یہ ایک دوسری حکومت کا راز ہے اور دونوں لڑکیاں غیر ملکی تھیں۔ ضرغام نے جن دیسیوں کا خون بہایا ہے اس کے لئے اس پر مقدمہ چلایا جائے گا اور اگر دوران سماعت خود اسی نے سارا راز اگل دیا تو....!“

”مقدمہ کھلی عدالت میں نہیں ہوگا۔“

”یہ سراسر ظلم ہے۔ دو الگ الگ ملکوں میں بھی انسان ہی بستے ہیں اور ان میں سے کسی کی رگوں میں خون کی بجائے پانی نہیں ہوتا۔“

”امور مملکت میں ہم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔“

”تو خیر.... پھر میرا استعفیٰ آپ کو آفس میں مل جائے گا۔“ فریدی براہِ فرنگی کے عالم میں اٹھتا ہوا بولا۔

”مجھے اسی کا خدشہ تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی مسکرا کر بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ حکومت تم جیسے کام کے آدمی کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اوپر والوں کو تمہاری افتاد طبع سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہوں۔ آخر تم استعفیٰ کیوں دینا چاہتے ہو۔“

”تاکہ آزادی کے ساتھ اس راز کا پتہ لگا سکوں۔“

”میں خود تمہیں بتا سکتا ہوں۔ لیکن رازداری کے وعدے کے ساتھ ہی ساتھ تمہیں یہ وعدہ بھی کرنا پڑے گا کہ تم اس کے بعد استعفیٰ نہیں دو گے۔“

فریدی کچھ دیر خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”مجھے منظور ہے۔“

والدین کے عتاب ڈر سے پاگل بن گئی ہے۔“

فریدی متحیرانہ انداز میں ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جاسوسی دنیا نمبر 23

”میرا خیال ہے۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”قاہرہ سے رازداری کی استدعا کرنے کا یہ مطلب تھا کہ ضرغام نے شاہ کو جو لیا کے غائب ہونے کی خبر بھجوا دی تھی لیکن اسے توقع تھی کہ وہ اُسے ڈھونڈ نکالے گا اور اسکے مل جانے پر ہی اس نے اسے مطلع کیا ہوگا۔ مگر وہ تار اسے قاہرہ میں نہ مل سکا ہوگا۔ البتہ دو ستر نئے دن یہاں ڈاکٹر ضرغام کو قاہرہ سے ان کی روانگی کا تار ملا ہوگا؟“

”قطعی یہی بات تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے سر ہلا کر کہا۔

فریدی پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے گہری سوچ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

”ڈاکٹر ضرغام کے دوسرے جرائم کا کیا ہوگا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”اس کے ساتھیوں نے وہ جگہیں بتا دی ہیں۔ اب موٹر ڈرائیوروں کی لاشیں برآمد کی

جائیں گی۔ بہر حال یہ میری زندگی کی پہلی شکست ہے۔“

”شکست کیوں....!“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”اگر حکومت درمیان میں نہ آجاتی تو تم نے

سارے عقدے ہی حل کر لئے تھے۔“

”مجھے عقدوں سے زیادہ بے گناہوں کی جانوں کا خیال رہتا ہے۔ وہ غریب لڑکی بھی مفت

میں ماری گئی اور اتنا خون فضول بہا اور اس لئے کہ مجرم ایک بادشاہ ہے۔“

اس واقعے کے بعد فریدی عرصے تک غمگین رہا۔

کچھ دنوں کے بعد جو لیا اپنے باپ کے ساتھ بویمیا واپس چلی گئی۔

اپنے دوران قیام میں اس نے کئی بار فریدی سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے صاف

انکار کر دیا تھا۔

قاتل سنگریزے

ختم شد

(مکمل ناول)

پیش لفظ

”قاتل سگریزے“ کو آپ ہر حیثیت سے دلچسپ پائیں گے۔ اس میں تھیر، مزاج، کردار نگاری اور داستان کی دلچسپی سب کچھ موجود ہے۔ ایک کرنل کی موت پر اسرار حالات میں ہوئی۔ وہ اپنے ریوالور سے کسی پر حملہ کرتا ہے مگر خود مر جاتا ہے۔ لیکن اسے گولی نہیں لگی تھی۔ اس کا بھائی پھول توڑتے وقت چیخ کر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ پھر بھتیجا اپنی کار میں بیہوش پایا جاتا ہے۔ آسمان سے مردہ پرندوں کی بارش۔ ایک عجیب و غریب جانور کا تذکرہ جس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ پراسرار آدمی کی داستان جس سے سب خائف رہتے تھے، جو نوجوان لڑکیوں کو اٹھالے جاتا تھا۔ جس نے کرنل سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ فریدی اس ناول میں بہت پر سکون نظر آتا ہے، لیکن وہ خاموشی سے کیا کرتا رہا تھا؟ انکشاف ہوتے ہی آپ چونک پڑیں گے۔ ایک لڑکی تین مرد۔ سارجنٹ حمید نے دل پر جبر کر کے ہاتھ پیرہے تو ایک حماقت کر بیٹھا، لیکن وہ حماقت بھی کام آگئی۔

ابنِ صفی

مرگِ ناگہاں

ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاعیں پہلی کوٹھی کی اوپری منزل پر پھیلی ہوئی تھیں اور پہلی کوٹھی شہر کی دوسری عظیم الشان عمارتوں سے الگ تھلگ سدا بہار درختوں اور پھولوں کے تختوں سے گھری کھڑی تھی۔ یہ تھی تو دولت گنج ہی کے علاقے میں لیکن شہری آبادی اس سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ اس کے ارد گرد کی آبادی کا شمار شہری آبادی میں نہیں ہوتا تھا۔ یہاں زیادہ تر ماہی گیر تھے، جو قریب کے دریا سے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ دو چار گھر کپڑا بننے والوں کے بھی تھے۔ ان کے علاوہ پہلی کوٹھی کے مالک کرنل جواد کے ملازمین نے بھی اپنے گھر بنائے تھے۔ اس علاقے کی ساری زمین کرنل جواد ہی کی تھی، جو اس نے برائے نام کرائے پر اٹھا رکھی تھی۔ کرایہ محض اس لئے لیتا تھا کہ زمین پر اس کا قبضہ مالکانہ قائم رہے۔ ورنہ ویسے اس کا مقصد اس زمین کو آباد کرنا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ اُس نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ کوئی ایسا آدمی وہاں آباد نہ ہونے پائے جو اس کے سامنے سر اٹھا سکے۔ اس کی یہ عنایت صرف نچلے ہی طبقے تک محدود تھی۔ بہر حال پہلی کوٹھی کے چاروں طرف بے شمار چھوٹے موٹے کچے کچے مکانات اور جھونپڑے بکھرے ہوئے تھے اور شام کے دھند لکے میں اس بہتی میں پہلی کوٹھی نہ جانے کیوں انتہائی پراسرار معلوم ہونے لگتی تھی۔

خود کرنل جواد اس سے بھی زیادہ پراسرار تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے فرصت پانے کے بعد سے اس نے یکے بعد دیگرے آٹھ شادیاں کی تھیں اور وہ سب دودو تین تین سال کے وقفے سے لاؤلد نی مر گئی تھیں۔ اسی بنا پر اس کے بعض بے تکلف دوست اُسے بیوی خور کہنے لگے تھے۔ آٹھ

اچھے سے کٹ گیا۔

ڈاکٹر قدیر اس کا علاج کر رہا تھا۔ بینڈیج وغیرہ بھی وہ خود اپنے ہاتھ ہی سے کرتا تھا لیکن زخم ہی تک نہ بھر سکا تھا۔ جہاں کھلی اٹھی کرمل جواڈ پٹیاں کھول ڈالتا اور زخم کو رگڑنے لگتا۔ کبھی سہی کی پٹیوں سے کبھی صوفے سے اور کبھی کسی درخت کے تنے سے۔

آج ڈاکٹر قدیر صبح ہی بے گھر پر موجود نہیں تھا اس لئے خود کرمل ہی پائیں باغ میں بیٹھا ہوا بازخم دھو رہا تھا۔ اس کا سب سے پرانا خادم رفیق پانی ڈال رہا تھا۔

”نہ جانے آج قدیر نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔“ کرمل خود بخود بڑبڑایا۔

”بہت ممکن ہے کہ کوئی خاص قسم کا مریض مل گیا ہو۔“ رفیق نے کہا۔

”لیکن اُسے میرا خیال بھی تو رکھنا چاہئے تھا۔“ کرمل نے جھنجھلا کر کہا۔

”پتیاں صاحب یا نصیر میاں کو بلاؤں۔“ رفیق نے کہا۔

”کیپٹن اشرف کہو۔“ کرمل منہ بنا کر بولا۔ ”یہ لوٹا تو اس طرح کڑا پھرتا ہے جیسے کیپٹن نہیں جزل ہو اور آواز سنئے تو جیسے بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہو۔ پریڈ کیا کرتا ہوگا۔ عجیب زمانہ آگیا ہے، ایسے نازک بدنوں کو فوج میں نوکریاں ملنے لگی ہیں سنا ہے کہ وہ زخما بھی کمیشن کے پکر میں ہے۔“

”کون....؟“

”اماں.... وہی نصیر، جسے ہلکی سی چپت بھی مار دوں تو کئی دن بخار آجائے۔“

”صاحب ان لوگوں کے طور طریقے تو مجھے بالکل پسند نہیں۔“ رفیق نے کہا۔

”ارے بابا تو مجھے کب پسند ہیں۔ سنا ہے کل رات کو نصیر نشتے میں تھا۔ اگر میری آنکھ کھل

گئی ہوتی تو بیٹا تنور کو۔ پینے کو دوپگ اور ادھم اتنا چائیں گے جیسے قرا بے صاف کر گئے ہوں۔“

”سرکار مجھے تو ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ آتے ہی عالیہ بی بی کا ہاتھ پکڑ لیا اور جھوم

جھوم کر کہنے لگے، تمہارا نام فل فل فلوٹی ہے، مگر عالیہ بی بی نے بھی وہ زوردار تھپڑ رسید کیا ہے

کہ پچھلے جنموں کا حال بھی روشن ہو گیا ہوگا۔“

”میں ہوتا تو مارتے مارتے ادھم مارا کر دیتا۔“ کرمل نے کہا۔ ”ارے ہم بھی پیتے تھے اور بے

تخاصر پیتے تھے۔ مگر کیا مجال کہ زبان میں لغزش ہو جائے۔“

بیویوں میں سے کسی نے بھی اس کا کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے اب آخر عمر میں نزدیک اور دور کے بہترے رشتے دار اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں اس کا سگا بھائی سلیم اور بھتیجہ کیپٹن اشرف بھی تھا۔ پہلے وہ دونوں کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے لیکن ادھر دو سال سے ان کا قیام پہلی کوٹھی ہی میں تھا۔ ان دونوں کے علاوہ پانچ افراد اور تھے جن میں اس کا بھانجا ڈاکٹر قدیر نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ شہر میں اس کی پریکٹس اچھی خاصی چلتی تھی اور وہ اتنا دولت مند تھا کہ اگر بنے دو ڈاکٹر ملازم رکھ چھوڑے تھے، جو اس کی عدم موجودگی میں اُس کے مریضوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قدیر عموماً گرمیوں کا زمانہ اپنے ماموں کرمل جواڈ ہی کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ تھی لیکن وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ عزیزوں میں وہی کرمل جواڈ سے سب سے زیادہ قریب تھا۔ وہی ایک ایسا تھا جسے کرمل کچھ سمجھتا تھا۔ لڑکیوں میں اُسے اپنی بیوہ سالی بیگم نواز کی لڑکی عالیہ بھی عزیز تھی۔ کرمل جواڈ کی ایک چچا زاد بہن اپنے شوہر سے بگاڑ کر کے اُسی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا اکلوتا لڑکا نصیر بھی تھا جسے کرمل قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کے عادات و اطوار اُسے ناپسند تھے۔ وہ کافی خوبصورت تھا اور ہر وقت خود کو بنائے سنوارے رہتا تھا۔ کرمل اُسے عموماً زخما کے نام سے یاد کرتا تھا۔ بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سب کرمل کی کثیر دولت کی لالچ میں یہاں جمع ہو گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کرمل کا دل جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کرمل جواڈ کے اعزاء اسے جذبی سمجھتے تھے۔ چڑچڑا تو خیر وہ تھا ہی۔ اس پر عمر کا تقاضا لیکن عمر کی زیادتی نے اس کے جسم پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ جسم کی توانائی کی بناء پر اُس کے سفید بال ایسے ہی معلوم ہوتے تھے جیسے وہ قبل از وقت سفید ہو گئے ہوں۔ ویسے اس کی عمر ستر سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اس وقت وہ اپنے پائیں باغ میں بیٹھا اپنے داہنے پیر کے تلوے کا وہ زخم دیکھ رہا تھا جو اُسے تقریباً ایک ماہ سے پریشان کئے ہوئے تھا۔ بس ایک دن بیٹھے بیٹھے داہنے پیر کے تلوے میں کھلی اٹھی جو بڑھتی ہی گئی اور پھر کھجلائے کھجلائے دو چار دن بعد زخم ہو گیا تھا۔ کھلی اتنی شدید اٹھی تھی کہ وہ بے اختیار اپنا تلوہ ہر اس چیز سے کھجلائے لگتا جو چیز اس کے ہاتھ لگ جاتی تھی۔ ایک دن شیو کرتے وقت کھلی اٹھی اور اس نے بلید سے کھجلانا شروع کر دیا۔ نتیجے کے طور پر تلوہ

”کیا میں جانتا نہیں۔“ رفیق نے کہا اور پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔
 ”پتیا صاحب بھی پیتے ہیں لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب کو آج تک نشے میں نہیں دیکھا۔“
 ”ارے وہ کیا پئے گا کنبوس کنبی چوس۔“ کرنل ہنس کر بولا۔ ”لیکن اس ہنسی سے بیارہم جھلک رہا تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”ارے وہ سورا تم اُسے اچھا کہتے ہو۔ دیکھتے نہیں مجھ سے برابر سے لڑتا ہے۔“

”وہ تو خود آپ ہی نے انہیں شبہ دے رکھی ہے۔“

”مجھے کھرے آدمی پسند ہیں۔“ کرنل نے پیر کو خشک کر کے سامنے والی کرسی پر رکھ کر بولے۔ ”وہ خوشامدی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بقیہ سب لوگ میری موت کے منتظر ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“
 رفیق کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے کرنل کی رائے سے اتفاق ہو لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

پھر کرنل خود ہی تھوڑی دیر کے بعد بڑبڑانے لگا۔ ”لیکن انہیں مایوسی ہوگی۔ وہ مجھے نہیں جانتے۔ میں نے وہ وصیت نامہ مرتب کیا ہے کہ اُن کی آنکھیں کھل جائیں گی۔“
 رفیق پھر خاموش رہا۔ دفعتاً کرنل اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ”پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔“ ”تم چالیس سال سے میرے ساتھ ہو۔ میری طبیعت کا اندازہ تم نے بخوبی لگایا ہوگا۔ اچھا بتاؤ تو میں نے کس قسم کا وصیت نامہ مرتب کیا ہے۔“

”بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ رفیق نے اس کی طرف مرہم اور پٹیاں بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھہرو۔۔۔ اس طرح کچھ سکون مل رہا ہے۔ مرہم لگاتے ہی پھر کھلی شروع ہو جائے گی۔“
 ”کرنل نے کہا۔“ ”ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں آج کل کیا کر رہا ہوں۔“
 ”تو آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“

”اس لئے کہ تم تمام میں ڈھنڈورا پیٹتے پھر۔“ کرنل جھنجھلا کر بولا۔ ”پھر تھوڑی دیر تک اُن گھورتے رہنے کے بعد کہنے لگا۔“ ”مجھے اُن سب سے زیادہ تم پر اعتماد ہے۔ میرا کون سا ایسا راز ہے جو تم نہیں جانتے۔ تمہارے علاوہ میں نے کسی اور کو اپنا ہمدرد سمجھا ہی نہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ

اب میری موت قریب ہے۔“

”آپ نے پھر وہی باتیں کرنی شروع کر دیں۔“ رفیق نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ نہ جانے کب کب مر کھ گیا ہوگا۔“

”نہیں وہ کبھی نہیں مر سکتا۔ میری موت سے پہلے تو کبھی نہ مر سکے گا۔ وہ خبیث وہ ناہنجار۔“

اُس کے علاوہ اور کون اس سُنور کی تصویر بنا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سُنور کو یا تو میں پہچانتا ہوں یا وہ خود اس سے واقف ہے۔ مجھے اس کی دھمکی آج تک یاد ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں نے اُسے ہنر سے پیٹا تھا۔ میں اُسے پیٹ رہا تھا اور کسی انجانے خوف سے میری روح لرز رہی تھی۔ یہ دھمکی مجھے اسی کی طرف سے موصول ہوئی ہے سنو! اب یا تو میں ہی مروں گا یا وہ خود۔ جب سے مجھے اُس سُنور کی تصویر دکھائی دی ہے میں اپنے پاس ہر وقت بھرا ہوا ریلواری رکھتا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہاں کس طرح پہنچے گا۔“ رفیق نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

”تعب ہے کہ تم اسے دیکھ چکے کے بعد بھی اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔“ کرنل نے کہا۔
 ”میں جادو وغیرہ کا قائل نہیں ہوں مگر پھر بھی مجھے اس کی شخصیت میں کوئی مافوق الفطرت چیز محسوس ہوتی رہی ہے۔“

دونوں خاموش ہو گئے۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی اور اب دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔ بستی کے مکانوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا اور چراگاہوں سے واپس آنے والے مویشیوں کی گھنٹیاں فضا میں ارتعاش پیدا کئے ہوئے تھیں۔

کرنل کی نظریں افق پر جمی ہوئی تھیں جہاں کئی رنگوں کے شوخ لہریئے ابھر آئے تھے وہ وہاں اسی طرح بیٹھا رہا حتیٰ کہ افق کے رنگ بھی دھندلے پڑ گئے۔ ابھی تک اس کا زخم کھلا ہوا تھا اور رفیق چپ چاپ کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس دوران میں ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ کرنل کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رفیق اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ کرنل اپنے عادات و اطوار کے اعتبار سے تقریباً خطی ہی تھا۔ اگر رفیق ایسی حالت میں اسے اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بے تحاشہ اس پر برس پڑتا اس لئے خاموش ہی رہ کر خود اس کے چونکنے کا انتظار کرتا رہا۔ کرنل کی عادت تھی کہ وہ اکثر اسی طرح گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا اور اس کی آنکھیں اس طرح ویران ہو جاتی تھیں جیسے وہ بحالت بیداری کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا اور اگر اسے اس

محبت سے چونکانے کی کوشش کی جاتی تھی تو وہ ضرورت سے زیادہ برا فروختہ نظر آنے لگتا تھا۔
تھوڑی دیر بعد کرمل خود بخود چونکا اور اس کی نظریں پھانک کے باہر دھندلے میں ریچر
لگیں۔ پھر وہ بے تحاشہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے زخم....!“ رفیق بے اختیار بولا اور اس کی نظروں نے کرمل کی نگاہ کا تعاقب کیا۔
باہر اُسے کوئی جانور بھاگتا ہوا دکھائی دیا لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ اس کے متعلق کوئی صحیح
رائے قائم نہ کر سکا۔

ساتھ ہی کرمل نے ایک زوردار چیخ ماری اور تیزی سے دوڑتا ہوا پھانک کے باہر نکل گیا۔
رفیق بھی اس کے پیچھے دوڑا لیکن کرمل کی رفتار تیز تھی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر دوڑ رہا تھا۔ رفیق
یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کرمل اس عمر میں بھی اتنا تیز دوڑ سکتا ہے، حالانکہ اس کی عمر ہی کرمل
کے ساتھ گزری تھی۔ لیکن اس وقت اسے اس طرح دوڑتے دیکھ کر وہ اپنی حیرت کو کسی طرح نہ
دبا سکا۔ خود رفیق بھی بوڑھا تھا اور اب اس میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ زیادہ تیز چل بھی
سکتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی ضعیفی کے خیال کے باوجود بھی حتی الامکان کرمل کے قریب پہنچنے کی
کوشش کر رہا تھا۔

دفعتاً اسے ایک فائر کی آواز سنائی دی اور اس نے کرمل کی چیخ بھی صاف پہچان لی۔ پھر کسی
کے گرنے کی آواز آئی۔ رفیق دیوانوں کی طرح چیختا ہوا آواز کی طرف دوڑ رہا تھا۔

پھر دو گھنٹے کے بعد کرمل کے خاندان کے سارے افراد اس کی لاش کے گرد جمع تھے۔ دولت
گنج تھانے سے پولیس بھی آگئی تھی۔ لاش ابھی تک اسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں کرمل گرا تھا۔

کیپٹن اشرف پولیس انسپکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ”ہم لوگوں نے فائر کی آواز سنی، پھر پے درپے
چینیں سنائی دیں۔ ہم سب دوڑ کر ادھر آئے تو چچا جان کو اس حال کو پایا۔“

”کیا یہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی تھے۔“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”نہیں پائیں باغ میں بیٹھے اپنے زخم کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔“

”ان کے پاس اور کون تھا۔“

”ان کا خادم خصوصی رفیق۔“

”وہ کہاں ہے۔“

”اس کم بخت کو تو ہم بہت دیر سے تلاش کر رہے تھے۔“ کیپٹن اشرف کا باپ سلیم بھرائی
دنی آواز میں بولا۔

”ان دونوں کے علاوہ اور باغ میں کون تھا۔“

”ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔“ کیپٹن اشرف نے اپنی آنکھوں پر رومال پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہم
سب اندر تھے۔“

”آپ کے گھر والوں میں سے کوئی باہر تو نہیں۔“

”ہاں.... میرا بھانجا اکثر قدیر....!“ سلیم نے کہا۔

”کب سے باہر ہیں۔“

”صبح سے.... غالباً شہر گیا ہوا ہے۔“

”نوکر جو غائب ہو گیا ہے اس کا گھر کہاں ہے۔“

”وہ ہمیشہ بھائی صاحب کے ساتھ ہی رہتا تھا۔“ سلیم نے کہا۔

”کیا اس سے اُن کی کبھی لڑائی ہوئی تھی۔“

”میرے خیال سے تو کبھی نہیں۔“ سلیم نے اپنی روپائی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی
صاحب اُس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔“

”کیا آپ سب نے فائر کی آواز سنی تھی۔“

”ہم نے تو سنی تھی کیپٹن اشرف نے کہا اور پھر وہ بیگم نواز، عالیہ اور اپنی پھوپھی بیگم عارف
کی طرف مخاطب ہوا جو تھوڑی دور پر کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انہوں نے بھی اس

کے بیان کی تائید کی۔ سبھی نے فائر کی آواز صاف سنی تھی۔ چیخوں کے متعلق اُن میں اختلاف تھا۔
کسی کا خیال تھا کہ وہ رفیق کی چیخیں تھیں اور کوئی کہتا تھا کہ وہ خود کرمل جو اچھی رہا تھا۔

سب انسپکٹر لاش پر جھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”لیکن ان کی موت گولی لگنے سے نہیں ہوئی۔“ پھر وہ کرمل کے ہاتھ میں دبے ہوئے

رویالور کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ماتھے پر تفکر کی گہری لکیر نمایاں ہو گئی تھیں۔

”کتنے فائر کی آوازیں سنی گئی تھیں۔“ اس نے کیپٹن اشرف سے پوچھا۔

”صرف ایک۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ اشرف نے کہا اور اپنے گھر والوں کی طرف دیکھنے

”غائب ہو جانے والے ملازم کا حاضر ہونا ضروری ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ اس کے بعد
بچہ رنجی اور قانونی کاروائیاں ہوئیں اور لاش وہاں سے اٹھوا کر تھانے کی طرف روانہ کر دی گئی۔

پھول کا ڈنک

تین دن گذر گئے مگر رفیق کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس دوران میں گھر والوں میں سے کئی نے پہلی
دعویٰ سے چلے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن پولیس نے انہیں اس وقت تک کے لئے روک دیا جب
ہی کہ تحقیقات مکمل نہ ہو جائے۔

کرنل کی سالی بیگم نواز خاص طور سے چلے جانے پر مصر تھیں کیونکہ کرنل کے بعد ان کا
یہاں ٹھہرنا بعید از مصلحت تھا۔ دوسری طرف وہ اپنی لڑکی عالیہ کی طرف سے بھی متفکر تھیں
کیونکہ بیگم عارف کا لڑکا نصیر اُسے ہر وقت گھورتا رہتا تھا۔ کیپٹن اشرف بھی اس میں خاصی دلچسپی
لیتا تھا۔ ڈاکٹر قدیر ہی صرف ایسا تھا جو اس کی طرف کبھی توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔

کرنل نے باقاعدہ یا بے قاعدہ طور پر کوئی وصیت نامہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے قانونی طور پر
اس کا جائز وارث کیپٹن اشرف کا باپ سلیم قرار پایا تھا، حالانکہ سلیم بیگم نواز کو روکے رکھنے پر مصر
تھیں لیکن بیگم نواز بڑی طرح الجھی ہوئی تھیں۔ یہاں وہ اگر کرنل کے بعد کسی سے زیادہ بے تکلف
تھیں تو وہ ڈاکٹر قدیر تھا۔ وہ بھی آج کل زیادہ تر باہر ہی رہتا تھا۔ حالانکہ کرنل کی طرح سلیم بھی
اس کا حقیقی ماموں تھا لیکن وہ سلیم سے زیادہ مانوس نہیں تھا۔ کرنل کی زندگی میں بھی ان دونوں
میں بہت ہی کم گفتگو ہوتی تھی۔ البتہ کیپٹن اشرف سے اس کی گاڑھی چھتی تھی لیکن نہ جانے کیوں
آج کل وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے کھینچے کھینچے رہتے تھے۔

کرنل کی پراسرار موت کے بعد سے پورے گھر پر ایک عجیب سی ویرانی چھا گئی تھی۔ ہر قسم
کے کھیل تماشے بند تھے۔ ڈاکٹر قدیر اور کیپٹن اشرف نے لمبیر دھلیان ترک کر دیا تھا۔ بیگم نواز اور
بیگم عارف نے بھولے سے بھی شطرنج کی بساط نہیں بچائی۔ بہر حال ہر شخص قریب قریب تھوڑا
بہت مضطرب ضرور تھا۔ مگر نصیر اس کے مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی شراب
کے نشے میں عالیہ کو چھیڑتا رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کی ان حرکتوں سے عاجز آ گئی تھی۔ مگر خاموشی

لگا۔ اس کے اس بیان کی بھی تائید کی گئی۔

”تب تو وہ فائر اسی ریوالور سے ہوا تھا۔“ سب انسپکٹر نے ریوالور کی نال کو اپنے ہاتھ کے
قریب لے جاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں سے صرف ایک گولی چلائی گئی ہے اور کچھ دیر قبل۔“
”تو پھر موت کس طرح واقع ہوئی۔“ سلیم نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔ ”آپ کہتے ہیں
کہ ان کے گولی بھی نہیں لگی۔“

”مجھے خود حیرت ہے۔“ سب انسپکٹر نے لاش پر ٹارچ سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر وہ
ایک بیک چونک کر کرنل کے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ تلوے میں زخم کیسا۔“ اس نے کہا۔

”یہ تو تقریباً ایک ماہ قبل سے تھا۔“ کیپٹن اشرف بولا۔

”تو کیا یہ عموماً ننگے پیر ہی چلا کرتے تھے۔“

”جی نہیں.... ابھی آپ سے بتایا کہ باغ میں بیٹھے اسی زخم کی مرہم پٹی کر رہے تھے اور ان
کا خادم ان کی مدد کر رہا تھا۔“

”کیا وہ زخم کی پٹی خود ہی کیا کرتے تھے۔“

”نہیں! ڈاکٹر قدیر کرتے تھے، لیکن وہ آج صبح ہی سے گھر پر موجود نہیں تھے۔“

”کیا اس سے قبل بھی کبھی انہیں اپنے ہاتھ سے مرہم پٹی کرنی پڑی تھی۔“ سب انسپکٹر نے
پوچھا۔

”ہمیں اس کا دھیان نہیں۔“ سلیم نے کہا۔

”کیا آج یا اس دوران میں کسی سے ان کا جھگڑا ہوا تھا۔“

”میرے خیال سے تو نہیں۔“

”ان کا کوئی دشمن بھی تھا۔“

”یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔“ سلیم بولا۔ ”میں تقریباً دو سال سے یہیں مقیم ہوں۔ میں نے
انہیں کبھی لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ البتہ وہ اکثر ہم میں سے کسی سے ناراض ہو جایا کرتے تھے۔
عمر کافی تھی اس لئے کچھ چڑے ضرور ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا وہ چڑچڑاہٹ بھی ہم ہی لوگوں تک
محدود رہتا تھا۔“

کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ شوہر سے پہلے ہی جھگڑا ہو چکا تھا۔ اب وہ اس سر پھرے لڑکے کی بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کیپٹن اشرف نصیر کو کئی بار اس کی حرکتوں پر ڈانٹ چکا تھا۔ عالیہ کے چھٹرنے کے معاملے میں وہ نہ جانے کیوں خاموش رہتا۔ لیکن جب نصیر بھدے اور بے ہنگم سروں میں امریکن لڑکے میں کوئی انگریزی گیت چھیڑ دیتا تو کیپٹن اشرف جھلائے بغیر نہ رہتا۔ آج بھی وہ دوپہر کے کھانے کی میز پر اس پر برس رہا تھا۔

”تم آخر اپنی بے ڈھنگی کی حرکتوں سے باز کیوں نہیں آتے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں پچا جان کی اچانک موت سے خوشی ہوئی ہو۔“

”بھلا مجھے کیا غم ہو سکتا ہے۔“ نصیر ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”جب کہ مجھے ان کی جائیداد سے ایک حبیہ بھی ملنے کی امید نہیں۔“

”نصیر....!“ اس کی ماں گرج کر بولی اور ڈاکٹر قدیر مسکرانے لگا۔

”نصیر میاں....!“ سلیم نے کہا۔ ”میں یہاں تم سب سے بڑا ہوں۔ کم از کم تمہیں میرا لانا تو کرنا ہی چاہئے۔“

نصیر نے اپنی پلیٹ ایک جھٹکے کے ساتھ آگے سر کا دی اور اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

”عجیب لڑکا ہے۔“ سلیم نے چھپنی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”آپ ہی نے سر چڑھا رکھا ہے۔“ بیگم عارف بولیں۔

”بچہ ہے۔“ سلیم نے کہا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔

بیگم نواز، عالیہ اور ڈاکٹر قدیر بالکل خاموش تھے۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر رفیق کہاں گیا۔“ سلیم نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”مزے کر رہا ہوگا۔“ بیگم نواز نے کہا۔ ”پتہ نہیں نمک حرام نے یہ حرکت کیوں کی۔“

”نہیں.... میں اس کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا۔“ سلیم آہستہ سے بولا۔ ”وہ بچپن ہی

سے ہمارے یہاں رہا ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔“

پھر وہ مستفسرانہ انداز میں ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں خود بھی یہی سوچتا ہوں۔“ ڈاکٹر قدیر نے کہا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔ پھر تھوڑی

بر بعد سر اٹھائے بغیر بولا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ عجیب و غریب ہے۔“

”کیا....؟“ سلیم نے چونک کر نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا اور ڈاکٹر قدیر کی طرف دیکھنے لگا۔

”معدے میں زہر کے اثرات نہیں پائے گئے۔“ ڈاکٹر قدیر نے کہا۔ لیکن....!“ اس نے

اپنی نظریں سلیم کے چہرے پر جمادیں۔ ”موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔“

”زہر....!“ سب بیک وقت بولے۔

”خون میں اچانک تیز قسم کا زہر پھیل جانے کی وجہ سے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔“

ڈاکٹر قدیر خاموش ہو کر اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔ بقیہ لوگ ہاتھ روکے ہوئے اس کی

طرف دیکھ رہے تھے۔

”ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ پیر کے زخم کے ذریعہ جسم میں زہر داخل ہوا۔“ قدیر نے آہستہ

سے کہا۔ ”اور خود میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”تو رفیق....!“ کیپٹن اشرف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”خدا ہی بہتر جانے۔“ ڈاکٹر قدیر بولا۔

”شاید کسی زہریلی چیز پر پیر پڑ گیا۔“ عالیہ نے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

سلیم کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور آنکھوں میں دہی سی بے چینی

کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ کھانا کھانے کے بعد خاموشی سے اٹھ گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر کچھ

نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سلیم نے کیپٹن اشرف کو برابر والے کمرے سے آواز دی اور وہ اٹھ کر وہاں

چلا گیا۔

سلیم بے تابانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ....!“ اس نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا لاہری میں آیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سلیم نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ کیپٹن اشرف اُسے متحیرانہ انداز میں

دیکھ رہا تھا۔

”تم نے سنا....“ قدیر کیا کہہ رہا تھا۔“ سلیم کیپٹن اشرف کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

اشرف نے اثبات میں سر ہلادیا اور اس کی آنکھیں ابھی تک سوالیہ انداز میں سلیم کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”آخر یہ کیسا زخم تھا جو ایک ماہ کے علاج کے باوجود بھی ہر اسی رہا؟“ سلیم نے پوچھا۔
 ”میں نے تو اسے ایکویمایہ کی کوئی قسم سمجھتا ہوں۔“ کیپٹن اشرف نے کہا۔
 سلیم تھوڑی دیر تک اشرف کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے قدیر پر اعتماد نہیں ہے۔“
 ”جی....!“ دفعتاً اشرف چونک پڑا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”زخم کا علاج قدیر ہی کر رہا تھا۔ وہی بینڈیج وغیرہ بھی کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس دن سے قبل کبھی وہ بینڈیج کے وقت باہر نہیں رہا۔“

”تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چچا جان کی موت میں قدیر کا ہاتھ ہے۔“ اشرف اٹھتا ہوا ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”بیٹھ جاؤ.... بیٹھ جاؤ۔“ سلیم نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔“
 ”جی....!“ اشرف کا لہجہ بدتمیزی سے بھی کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔
 سلیم اسے گھورنے لگا۔

”تم مجھ سے گفتگو کر رہے ہو۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔
 اشرف کچھ نہ بولا۔ وہ ہونٹ سکڑے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ سلیم کی طرف مڑا۔
 ”لیکن ایک بیک آپ اس نتیجے پر کیوں پہنچے۔“

”بھائی جان کی وہ دولت جس کا علم کسی کو نہیں۔“
 ”یعنی....!“

”وہ جو اثبات جو وہ افریقہ سے لائے تھے۔“

”لیکن انہوں نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“ اشرف نے کہا۔

”میں نے آج سے دس سال قبل انہیں دیکھا بھی تھا۔“ سلیم آہستہ سے بولا۔ ”لیکن اب ان

کا کہیں پتہ نہیں۔“

”ممکن ہے چچا جان نے انہیں فروخت کر دیا ہو۔“

”قطعی ناممکن.... اس قسم کی چیزیں اسی وقت فروخت کی جاتی ہیں جب نقد روپیہ نہ ہو۔“

ہوئی جان کے پاس ہمیشہ نقد روپیہ رہا ہے۔“

”تو پھر آپ قدیر ہی پر کیوں شبہ کر رہے ہیں، ریفیق بھی تو غائب ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی جان کے سارے معاملات سے واقف بھی تھا۔“

”میں بھی بچے ہو۔ اگر ریفیق کو بھاگنا ہی ہوتا تو وہ اتنا پیچیدہ راستہ کبھی نہ اختیار کرتا۔ اگر وہ ان پردوں کی موجودگی سے واقف تھا تو انہیں بہ آسانی چرا کر بھی فرار ہو سکتا تھا۔ بھائی جان کی ہمت کا خواہاں کیوں ہوتا۔“

”کچھ بھی ہو۔“ کیپٹن اشرف نے کہا۔ ”میں قدیر کی طرف سے بڑے خیالات نہیں رکھ سکتا۔“
 ”خیر....!“ سلیم نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کر دیا۔ نہ جانے کیا مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میری زندگی کی گھڑیاں بھی پوری ہو رہی ہیں۔“

”واہمہ ہے۔“ کیپٹن اشرف اٹھتا ہوا بولا۔

”فہم....!“ سلیم نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ پھر وہ دونوں اس کمرے میں آئے جسے کمرل دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔
 ”بیٹھو....!“

اشرف بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ اور بیزاری کے طے جلے اثرات پائے جا رہے تھے۔
 سلیم نے صبح کی ڈاک کے بندل سے ایک لفافہ نکال کر اشرف کے سامنے ڈال دیا۔
 لفافے پر سلیم کا نام اور پتہ تحریر تھا۔ اشرف نے اس کے اندر کا کاغذ نکالا اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھ کر مضحکہ انداز میں مسکرانے لگا۔

کاغذ پر کسی عجیب و غریب جانور کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کا جسم تو مونو کا سا تھا لیکن سر۔ وہ ناممکنہ خیز تھا کہ اشرف اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ سر کسی پرندے سے مشابہت رکھتا تھا، جسم پر اسی طرح کی دھاریاں تھیں جیسی چیتے کے جسم پر پائی جاتی ہیں۔

تصویر کے نیچے انگریزی ٹائپ کے حروف میں یہ الفاظ تحریر تھے۔

”میں اس لڑکی کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نہ سن سکا اس لئے تم پر ہمیشہ نحوست کا سایہ رہے گا۔“

تصویر پر نظر ڈالنے ہی اشرف سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ سلیم خود بخود بڑبڑایا۔

”یہ کس نے بھیجا ہے؟“ اشرف نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ سلیم نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ”لیکن اس بات پر بھی یقین نہیں آتا کہ کسی نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بھائی جان کو بھی مرنے سے قبل اسی قسم کی کمی الجھن سے دوچار ہونا پڑا ہو۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا۔“ اشرف نے بے بسی سے کہا۔

”میں کہتا ہوں آخر بھائی جان اس دوران میں ہر وقت اپنے پاس بھرا ہوا ریوالور کیوں رکھے لگے تھے۔“

”اس کے متعلق اکثر میں نے بھی سوچا ہے۔“ اشرف نے کہا۔

”اور وہ بھاگ کر باہر کیوں گئے تھے اور انہوں نے کس پر فائر کیا تھا۔“

”یہ چیز بھی غور طلب ہے۔“ اشرف پر تشویش انداز میں بولا۔ ”خیر تو میں اس خط کو دولت گنج کے تھانے میں پہنچائے دیتا ہوں۔“

”نہیں.... میں خود ہی انسپکٹر سے ملوں گا۔“ سلیم نے اشرف کے ہاتھ سے لفافہ لے کر پھر

دوسرے خطوط کے درمیان رکھ دیا۔

”لیکن قدر....!“ اشرف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔“ سلیم نے کہا۔

”آپ نصیر کے متعلق کیوں نہیں سوچتے جبکہ اس تحریر کی روشنی میں اس کی سازش کے امکانات موجود ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ابھی آپ اس کا امکان بھی ظاہر کر چکے ہیں کہ چچا جان کو بھی اس قسم کا کوئی خط ملا ہوگا۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ چچا جان نے کبھی اُسے عالیہ کو چھیڑنے پر لعنت ملامت کی ہو اور اسے اس غصہ آگیا ہو۔ اس تحریر میں بھی کسی لڑکی کا تذکرہ موجود ہے اور آپ اس جملے کا مطلب بھی

جنوبی سمجھتے ہوں گے۔ بیگم نواز بیباں سے کبھی کی چلی گئی ہوتی، لیکن پولیس نے ہر ایک کی نقل

حرکت پر پابندی لگادی ہے۔ وہ چچا جان کی زندگی میں ہی جانے کے لئے تیار تھیں۔“

”خدا جانے....!“ سلیم اکتا کر بولا۔ ”لیکن مجھے نصیر اتنا ذہین نہیں معلوم ہوتا۔ بد تمیز

نہر ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اتنی سی بات پر خون کر دینے پر آمادہ ہو جائے۔ عالیہ کے

مٹلے پر میں بھی دو ایک بار اُسے ڈانٹ چکا ہوں۔“

”نصیر اور صرف نصیر....!“ اشرف آہستہ سے بڑبڑایا۔

”لیکن پھر جو اہرات کہاں گئے۔“

”بہر حال میں بھی اس خط کو محض مذاق سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے پیچھے کوئی گہری

ملاش کام کر رہی ہے۔“ اشرف نے کہا۔

سلیم نے میز کی دراز سے ایک ریوالور نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

سلیم دن بھر اکتایا اکتایا سا نظر آتا رہا۔ نصیر سب سے ناراض ہو کر پور ٹیکو میں ٹہل رہا تھا۔

ڈاکٹر قدیر حسب معمول کھانا کھا کر شہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پور ٹیکو میں نصیر کی ماں بیگم عارف

بھی دکھائی دی۔ دونوں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے تھے۔ نصیر کی حرکات و سکنات سے غصہ

ظاہر ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی آواز بلند بھی ہو جاتی تھی۔ بیگم عارف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے

ٹھانڈا کر لے جانا چاہا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور پھولوں کی

کیاریاں پھلانگتا مہندی کی قد آدم باڑھ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

بیگم عارف چند لمبے کھڑی سورتی رہی پھر وہ بھی اندر چلی گئی۔

گر میوں کی دوپہر تھی۔ دھوپ میں تیزی ضرور تھی، لیکن ہوا گرم نہیں تھی۔ پھر بھی کھانا

لکا چکے کے بعد وہ سب تقریباً اونگھنے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ سو گئے اور کچھ اونگھتے رہے۔ بیگم

عارف اور بیگم نواز نصیر کے رویے پر لڑ جھگڑا کو سونگئی تھیں۔ عالیہ اپنے کمرے میں کوئی کتاب پڑھ

رہی تھی۔

تین بجے ڈاکٹر قدیر خلاف توقع واپس آگیا۔ نصیر تو اسی وقت سے غائب تھا اور اشرف شائد

”دلت گنج“ کے تھانے کی طرف نکل گیا تھا۔

چار بجے دفعتاً پائیں باغ میں شور سنائی دیا۔

اور پہلی کوٹھی والوں کو ایک دوسرے حادثے کے لئے تیار ہو جانا پڑا۔ سلیم عقیق البحر کی

نیلایوں کے قریب پڑا کر رہا تھا۔

”کیا ہوا....!“ قدیر بے تحاشہ اس پر جھکتا ہوا بولا۔

”اشرف.... اشرف.... بیٹے۔“ سلیم کر بناک انداز میں چیخا۔ ”وہی سوز.... وہی سوز۔“

”کیا ہوا....!“ قدیر نے اُسے پھر جھنجھوڑا اور سلیم کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے غرور جھانکنے لگی۔

”اشرف....!“ وہ پھر چیخا۔

اتنے میں اشرف پھانک میں داخل ہوا۔ کیاریوں کے قریب بھیڑ دیکھ کر وہ بے تحاشہ دواڑا ”ارے یہ کیا ہوا....؟“

”اشرف....!“ سلیم پھر چیخا۔ وہ اپنی ایک انگلی اس طرح دبائے ہوئے تھا جیسے کانٹا لگا ہوا۔ ”یہ کیا ہوا....!“ اشرف اُسے اٹھانے کے لئے جھک گیا۔

”بیٹے....!“ سلیم اشرف کی آغوش میں چیخا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

”ارے یہ کیا ہوا۔“ اشرف لاش سمیت دھڑام سے زمین پر آ رہا؟ وہ بیہوش ہو چکا؟ عورتیں بُری طرح چیخ رہی تھیں۔

ڈاکٹر قدیر نے بدقت تمام بیہوش اشرف کو سلیم کی لاش سے الگ کیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی اور اس بار خانہ تلاشی ہوئی کیونکہ ڈاکٹر قدیر نے اس موت کو کسی سرِ بلیع الاثر زہر کا نتیجہ قرار دے دیا تھا۔ مرنے والے کے ناخن پیلے پڑ گئے تھے اور اس کے د سے ہرے رنگ کا رقیق مادہ بہہ رہا تھا۔

ان کیاریوں میں دیکھ بھال کرنے پر پولیس کو وہاں ایک بھرا ہوا ریو الوور پڑا ملا جس سے اب بھی گولی نہیں چلائی گئی تھی۔ اشرف نے اس ریو الوور کی شناخت کرتے ہوئے وہ عجیب و غریب پولیس کے حوالے کر دیا، جو آج صبح ڈاک سے اس کے باپ کو موصول ہوا تھا۔

اس دن نصیر بہت رات گئے واپس آیا اور نہ جانے کیوں وہ اس موت پر بے اختیار رو رہا حالانکہ کرل کی موت پر اس کی آنکھیں بھیگی تک نہیں تھیں۔

وہ جانور

صبح بہت خوشگوار تھی، ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ سرجنٹ حمید فریدی کی کوٹھی کے عقبی پارک میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے کھڑا تھا۔ چہرہ بھی اوپر ہی کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایڑیاں اٹھائے بغیر اپنا جسم آہستہ آہستہ اوپر کی طرف تان رہا ہو۔ اس کی رگیں پھول آئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایک ننھا مناسفا کس ٹیریز اس کے پیروں سے لگا ہوا ان سے اپنا جسم رگڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھونکتا ہوا اس کے گرد پھر لگا کر اس کی پتلون کا بانچہ کھینچنے لگتا۔

”ہوں۔ ہوں۔“

کتے نے پھر اس کا پانچینچہ کھینچا۔

”ابے ہٹ....!“ حمید بدستور ہاتھ اٹھائے بولا۔

اب کی کتے نے جست لگائی اور اس کے سینے تک آ گیا۔ حمید اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

”ارے.... تیری.... سوت کے بچے۔“ وہ جھلا کر اس کے پیچھے دوڑا۔ کتا کوٹھی کی طرف

بھاگ رہا تھا اور حمید اس کے پیچھے تھا۔ دفعتاً فریدی نے اُسے آواز دی جو لا بیریری کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

حمید اس کی طرف پلٹ آیا۔

”اندر آؤ....!“ فریدی نے کہا۔

”پہلے اس ککی کے بچے کی ٹانگیں توڑ دوں۔“

”کیوں خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑے ہو۔“

”خواہ مخواہ....!“ حمید بھنا کر بولا۔ ”میں ان سارے کتوں کو چن چن کر زہر دے دوں گا۔“

”چلو خیر! تمہیں شاید یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کتوں کو کونسا زہر دیا جاتا ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

حمید جھنجھٹا ہوا لا بیریری میں چلا گیا۔

”تو کیا آپ رات بھر یہیں بیٹھے رہے۔“ حمید نے فریدی کو گھورتے ہوئے کہا۔

فریدی اس وقت بھی وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا جو اس نے کچھلی رات کو پہن رکھے تھے اور میز پر رکھا ہوا ایش ٹرے سگار کے جلتے ہوئے ٹکڑوں سے پُر تھا۔

”ہاں....!“

”کیوں....!“

”میں آج کل بہت پریشان ہوں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میں آپ کی پریشانی کی وجہ دریافت نہیں کروں گا۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔

”کیوں....!“

”اس لئے کہ میں اس سے واقف ہوں۔“

”کیا....؟“

”شہر میں کسی عورت نے کوئی ایسا پتھر جن دیا ہو گا جس کے تین سر ہوں گے۔“ حمید نے کہا۔
فریدی بے اختیار مسکرا پڑا۔

”یا پھر کوئی گدھا آدمیوں کی طرح بولنے لگا ہو گا۔“ حمید پھر بولا۔

”خیر وہ تو بڑی دیر سے بول رہا ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

حمید کھسیانے انداز میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”میں اس لئے پریشان ہوں کہ تم جیسے کاہل آدمی نے آج کل ورزش کیوں شروع کر دی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”میں آج کل پیناٹوم کی مشق کر رہا ہوں۔“ حمید اڑ کر بولا۔

”اچھا جی!“ فریدی آنکھیں پھیلا کر بولا۔

”جناب والا....!“ حمید نے قدرے جھک کر کہا۔

”بھلا یہ مشق کس قسم کی تھی، جس میں کتا تمہارا ساتھ دے رہا تھا۔“

”قوت ارادی بڑھتی ہے اس سے۔“

”وہ کس طرح۔“

”ایڑیاں اٹھائے بغیر جسم کو تانتا چلاتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں جیسے میں آسمان کو چھو رہا ہوں۔“

”بہت اچھے۔“ فریدی ہنس پڑا۔

”آپ کے لئے ہر بات مضحکہ خیز ثابت ہو جاتی ہے۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔

”خواہ مخواہ جھک مت مارو۔“

”میں بد دل نہیں ہو سکتا۔ اس مشق کو جاری رکھوں گا۔“ حمید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“

”کیوں....!“

”سب سے پہلے اضطراری افعال پر قابو پانا سیکھو۔“ فریدی نے کہا۔ ”اب یہی دیکھو.... خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ہلا رہے ہو۔ اس سے فائدہ۔ جسم کی ہر وہ حرکت جس سے انرجی ضائع ہوتی ہو ذہن کو یکسوئی نہیں دے سکتی۔ پیناٹوم کے لئے ذہن اور جسم کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ تمہارا ذہن تمہارے جسم کی اس حرکت سے قطعی بے تعلق ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ ایک بیک تم پر اس کا بھوت کیوں سوار ہو گیا۔“

”آپ میری ہر بات کو خط کیوں قرار دیتے ہیں۔“ حمید بگڑ گیا۔

”اس لئے کہ تم کسی معاملے میں مستقل مزاج نہیں ثابت ہوئے۔“

”اس بار ثابت کر دکھاؤں گا۔“

”خیر.... خیر.... تم کسی نیک ارادے کے تحت ایسا نہیں کر رہے ہو۔“

”یعنی....!“

”کسی احق نے کہا دیا ہو گا کہ پیناٹوم کی آنکھوں میں بے پناہ کشش پیدا ہو جاتی ہے۔“

”یہ تو مسلمہ ہے۔“

”اور اسی لئے تم پر پیناٹوم کا خط سوار ہو رہا ہے۔ تاکہ بوڑھی عورتوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ کیوں ہے نا یہی بات۔“

”آپ کے سر پر تو ہر وقت عورت سوار رہتی ہے۔“ حمید نے فریدی کے لہجے کی نقل اتاری۔

”بہت اچھے۔“ فریدی ہنس پڑا۔

”میں یہ پوچھ رہا تھا کہ آخر آپ کچھلی رات سوئے کیوں نہیں۔“ حمید نے کہا۔

”میں نے یہی بتانے کے لئے تمہیں آواز دی تھی۔“ فریدی بولا۔ ”کل تم بیکاری کی شکایت

کر رہے تھے۔“

”آئی شامت.....!“ حمید منہ بنا کر بولا۔

”درو نہیں۔“ فریدی نے کہا اور میز کی دراز سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر حمید کی طرف بڑھا دیا۔
حمید اس کاغذ کو دیکھتے ہی پہلے تو ہنسا پھر اس طرح منہ بنانے لگا جیسے رو دینے کا ارادہ کر رہا ہو۔
”کیوں.....؟“ فریدی نے اُسے اپنی طرف مخاطب کیا۔

”میں ہنسا اس لئے کہ چلو پیچھا چھوٹا اور رویا اس لئے کہ اب چھوٹے چھوٹے بچے آپ پر پتھر چلائیں گے۔“ فریدی بے اختیار مسکرا پڑا۔

”یہی وہ تصویر ہے۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”جسے دیکھ کر حاتم طائی نے کہا تھا، ایک بار دیکھا ہے دوسری بار چشمہ لگا کر دیکھنے کی ہوس ہے اور خاتم اس کلمے کو سن کر اتار دیا تھا کہ بحر عرب کی ساری مچھلیاں درختوں پر چڑھ گئی تھیں اور پھر جب تک حمام باد گرد کا پتہ نہیں لگ گیا تھا ماہی گیر درختوں پر پتھر چلا کر اپنی بساواقت کرتے رہے تھے..... اور.....!“

”شٹ اپ.....!“

حمید منہ سکڑ کر وہ کاغذ واپس کرنے ہی جا رہا تھا کہ رک کر پھر کچھ دیکھنے لگا۔

پھر وہ دانت پر دانت جما کر بولا۔ ”ہائے ہائے یہ کس لڑکی کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ ہے۔“

”ادھر لاؤ۔“ فریدی نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر کہا۔ ”اب چپ چاپ یہاں سے چل دو۔“

”آخر اس ناراضگی کی وجہ۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”تم کسی وقت سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔“

”تو کیا واقعی یہ سنجیدگی کا موقع تھا۔“

”بکومت.....!“

”کمال کر دیا آپ نے۔“ حمید بھنا کر بولا۔ ”بے تکتے کارٹون دیکھا کر مجھے سنجیدہ رہنے کی تلقین فرماتے ہیں..... کیا سچ سچ۔“

”جی ہاں..... میرا دماغ چل گیا ہے۔“ فریدی نے منہ سکڑ کر کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ حمید تھوڑی دیر بعد پھر مسکرا دیا۔

”اگر آپ رات بھر مصوری کی مشق کرتے رہنے کے بعد اتنی حسین تصویر بنانے میں

کامیاب ہوئے ہیں تو میں تمہ دل سے آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنے کے امکانات پر غور کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

حمید اس کی سنجیدگی دیکھ کر ایک بیک چونک پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ فریدی سچ سچ سنجیدہ ہے۔ پھر اس کی نظر جواب طلب انداز میں فریدی کے چہرے پر جم گئی۔

”دولت گنج کی عمارت پیلی کوٹھی کے کیس کے متعلق اخبار میں کچھ دیکھا تھا۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”ہاں..... ہاں..... وہی کرئل شمشاد.....!“

”جی نہیں کرئل جواد..... تمہاری یادداشت بڑی مایوس کن ہے۔“

”چلئے..... نام سے شخصیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پھر پرسوں اس کا بھائی بھی پراسرار حالات میں موت کا شکار ہو گیا۔“

”کل کے اخبار میں یہ بھی پڑھا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی ہی شامت

آئے گی۔ لہذا شامت آنے سے پہلے ناشتہ تو کر لیجئے۔“

فریدی پھر اسے گھورنے لگا۔

”اس طرح کیوں گھور رہے ہیں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔“

”تم احمق ہو۔“ فریدی نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوکر آیا۔

”چائے پیہیں دے جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور نوکر چلا گیا۔

”یہ کیس دولت گنج کے تھانے سے اپنے یہاں بھیج دیا گیا ہے۔“ فریدی اس کاغذ کے ٹکڑے

پر نظر جساتے ہوئے بولا۔

حمید کچھ نہ بولا اور کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور باہر نرم نرم گھاس پر بڑے ہوئے نفرتی قطروں سے کئی طرح کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔

”اور یہ خط“ فریدی حمید کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سلیم کو اسی صبح کو موصول ہوا تھا جس دن

اس کی موت واقع ہوئی۔“

”کون سا خط.....!“ حمید نے پوچھا۔

”بہی....!“ فریدی نے کاغذ کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”تو آپ نے تفتیش شروع کر دی۔“

”ابھی نہیں.... ابھی تو میں تھا۔ ندادروں کی رپورٹ پر غور کر رہا ہوں۔“

حمید کچھ سوچنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”کرئل کا کوئی نوکر بھی تو غائب ہو گیا تھا۔“

”ہاں.... اور وہ ابھی تک لاپتہ ہے۔“

”اس تصویر کے نیچے کی تحریر عجیب ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اور خود اس تصویر کے متعلق کیا خیال ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”یہ تصویر۔“ حمید تصویر کو فریدی کے ہاتھ سے لے کر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ پھر تھوڑی دیر

تک اس پر نظر جمائے رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ”میرے خیال سے یہ چڑچیت سٹور کی تصویر ہے۔“

”کیا....؟“

”چڑچیت سٹور۔“ حمید محققانہ انداز میں بولا۔ ”کیونکہ سر چڑیا جیسا ہے جسم پر چیتے جیسی

دھاریاں ہیں اور جسم کی بناوٹ اسے سٹور ظاہر کرتی ہے۔ لہذا اس کا نام چڑچیت سٹور ہے۔ ٹمبکو میں

پایا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اکثر پیارے خالو بھی کہتے ہیں۔ بعض

محققین کی رائے ہے خالو نہیں بھالو کہتے ہیں لیکن فابیان اسے جھٹھالو کہنے پر مصر ہے اور ابن

بطوطہ نے تو شفالو کہہ کر بمشکل جان بچائی ہے لیکن اس ناخبر یعنی حمید ولد وحید ساکن پورٹ

سعید کی جان بچتی نظر نہیں آتی۔ الا ماشاء اللہ۔“

”بک چکے....!“ فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔

”یقین نہ آئے تو ہدایت نامہ خاوند کا صفحہ ۲، ۳ ملاحظہ فرمائیے۔“ حمید اُسی موڈ میں بولا۔

”تمام پرائیویٹ حالات کھول کھول کر لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر فائدہ نہ ہو تو ایمان دھرم سے کہہ

دینے پر پوری رقم ہضم....!“

”اب چپ بھی رہو.... ورنہ سر توڑ دوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

اتنے میں چائے آگئی اور حمید یہ بھی بھول گیا کہ اس نے بات کہاں سے چھوڑی تھی۔

فریدی خاموشی سے ناشتے میں مشغول رہا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں کسی

گہری سوچ کا پتہ دے رہی تھیں۔

دفتار برآمدے میں لگی ہوئی گھنٹی بجی۔

”شاید وہ آگئے۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”کون....!“ حمید نے پوچھا۔

”ڈاکٹر قدیر.... اور کیپٹن اشرف....!“

”کون ڈاکٹر قدیر.... راجروپ نگر والا۔“

”نہیں کرئل جواد کا بھانجا۔ ہملٹن روڈ پر جس کا دواخانہ ہے۔“

”اچھا وہ! وہ تو کئی بار کتوں کے سلسلے میں یہاں آچکا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اور کیپٹن اشرف.... کرئل کا بھتیجا اور وارث ہے۔ لیکن میں اُس سے شخصی طور پر واقف

نہیں۔ کل رات کو ڈاکٹر قدیر نے فون پر کہا تھا کہ وہ دونوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”تو یہ کیپٹن اشرف شاید اسی شخص کا لڑکا ہے جس کی موت کرئل کے بعد واقع ہوئی۔“ حمید

نے کہا۔

”بہت دیر میں سمجھے۔“

اتنے میں نوکر دو ملاقاتی کارڈ لے کر آیا۔

”انہیں یہیں لے آؤ۔“ فریدی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر قدیر اور کیپٹن اشرف لا بیریری میں داخل ہوئے۔

رسی گفتگو ہونے کے بعد فریدی نے انہیں ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

”غالباً آپ لوگ اسی کیس کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔“ ڈاکٹر قدیر سے فریدی نے پوچھا۔

”آپ ٹھیک سمجھے۔“ قدیر نے کہا۔

”آپ نہ بھی آتے تو تھوڑی دیر میں ہم ہی آپ تک پہنچتے۔“ فریدی نے سگڑا سلگاتے

ہوئے کہا۔ ”کیونکہ کیس ہمارے محکمے میں آگیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ ڈاکٹر قدیر نے کہا۔ ”ورنہ پولیس سے تو کسی قسم کی توقع نہیں۔“

”آپ کا خیال ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ورنہ اس کیس میں تو کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔“

قدیر اور اشرف چونک کر فریدی کو غور سے دیکھنے لگے۔

”کیا کرئل کو بھی اس قسم کا کوئی خط ملا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہمیں اس کی اطلاع نہیں۔“ کیپٹن اشرف نے قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ قدیر نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

”آپ کے والد کی موت کے وقت انکے قریب کون کون تھا۔“ فریدی نے اشرف سے پوچھا۔
 ”ایک تو میں ہی تھا۔“ ڈاکٹر قدیر نے کہا۔ ”اور تین عورتیں، پانچ نوکر۔“
 ”سب یہیں موجود ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”ان کی چیخ کن کر سب سے پہلے ان کے پاس کون پہنچا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔
 ”میں....!“ ڈاکٹر قدیر نے کہا۔

”وہ غالباً اس وقت زندہ ہی تھے؟“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں....!“

”انہوں نے کچھ کہا تھا۔“

”کچھ نہیں.... اشرف کو پکار رہے تھے۔“

”حالت کیا تھی۔“

”انہوں نے اس طرح اپنی ایک انگلی دبا رکھی تھی جیسے کانٹا لگ گیا ہو۔“

”ہوں.... اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس موت کو بھی زہر ہی کی وجہ قرار دیتی ہے۔“

فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”جی ہاں....!“

”اور زہر پھیلنے کا ذریعہ غالباً وہ کانٹا قرار دیا گیا ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر قدیر بولا۔

”میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی پڑھی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خیر.... ہاں تو....“

اس ملازم رفیق کے علاوہ بھی آپ کسی کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔“

”ہمارا شبہ تو اس پر بھی نہیں۔“ کیپٹن اشرف نے کہا۔

پھر اس نے رفیق کے متعلق فریدی کو سب کچھ بتا دیا۔

”اچھا اس تصویر کے نیچے والی تحریر پر بھی آپ کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”قطعی نہیں....“ کیپٹن اشرف بولا۔ ”خود والد مرحوم اسے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے تھے۔“

فریدی کچھ اور پوچھنے جا رہا تھا کہ دفعتاً ڈاکٹر قدیر بول پڑا۔

”ٹھہرئیے.... اس وقت اب ایک بات اور یاد آرہی ہے، جو میں اپنے بیان میں لکھوانا بھول

گیا تھا۔“

فریدی اُسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”چھوٹے ماموں نے اشرف کو پکار کر یہ بھی کہا تھا.... وہی سور.... وہی سور۔“

”اوہ....!“ فریدی کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔ ”یہ بہت اہم بات تھی۔“

وہ آہستہ سے بولا۔ ”کوئی اور بات۔“

”اور کچھ نہیں.... بس دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے۔“

”اور ان کا پستول عقیق الحجر کی کیاری میں ملا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

فریدی کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

”بہتر ہے میں گیارہ بجے تک آپکے یہاں آؤں گا۔ گھر کے ہر فرد کی موجودگی ضروری ہے۔“

تھوڑی دیر وہ بعد دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

”کیوں بھی کیا خیال ہے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔

”ان حضرات کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے کو وہ سؤر دکھائی بھی دیا تھا۔“

”معلوم تو یہی ہوتا ہے۔“

”اور آپ اس پر یقین رکھتے ہیں۔“

”میں نے یہ بھی تو نہیں کہا۔ ویسے ڈاکٹر قدیر کے بیان کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہو گا.... لیکن میں یقین کرنے کیلئے تیار نہیں کہ اس قسم کے کسی سؤر کا وجود بھی ہے۔“

حمید نے کہا۔

”ٹھیک ہے اس کی کوئی مستقل قسم نہیں ہے لیکن ایک آدھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا تم

نے چار آنکھوں اور تین سینگوں کے تیل نہیں دیکھے۔“

”بہت دیکھے ہیں لیکن....!“

”فکر کی بات نہیں! فی الحال اس جانور کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔“

”پھر....!“

”پھر کچھ بھی نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس وقت تم نے پیسڑیاں بہت کم کھائیں۔“

گوشت میں دھواں

فریدی اور حمید کئی گھنٹے سے پہلی کوٹھی میں چھان بین کر رہے تھے۔ نصیر کے علاوہ گھر کے سارے افراد موجود تھے۔ نصیر غالباً صبح ہی سے غائب تھا۔ فریدی نے کرنل کے کاغذات بھی دیکھے۔ اس کی خواب گاہ کا بھی جائزہ لیا۔ پھر کیپٹن اشرف نے فریدی کو بھی بتایا کہ اس نے اپنے باپ کی زبانی کرنل کے کچھ جواہرات کا تذکرہ بھی سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا.... کہ وہ غائب ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ خود اس قسم کی کسی چیز سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا۔

”کیا انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ جواہرات رکھے کہاں جاتے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں انہوں نے یہ نہیں بتایا۔“

”تو پھر آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ گمشدہ نوکر رفتی کی طرف سے مشکوک ہیں۔“

”والد صاحب کا شبہ اس پر نہیں تھا۔“

”کیا انہوں نے کسی اور پر بھی شبہ ظاہر کیا تھا۔“ فریدی نے پوچھا اور پھر اس نے یہ محسوس کیا کہ کیپٹن اشرف کچھ ہچکچا رہا ہے۔

”اس سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اب میں کیا بتاؤں! انہوں نے ایسی بات کہی تھی کہ یہ سمجھ لیجئے....!“ کیپٹن اشرف کچھ

کہتے کہتے رک گیا۔

”کہتے کہتے۔“

”اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ پر بھی شبہ کر سکتے تھے۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ فریدی نے کہا۔ ”صاف صاف کہتے نا۔“

”بس یہی سمجھ لیجئے۔“

”لیکن آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔“

اشرف خاموش ہو گیا۔ وہ بے بسی سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس بات کے چھیڑ دینے پر پشیمان ہو۔

”دیکھئے۔“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔ ”جب تک آپ لوگ صاف صاف باتیں نہ بتائیں گے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔“

”کس طرح کہوں۔“

”وہ تو بتانا ہی پڑے گا۔“ اس بار فریدی کا لہجہ قدرے درشت تھا۔

”انہیں بھائی قدر پر شبہ تھا۔“ اشرف نے آہستہ سے کہا۔

”شعبے کی وجہ بھی بتائی تھی انہوں نے۔“

اشرف نے اپنی اور اپنے والد کی وہ ساری گفتگو دہرا دی جو اس کے مرنے سے چند گھنٹے پیشتر ہوئی تھی، لیکن اس نے نصیر کے متعلق کچھ نہ کہا۔ اُس نے یہ نہیں بتایا کہ خود اس کا شبہ نصیر پر تھا۔

بیانات سے فرصت پانے کے بعد فریدی اور حمید پائیں باغ میں آگئے۔ وہ اسی کیاری کے قریب کھڑے ہوئے تھے جہاں سلیم مرنے سے قبل گرا تھا۔

حمید بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”کیوں کیا کسی خاص نتیجے پر پہنچ گئے ہو۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”کیا....!“

”حسن چاہے جہاں نظر آئے قابل پرستش ہے۔“

”تو تم اتنی دیر اسی پر غور کرتے رہے۔“ فریدی نے منہ بنا کر پوچھا۔

”کیوں کیا اس پر غور کرنا جرم ہے۔“

فریدی کے چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک کیاری کے قریب کی۔

جھاڑیوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”عقیق البحر میں کانٹے نہیں ہوتے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی

ان کیاریوں میں نہیں چھپ سکتا۔ لامحالہ اُسے جھاڑیوں میں چھپنا پڑا ہوگا۔“

”کے چھنا پڑا ہوگا۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہی جس نے سلیم کی انگلی میں زہر کا انجکشن لگایا تھا۔“

”زہر کا انجکشن....!“

”اور کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خود بخود اس کے جسم میں زہر پھیل گیا۔“ فریدی پر خیال انداز میں

بولی۔ ”دولت گنج کی پولیس نے بہت دیر کر دی۔“

”تو پھر کیپٹن اشرف کا شبہ بھی ضرور وزن رکھتا ہے۔“ حمید نے کہا

”ہو سکتا ہے۔“

فریدی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں جھکا ہوا کچھ دیکھتا رہا۔ پھر باہر آگیا۔

اس کے ہاتھ میں حمید نے ایک سرخ رنگ کا رومال دیکھا جو اس کا نہیں تھا۔

”یہ رومال....!“

”جھاڑیوں میں تھا۔“ فریدی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”اشرف نے

ڈاکٹر قدیر پر شبہ ظاہر کیا ہے، لیکن حقیقتاً وہ اس شخص کی طرف سے مشکوک معلوم ہوتا ہے، جس

کا نام اس نے نصیر بتایا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن میں.... میں تو اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ کیا جی

مرنے سے پہلے اُسے وہ عجیب و غریب جانور دکھائی دیا تھا۔“

”میں فی الحال اس کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ضروری نہیں کہ

اُسے وہ سُر دکھائی دیا ہو۔“

”پھر وہ سُر سُر کیوں چیخا تھا۔“

”اس سے یہ تو نہیں ثابت ہو تا کہ اس نے جیججج وہ سُر دیکھا ہی ہو۔ وہ اپنا جملہ نہیں پورا

کر سکا تھا کہ اس کی جان نکل گئی تھی۔ ممکن ہے وہ کچھ اور کہتا۔“

حمید پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہیں یہ نہ بھولنا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کہ زہر کا انجکشن دینے میں بھی کچھ وقت لگا

ہو گا اور سلیم ان جھاڑیوں کے قریب ضرور آیا ہو گا اگر اسے وہ سُر دکھائی دیا ہو تا تو وہ دور ہی سے

اس پر فائر کرتا۔“

”پھر آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ حمید بے چینی سے بولا۔

”یہاں بھی سُر کی تصویر۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”ممکن ہے ان جھاڑیوں میں اسے سُر

کی تصویر دکھائی دی ہو اور وہ اسے نکالنے کے لئے یہاں تک آیا ہو اور جھاڑی میں چھپے ہوئے کسی

ہم معلوم آدمی نے اسی دور ان میں اس کی انگلی میں زہر کا انجکشن دے دیا ہو۔“

”آخر آپ انجکشن ہی پر کیوں زور دے رہے ہیں۔“

”وہ یوں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی بتاتی ہے۔“

”ڈاکٹر قدیر آ رہا ہے۔“ حمید بیک بیک آہستہ سے بولا۔

”آنے دو۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا اور وہ سرخ رومال جیب میں رکھ لیا جو اُسے

جھاڑیوں میں ملا تھا۔ ڈاکٹر قدیر اُن کے قریب آ کر رک گیا۔

”نصیر صاحب نہیں آئے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”اس کا کچھ ٹھیک نہیں معلوم کب آئے۔“

”سلیم صاحب والی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے متعلق آپ کو کوئی علم ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں وضاحت کے ساتھ مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”مثلاً زہر کا انجکشن....!“ فریدی اُسے پر خیال انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔

”میں نے پہلے ہی اس کا اندازہ لگا لیا تھا۔“ قدیر نے کہا۔ ”میں خود یہ جانتا ہوں کہ عقیق البحر

کے پودوں میں کانٹے نہیں ہوتے۔“

”آپ کے علاوہ گھر میں کوئی اور بھی اس قسم کی رائے رکھتا ہے۔“

”کسی نے اس کا اظہار نہیں کیا....؟“ قدیر نے کہا۔

”اب ذرا مجھے یہ بتائیے کہ کرمل صاحب کی لاش کہاں پائی گئی تھی۔“ فریدی نے تھوڑے

توقف کے بعد کہا۔

قدیر ان کی رہنمائی کرنے لگا اور وہ پھانک سے نکل کر تقریباً دو تین سو گز کے فاصلے پر

اُٹھ رہے ہو گئے۔

”غالباً یہاں گرے تھے۔“ قدیر نے کہا۔

”آپ تو شاید اس موقع پر موجود نہیں تھے۔“ فریدی بولا۔

”ہاں میں شہر میں تھا اور اس وقت واپس آیا تھا جب پولیس چھان بین کر رہی تھی۔“

”خیر....!“ فریدی نے کہا۔ ”اچھا تو تھوڑی دیر بعد پھر میں آپ کو تکلیف دوں گا۔“ اور ڈاکٹر قدیر کا مطلب سمجھ کر کوٹھی کی طرف لوٹ گیا۔

فریدی بغور زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہاں بے شمار سنگریزے بکھرے ہوئے تھے اور اس حصے کی سطح بھی کچھ اونچی تھی۔ فریدی نے جیب سے محدب شیشہ نکالا اور ان سنگریزوں کو اس کی مدد سے دیکھنے لگا۔ پھر سر اٹھا کر حمید سے بولا۔ ”کار سے چڑے کا تھیلہ اور واکنگ اسٹک نکال لاؤ۔“

”کیا چہل قدمی کا ارادہ ہے۔“

”جلدی کرو۔“ فریدی نے منہ بنا کر کہا۔

دھوپ تیز تھی۔ حمید طرح طرح کے منہ بناتا ہوا چل دیا۔ اس نے ابھی تک فریدی کے چرے پر وہ آثار نہیں دیکھے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اس کیس میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ حالانکہ یہ کیس بھی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی پر اسرار معلوم ہو رہا تھا۔

حمید نے کار سے تھیلہ نکالا جو کافی وزنی معلوم ہو رہا تھا اور پھر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اس میں رکھی ہوئی چیز دیکھی۔ یہ کچے گوشت کے کئی ٹکڑے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا انہیں حیرت سے دیکھتا رہا پھر واکنگ اسٹک اٹھا کر فریدی کی طرف چل پڑا۔

”یہ پیشہ زیادہ مناسب رہتا۔“ حمید اس کے آگے تھیلہ ڈالتا ہوا بولا اور واکنگ اسٹک بھی اس کی طرف بڑھادی۔

فریدی گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر اُسے واکنگ اسٹک کے سرے پر باندھنے لگا۔

”کیا آپ بھی مدار یوں کی سی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”اگر مزہ آئے تو پیسہ واپس۔“ فریدی نے کہا۔ ”حالانکہ ہم یہاں بہت دیر میں پہنچے ہیں لیکن دیکھو شاید ابھی کچھ مزہ باقی ہو۔“

فریدی واکنگ اسٹک کے گوشت بندھے ہوئے سرے کو آہستہ آہستہ قرب و جوار کی زلٹ پر پھیرنے لگا تھا۔

”کاش اس وقت میرے ہاتھ میں ایک ڈگڈگی اور بانسری ہوتی۔“ حمید نے کہا اور فریدی ہنس پڑا۔

اگر میں نہ ہوتا تو تم بھی سب کچھ کرتے ہوئے نظر آتے۔“ اس نے کہا۔

حمید بظاہر اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی حیرت بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ اس سے قبل بھی کئی موقعوں پر فریدی کو اس سے زیادہ احتمقانہ حرکتیں کرتے دیکھ چکا تھا اور اس کا تجربہ شاید تھا کہ وہ بعد کو بہت ہی تحیر خیز انجام پر ختم ہو گئی تھیں۔ حمید کے ذہن میں کئی طرح کے خیالات گردش کرتے رہے۔

فریدی نے اس دوران میں بتائی ہوئی جگہ کا چکر لگا ڈالا۔ واکنگ اسٹک سنگریزوں پر پھیل رہی تھی۔ فریدی کے منہ سے ایک آسودگی آمیز آواز نکلی۔ حمید چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ واکنگ اسٹک کے گوشت لگے ہوئے ٹکڑے کو بغور دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”لو میاں حمید....!“ اس نے واکنگ اسٹک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ان سنگریزوں پر نہایت لذیذ قسم کا گوشت پکایا جاسکتا ہے۔“

حمید نے گوشت کے ٹکڑے کی طرف دیکھا۔ ایک پتلی سی دھوئیں کی لکیر اس سے نکل کر فضا میں بل کھا رہی تھی۔

”یہ کیا....!“ حمید کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔

”مداری کے ہاتھ کی صفائی۔ اب بجاؤ ڈگڈگی۔“

”آخر یہ ہے کیا بلا۔“ حمید آگے جھک کر دیکھتا ہوا بولا۔

جس جگہ سے دھواں نکل رہا تھا وہاں اُسے سفید رنگ کا ایک ننھا سا سنگریزہ دکھائی دیا۔ فریدی

نے جیب سے ایک چھوٹی سی چٹنی نکالی اور سنگریزے کو اُس سے پکڑ کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔

”ہمیں یہاں اسی طرح کے اور بھی سنگریزے تلاش کرنے ہیں۔ ورنہ پھر کسی کی جان جائے گا۔“ فریدی نے کہا اور زمین پر جھک گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد ویسے ہی دو تین ذرے اور ملے۔

حمید اس دوران میں اس سے بہت کچھ پوچھتا رہا۔ لیکن فریدی نے اُسے کوئی تشفی بخش

جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں پہلی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔

چار بج چکے تھے اور موسم بھی کچھ اعتدال پر تھا۔ پسینے میں شرابور کر دیئے والی تپش نے نجات مل گئی تھی۔ فریدی نے حمید کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا اندر نہ چلے گا۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں....؟“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔

”میرا خیال ہے کہ میں نے ابھی ابھی ایک نئی صورت سامنے والی کھڑکی میں دیکھی تھی۔“

”یقیناً وہ کوئی عورت رہی ہوگی۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا اور اگلے نشست پر بیٹھ کر ہر

اشارت کردی، لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُسے مشین بند کر دینی پڑی۔ ڈاکٹر قدیر پور ٹیکو سے اُسے

رکے کا اشارہ کر رہا تھا۔ فریدی اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر قدیر تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔

”فریدی صاحب! ایسی بھی کیا بے مروتی۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے خیال سے

ہمارے تعلقات نئے نہیں۔“

”قطعی نہیں! بھلا اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”ہم نے آپ ہی لوگوں کے انتظار میں شام کی چائے نہیں پی۔“ قدیر نے کہا۔ ”اور آپ

ہیں کہ اس طرح چپ چاپ چلے جا رہے ہیں۔“

فریدی اور حمید کار سے اتر آئے۔

ڈرائنگ روم میں گھر کے سارے افراد موجود تھے۔ نصیر بھی واپس آ گیا تھا۔ غالباً حمید نے

اسی نئی صورت کے متعلق کہا تھا۔ نصیر کے علاوہ بقیہ لوگوں سے وہ پہلے ہی متعارف ہو چکے تھے۔

فریدی نصیر کو تھوڑی دیر تک متجسس نظروں سے دیکھتا رہا۔ لیکن اس سے کچھ پوچھا نہیں۔ نہ

جانے کیوں حمید اُس سے چند سوالات کرنا چاہتا تھا۔ گھر والوں کے بیان کے مطابق انہیں معلوم

ہوا تھا کہ نصیر سلیم کی موت پر بے تحاشہ رو دیا تھا جب کہ کرئل کی موت پر اس کے چہرے پر

شکں تک نہ آئی تھی۔ حمید اس کے متعلق بہت کچھ سوچ رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے

سارے خیالات اپنے ذہن سے نکال پھینکے۔ کیونکہ عالیہ ڈاکٹر قدیر سے گفتگو کرتے وقت بڑا

دلآویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

دفعۃً فریدی نے وہ رومال نکالا جو اُسے جھاڑیوں میں پڑا ملا تھا اور اُسے میز پر رکھ کر چٹکی۔

ملنے لگا۔ لیکن خود حمید کو بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ فریدی نے یہ حرکت اراداً کی ہے۔ بس!

معلوم ہو رہا تھا جیسے باتوں کی رو میں قطعی غیر ارادی طور پر اُس سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو۔

کیمپن اشرف فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”نیکیتز صاحب آپ مجھے مشورہ دیجئے کہ میں کیا کروں۔“

فریدی پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”پوریج لیجئے۔“ نصیر نے فریدی کی طرف پلیٹ سرکائی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں کچھ

چمک سا پڑا۔

”شکریہ.... بس میں شام کو صرف چائے پیتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

اب حمید کو رومال کا خیال آیا اور وہ متجسسانہ نظروں سے نصیر کو دیکھنے لگا۔

”ہاں آپ نے کیا فرمایا تھا۔“ فریدی اشرف کی طرف مخاطب ہو گیا۔

”اگر وہ پُر اسرار خط محض مذاق نہیں تھا۔“ اشرف بولا۔ ”تو پھر مجھے بھی مرنے کے لئے تیار

رہنا چاہئے۔“

”کیوں....؟“

”اس میں بعد والوں کے لئے بھی تو دھمکی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ چچا جان کو بھی

اسی قسم کا کوئی خط موصول ہوا تھا تو پھر اب میری ہی باری ہے کیونکہ ان کا ترکہ میرے والد

روحوم سے گزرتا ہوا مجھ تک پہنچتا ہے۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر اس میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے تو آپ کو کافی

ظہار ہونا چاہئے۔“

”لیکن میں کس طرح بچ سکوں گا۔“ کیمپن اشرف بے چینی سے ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

”غالباً یہ رومال میرا ہے۔“ دفعۃً بیگم عارف نے کہا۔

”کیا آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا۔“ فریدی اس کی طرف مڑا۔

”یہ رومال....!“

”اوہ....!“ فریدی اس طرح چونک کر رومال کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اُس کے متعلق

بول ہی گیا ہو۔ ”جی ہاں یہ مجھے آپ کے پائیں باغ میں پڑا ملا تھا۔ کیا یہ آپ کا ہے؟“

نصیر نے ہاتھ بڑھا کر وہ رومال فریدی سے لیا۔

”اشرف صاحب۔“ فریدی اشرف کی طرف مڑ کر بولا۔ ”اگر آپ کو بھی کبھی اس قسم کا خط

”عاباً افریقہ کے تھے۔“

”نام....!“

”صرف ایک کا یاد رہ گیا ہے مباحثہ۔“

فریدی کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔

آسمانی شکار

پہلی کوٹھی سے واپسی پر فریدی حمید سے کہہ رہا تھا۔

”وہ لڑکی بڑی مصیبت میں معلوم ہوتی ہے۔“

”کون لڑکی....!“ حمید چونک کر بولا۔

”وہی جس کی مسکراہٹ تمہیں بہت بھلی لگ رہی تھی۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“

”اوہو! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ واقعی اس کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔“

”اے خدا....!“ حمید آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بولا۔ ”اس پتھر کے کھلنے پر میں تیری

خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“

فریدی نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کر دی اور مسکرا کر بولا۔ ”یاد دل چاہتا ہے کہ

میں بھی اس سے محبت شروع کر دوں۔“

”بھی کا کیا مطلب“ حمید نے کہا۔ ”آخر آپ مجھے اتنا دل پھینک کیوں سمجھتے ہیں۔“

”تم خواہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ تینوں اُسے اپنی طرف

متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خصوصاً نصیر اس معاملے میں زیادہ نامعقول معلوم ہوتا ہے۔“

”آپ نے اتنی جلدی اس کا اندازہ کیسے لگا لیا۔“

”اس کے لئے میرے پاس کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”وجدان کی تربیت

سمجھ لو۔“

”مارئے گولی۔“ حمید نے اکتا کر کہا۔ ”وہ گوشت میں دھواں.... آخر کچھ تو بتائیے نا۔“

موصول ہو تو مجھ تک پہنچنے میں تاخیر نہ کیجئے گا۔“

”بہتر ہے۔“

”اور آپ....!“ فریدی بیگم نواز سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے دولت گنج والی رپورٹ سے معلوم

ہوا ہے کہ آپ کہیں باہر جانا چاہتی ہیں۔“

”خیال تو تھا۔“

”شوق سے جاسکتی ہیں۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔ ”میں غیر ضروری پابندیوں کا قائل

نہیں ہوں۔“

”اب میں نے خود ہی اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“

”آپ کی خوشی۔“ فریدی نے کہا۔

نصیر عالیہ کی طرف دیکھ کر شرارت آمیز لہذا میں مسکرا رہا تھا۔

فریدی نے ان دونوں پر اچھتی سی نظر ڈالی اور اپنی پیالی کی چائے ختم کرنے لگا۔ پھر وہ ڈاکٹر

قدیر کو مخاطب کر کے بولا۔ ”کیس بہت پیچیدہ ہے ڈاکٹر صاحب۔“

”جناب اگر پیچیدہ نہ سمجھتا تو آپ کے پاس کیوں دوڑا جاتا۔“ قدیر نے کہا۔

”اب اس ملازم رفیق کا معاملہ رہ جاتا ہے۔“

”مجھے تو یہ حرکت اسی کی معلوم ہوتی ہے۔“ بیگم نواز نے کہا۔

”کیا آپ مجھے اس کے متعلق کچھ بتا سکیں گی۔“ فریدی نے پوچھا۔

وہ کرئل صاحب کے معاملات میں بہت زیادہ دخیل تھا۔

”خیر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جس نوکر پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے وہ دخیل ہو ہی جاتا ہے۔“

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ حادثہ سے قبل والی رات کو دونوں میں کچھ تکرار ہوئی تھی۔“

”تو آپ نے یہ بات پولیس کو کیوں نہیں بتائی تھی۔“

”یعنی....!“

”دو شہروں کے ناموں پر بحث ہوتے ہوئے تکرار ہو گئی تھی اور کرئل صاحب نے اُن

بہت بُرا بھلا کہا تھا۔“

”کون سے شہر....!“

”تم نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھی تھی۔“

”ہاں....!“

”کوئی خاص بات۔“

”بھئی جو کچھ بھی ہو خود ہی بتا ڈالئے۔ ورنہ مجھے احتجاج ہونے لگا ہے۔“

”اچھا تو سنو۔“ فریدی نے کہا۔ ”کرنل کے پیر کے تلے میں ایک زخم تھا اور وہ ننگے پیر دوڑا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس زخم کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اُس زخم پر دھوئیں کا نشان پایا گیا تھا اور اسی اشارے نے مجھے پچھلی رات جاگ کر گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

فریدی خاموش ہو گیا اور پھر اُس نے دفعتاً اپنی کار دوبارہ پیلی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔

”یعنی....!“ حمید چونک کر بولا۔

”کچھ بھی نہیں شام بڑی خوشگوار ہے اور میں پھر ایک بار اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے اُلونہ بنائیے۔“ حمید منہ سکڑ کر بولا۔ ”خیر میں فی الحال صرف ان سنگریزوں میں دلچسپی لے رہا ہوں۔“

”ہاں تو وہ سنگریزے۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”تم نے کبھی سفید رنگ کے وہ

سنگریزے دیکھے ہیں جو مچھلی کے سر سے نکلتے ہیں۔“

”دیکھے ہیں۔“ حمید کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ اُسے فریدی کی پہیلیاں بھجوانے والے انداز سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔

”یہ سنگریزے بھی ایک قسم کی مچھلی کے سر میں پائے جاتے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”میں نے تو آج تک نہ کہیں پڑھا اور نہ کہیں سنا۔“ حمید بے اعتباری کے لہجے میں بولا۔

”تم نے پڑھا ہی کیا ہے۔“ فریدی نے منہ سکڑ کر کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ تم ایشیا یا دنیا کی

جغرافیائی سوسائٹیوں کی ان کتابوں کا حوالہ دو گے، جو آج سے بیس برس قبل شائع ہوئی تھیں۔“

”خیر یہی سہی۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یہ مچھلی کم از کم اپنی طرف تو پائی نہ جاتی ہوگی۔“

”بہت کیا ہے۔“ اپنی طرف تو خیر پائی ہی نہیں جاتی۔ ابھی چند ایک دریائے کنگو اور دریائے

آمیزن میں ملی ہیں۔ لیکن کنگو کے جنگلات کے وحشی باشندے اُسے عرصہ سے بطور زہر استعمال

کرتے آئے ہیں۔ وہ اپنے تیزوں اور نیزوں کو اس کے خون میں بھجا کر زہر یلا بناتے ہیں۔“

”آپ کو اس کے متعلق کہاں سے اطلاعات ملیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے محض پرائیڈ خیرہ کافی نہیں ہوتا۔ میں نے اس مچھلی کے متعلق عالمی جغرافیائی سوسائٹی کے ایک سہ ماہی رسالے میں پڑھا تھا اور پچھلی رات کو اُسے تلاش کرنے میں میرے کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔“

اس مچھلی کا نام کیا ہے۔

”جغرافیائی سوسائٹی نے اُسے (Poisonia) پوائزڈنیا کا نام دیا ہے۔ کنگو بیسن والے اسے قادی کہتے ہیں۔ دریائے آمیزن کے کنارے بسنے والے جنگلی قبائل میں یہ دلا چا کے نام سے مشہور ہے۔

”لیکن یک بیک آپ کا ذہن اس مچھلی کی طرف کیوں منتقل ہو گیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”کرنل کے زخم پر پائے جانے والے دھوئیں کے نشان نے میری رہنمائی کی تھی۔ ان سنگریزوں کا اثر آنا فانا پورے جسم میں پھیل جاتا ہے، لیکن یہ صرف کھال اترے ہوئے گوشت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر تم اُس سنگریزے کو چنگی میں پڑلو تو کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوگا لیکن اگر تمہاری انگلی میں خفیف سا بھی زخم ہے تو سنگریزے لگتے ہی اُس میں سے دھواں نکلنے لگے گا اور دیکھتے دیکھتے تمہاری نامعلوم بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ ہاں تو میں یہ بھی جانتا تھا کرنل نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ افریقہ اور جنوبی امریکہ میں بھی گزرا ہے بیگم نواز نے کیا کہا تھا۔“

”میں نے کچھ نہیں سنا تھا۔“

”ٹھیک ہے تم اس وقت اس لڑکی میں دلچسپی لے رہے تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”رفیق اور کرنل میں افریقہ کے دو شہروں کے ناموں کے سلسلے میں بحث ہو گئی تھی اور کرنل نے اُسے ختم دست بھی کہا تھا۔“

”بھلا اس سے اور آپ کی باتوں سے کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ رفیق بھی شاید اُس زمانے میں اسی کے ساتھ تھا، جب اس کا قیام افریقہ میں تھا۔“

”اور آپ اب اس وقت ان لوگوں سے بھی دریافت کرنے کیلئے پھر واپس جا رہے ہیں۔“

”نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی سے باقاعدہ طور پر عشق کرنے لگو۔“

”میں آج کل بہت مشغول ہوں۔“ حمید نے منہ سکڑ کر کہا۔

اور فریدی مسکرانے لگا۔

سورج غروب ہونے والا تھا۔

فریدی کی کار پہلی کوٹھی کے پھانک پر رک گئی۔ فریدی اور حمید اندر جانے لگے۔ پھانک سے کچھ دور ہٹ کر لان پر نصیر اور کیپٹن اشرف نظر آئے، جو اونچی آواز میں جھگڑ رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر یک بیک خاموش ہو گئے۔ اُن کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

”معاف کیجئے گا میں نے پھر تکلیف دی۔“ فریدی نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ کیپٹن اشرف نے شدید غصہ کے باوجود بھی مسکرانے کی کوشش کی اور

اس کا چہرہ کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگا۔

”میں ڈاکٹر قدیر سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”بہتر ہے۔ میں ابھی بھیجتا ہوں۔“ کیپٹن اشرف نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

نصیر تھوڑی دیر تک ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ“

رومال آپ کو کس جگہ ملا تھا۔“

”جی ہاں! کیوں نہیں۔ وہ انہیں جھاڑیوں میں ملا تھا جن میں سلیم صاحب کو وہ عجیب و غریب

نور دکھائی دیا تھا۔“

”یہ رومال پچھلے ایک ہفتہ سے میرے پاس رہا ہے۔“ نصیر نے کہا۔

”لیکن آپکی والدہ... خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں، جس سے مجھے دلچسپی ہو سکے۔“ فریدی بولا۔

”لیکن اس گھر کا کوئی فرد آپ کو دلچسپی لینے پر مجبور کرے گا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ان میں سے کوئی مجھے ان معاملات میں الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”آخر کیوں؟“

”وہ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔“ نصیر نے مجنونانہ انداز میں کہا۔ ”اور ان دونوں

موتوں کو میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔“

”نفرت کی وجہ۔“

نصیر اُسے اس طرح گھورنے لگا جیسے اُس نے اُسے گالی دے دی ہو۔

”انہیں سے پوچھنے نفرت کی وجہ۔ لیکن میں اس وقت تک اس گھر سے نہیں جاؤں گا جب

تک کہ عالیہ نہ چلی جائے۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا ان لوگوں نے آپ کو میرے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ نصیر نے پوچھا۔

”میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ آپ شہر کے مشہور بیرسٹر مسٹر عارف کے صاحبزادے ہیں۔“

”اور ایک آوارہ لڑکا بھی۔“ نصیر منہ بنا کر بولا۔

”یہ آپ کا نجی معاملہ ہے۔“

”کیا اشرف نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں شراب کے نشے میں عالیہ کو چھیڑتا ہوں اور

مخض اس بناء پر میں نے کرنل صاحب کو پراسرار طریقے پر مار ڈالا کہ انہوں نے ایک بار میری

اس حرکت پر ڈانٹا تھا اور سلیم ماموں کو اس لئے ختم کر دیا کہ وہ بھی اسے ناپسند کرتے تھے۔“

”نہیں! مجھے کسی نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ فریدی نے کہا۔ ”کیا کوئی فرد کھلم کھلا یہ

ماری باتیں کہہ رہا ہے۔“

”اشرف کی باتوں سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔“ نصیر بولا۔

”نہیں وہ صاف صاف اپنے شیعے کا اظہار نہیں کر رہے ہیں۔“

”نہیں... لیکن...!“

”میں سمجھتا ہوں۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

سامنے ڈاکٹر قدیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ نصیر خاموش ہو گیا۔

”اچھا مسٹر نصیر پھر کبھی... میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ڈاکٹر قدیر کی

طرف بڑھ گیا۔

”دوبارہ تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ فریدی بولا۔

”اوہ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ قدیر ہنس کر بولا۔ ”فرمائیے۔“

”ایک ضروری بات۔“ فریدی نے کہا اور پھر وہ تینوں ٹہلنے ہوئے پھانک تک آئے۔ اس

”وران میں ڈاکٹر قدیر استفہامیہ نظروں سے فریدی کی طرف دیکھتا رہا۔“

”کیا رفیق اس دوران میں کرنل کے ساتھ ہی تھا جب وہ استوائی خطوں کا سفر کر رہے

تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اور وہی ان کی چیزوں کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”ڈاکٹر قدیر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کا پہلے ہی سے پروگرام تھا کہ صبح کے گئے شام کو واپس آئیں گے۔“

”کب کی بات کر رہے ہیں۔“

”جس دن کرنل صاحب کو حادثہ پیش آیا تھا۔“

”ہاں میرا بھی پروگرام تھا۔“ قدیر نے کہا۔ ”کرنل صاحب کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔“

”کیوں؟“

”اگر انہیں معلوم ہو جاتا تو وہ مجھے ہر گز نہ جانے دیتے۔ یہ تو آپ نے بھی سنا ہو گا کہ وہ کچھ جھکی قسم کے آدمی تھے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کرنل صاحب کے علاوہ گھر کے سب افراد کو آپ کے پروگرام کا علم تھا۔“

”جی ہاں!“ قدیر نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ”کیا آپ گھر ہی کے کسی فرد پر شبہ کر رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں!“ فریدی نے جلدی سے کہا۔ ”گھر والوں کی معلومات سے کوئی باہری بھی تو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی بولا۔ ”اچھا ایک بار پھر اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“

حمید دل ہی دل میں جھنجھلا رہا تھا کہ آخر اتنی ذرا سی بات کے لئے دوبارہ واپس آنے کی کب ضرورت تھی۔

فریدی قدیر سے مصافحہ کر کے جانے کے لئے مڑ ہی رہا تھا کہ دفعتاً کئی پرندے ان پر آگے اور پھر زمین پر گر کر پڑ پڑانے لگے۔ فریدی چونک کر اوپر دیکھنے لگا۔

دھند میں لپٹی ہوئی فضا میں بگلوں کی ایک قطار پرواز کر رہی تھی۔ ان میں سے کچھ اور بھی قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی ان کے قریب آگئے۔ وہ تھوڑی دیر تک تڑپتے رہے اور پھر ٹھنڈے ہو گئے۔

فریدی استفہامیہ نظروں سے ڈاکٹر قدیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کل شام کو بھی یہی ہوا تھا۔“ ڈاکٹر قدیر آہستہ سے بڑبڑایا۔

”کیا مطلب....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”کل شام کو بھی کچھ پرندے اسی طرح یہاں گرے تھے۔“

”یہاں کے علاوہ بھی کہیں سے اس قسم کی کوئی اطلاع آئی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”میری دانست میں تو نہیں آئی تھی۔“

”فریدی قطعی خاموش رہا۔ اس نے جھک کر ایک مردہ پرندہ اٹھایا اور اُسے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے کار کی طرف بڑھنے لگا۔

کیپٹن اشرف اور عالیہ بھی آگئے۔

”کہنے انکسٹر صاحب چل دیئے۔“ اشرف نے کہا اور پھر اس کی نظر فریدی کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پرندے پر پڑی۔ زمین پر پڑے ہوئے مردہ پرندے بھی دکھائی دیئے۔“ ارے آج

پھر....“ وہ چونک کر بولا۔ ”پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔“

”میرے خیال سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”کوئی دبا آنے والی ہے۔ کیوں ڈاکٹر۔“

”اگر یہ بات ہوتی تو کہیں اور بھی گرتے۔“ اشرف نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ کہیں اور بھی گریں۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھادیا اور حمید بے تعلقی سے الگ کھڑا رہا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ عالیہ بھی فریدی سے ہاتھ

مل رہی ہے تو اس نے بھی آگے بڑھ کر پر جوش انداز میں ڈاکٹر قدیر سے مصافحہ کیا۔ پھر اشرف

سے پھر وہ عالیہ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اُسے بیگم نواز نے پور ٹیکو سے آواز دی اور وہ حمید کی طرف دھیان دیئے بغیر ادھر چل دی۔ حمید بڑی طرح جھینپا اور بوکھلاہٹ میں پھر ڈاکٹر قدیر سے

مصافحہ کرنے لگا۔ جب اس حماقت کا احساس ہوا تو مسکرا کر بولا۔ ”قدیر صاحب اب تو آپ نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ کبھی آئیے۔ دو چار بالکل نئی قسم کے کتے آئے ہیں۔ آپ اس فاکس ٹیریز کو یقیناً پسند

کریں گے جس کے جسم پر گلہریوں کی سی دھاریاں ہیں۔“
”ضرور آؤں گا۔“ قدیر بولا۔

فریدی نے مردہ پرندے کو بچھلی نشست پر ڈال دیا اور کار اشارٹ کرنے لگا۔
”اُلو کہیں کے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”لیکن مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“
حمید جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”یہ پرندے.....!“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”مر گئے بچارے۔“ فریدی گلوگیر آواز میں بولا۔ ”اور تمہیں اکیلا چھوڑ گئے۔ اس پر سے یہ ستم کہ عالیہ.....!“

فریدی نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ حمید ہلچل مچانے والے انداز میں ہنسنے لگا۔ فریدی پھر کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

حمید بھی خاموش ہو گیا۔ یہ کیس کچھ عجیب نہ اسرار صورت میں ان کے پاس آیا تھا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا ان پرندوں کی موت کا بھی انہیں حادثات سے کوئی تعلق ہے، جو پہلی کوٹھی والوں کو پیش آئے۔

گھر پہنچ کر فریدی نے مردہ پرندے کو اٹھانے کے لئے بچھلی نشست پر ہاتھ ڈالا۔ مگر وہ خالی معلوم ہوئی۔ اس نے چونک کر اندر کا بلب روشن کر دیا۔ مردہ پرندے کا کہیں پتہ نہ تھا۔
اور وہ دونوں حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

مشتبہ نوکر

دوسرے روز کے اخبارات میں حمید نے پہلی کوٹھی کے متعلق بڑی حیرت انگیز باتیں دیکھیں۔ سارے واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھا گیا تھا۔ اُس عجیب و غریب جانور کے متعلق بھی کافی حاشیہ آرائیاں ہوئی تھیں۔ ایک نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ وہ جانور بارہ بجے رات سے پانچ بجے صبح تک کوٹھی کے پچانک پر بیٹھا رہتا تھا۔ ایک اخبار نے اس خبر پر ”مردہ پرندوں کی بارش“ کی۔ خلی جمائی تھی اور سیریں لکھا تھا کہ پہلی کوٹھی میں بچھلی رات شام کو آسمان سے اتنے

مردہ پرندے گرے کہ پائیں باغ میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہ رہی۔

حمید نے سارے اخبارات فریدی کے سامنے رکھ دیئے اور وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”بھئی اپنے یہاں کی صحافت انہیں غپوں کی بناء پر قائم ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”یہاں تمہیں وہ واقعہ یاد نہیں جب ملیا اور غازی پور کی سرحد پر پانچ چھ ہزار مردہ سانپ پائے گئے تھے۔“

”نہیں۔“

”وہ بڑا دلچسپ واقعہ تھا۔ ایک دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ ملیا اور غازی پور کی سرحد پر ہزاروں مردہ سانپ پائے گئے ہیں۔ دوسرے دن ایک اخبار نے لکھا کہ یہ ہندوستان کی تاریخ میں دوسرا واقعہ ہے۔ مہابھارت کے موقع پر بھی اسی طرح ایک جنگل میں لاکھوں مرے ہوئے سانپ پائے گئے تھے۔ کافی عرصہ تک اسی موضوع پر طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن ایک صاحب کا بیان شائع ہوا۔ وہ دراصل سانپ کی کھالوں کے ایجنٹ تھے۔ اتفاق سے انہیں ایک ساتھ پچیس تیس سانپ مل گئے تھے۔ انہوں نے ان کی کھالیں اتروالیں اور انہیں شاہراہ پر پھینکوا دیا اور پھر وہ پچیس تیس سانپ لاکھوں میں تبدیل ہو گئے اور ان کا ناٹھ مہابھارت سے جوڑ دیا گیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید پر خیال انداز میں بولا۔ ”میں بھی اسے غپ سمجھتا ہوں۔ اگر اس قسم کی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ آپ کو ضرور مطلع کرتے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جتنی بھی حقیقت ہے حیرت انگیز ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپ ایسے عجیب و غریب کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔“

”ابھی تک میری دلچسپی کی کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔“

”یعنی جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ غیر دلچسپ ہے۔“

”تم جیسی بچوں کے لئے تو ضرور دلچسپ ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس قسم کی باتھ کی صفائیاں میں نے بہت دیکھی ہیں۔ دیکھو میاں یہ عام لوگوں کو اُلو بنانے کا ایک سستا نسخہ ہے۔“

”آخر آپ کسی نتیجے پر پہنچے یا نہیں۔“

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عالیہ واقعی بہت حسین ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس میں

تین تو کیا بیک وقت دس آدمی بھی دلچسپی لیں تو مجھے حیرت نہ ہوگی۔“

حمید مضحکہ خیز انداز میں فریدی کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”آج کل خالص گھی بھی نہیں ملتا ورنہ میں چراغ ضرور جلاتا۔ خدا بڑی قدرت والا ہے۔ اُر چاہے تو ریت کے بادل بنا کر ان سے پانی برسائے۔“

فریدی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فریدی نے ہمراہ اشارہ کیا اور وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

”ڈاکٹر قدیر کا فون تھا۔“ حمید نے واپس آ کر کہا۔

”کیا کہہ رہا تھا۔“

”پیلی کوٹھی کے قریب لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں اور قدیر وغیرہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اخبارات نے غلط خبریں چھاپی ہیں لیکن مجمع کسی طرح ہٹا ہی نہیں، مجبوراً انہوں نے دولت گنج کے تھانے سے پولیس بلوائی ہے۔“

”اور وہ ننھا مناسا بچہ اپنے کارناموں پر خوش ہو رہا ہوگا۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”کون....!“ حمید چونک پڑا۔

”یہ میں ابھی نہیں جانتا۔ لیکن وہ بچہ ہے۔ انتہائی نا تجربہ کار اور جلد باز۔ کرنل کو تو اس نے بڑے سلیقے سے ختم کیا۔ لیکن سلیم کے سلسلے میں اس سے نا تجربہ کاری ہی دالی حرکت سرزد ہوئی ہے۔“

”یعنی....!“

”اسے کوئی ایسی جگہ منتخب کرنی چاہئے تھی، جہاں کانٹے ہوتے۔ اس طرح وہ بہ آسانی لوگوں کو دھوکا دے سکتا تھا۔ عقیق البحر میں تو خیر کانٹے ہوتے ہی نہیں اور اس جھاڑی میں بھی کوئی کانٹے وار پودا نہیں دکھائی دیا۔“

حمید خاموش ہو گیا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”کچھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ پرندہ کا سے کس طرح غائب ہو گیا۔“

”بھوت رہا ہوگا۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔

”آخر آپ مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔“

”جب خود میری سمجھ میں صاف صاف آجائے گا تو میں اس سے بھی زیادہ صاف بنا کر بچہ

کردوں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ انہیں لوگوں میں سے کسی پر شبہ کر رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”لیکن تم ایسا کہتے وقت شاید بھول جاتے ہو کہ کرنل کا ایک نوکر بھی غائب ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میں اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔“ حمید نے فریدی کے لہجے کی نقل اتاری۔

”کیوں؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”آپ کبھی ایک کامیاب جاسوس نہیں ہو سکتے۔“ حمید نے پھر فریدی کی نقل کی۔

”بھلا پیرومرشد کیوں۔“ فریدی نے ہنس کر پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ رفیق نے کرنل کو بیروں کے لئے مارا ہوگا، اور وہ انہیں لے بھی گیا۔ پھر آخر سلیم کو مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اُسے یہ خیال تھا کہ سلیم کچھ جانتا ہے تو اُسے بھی کرنل کے اہد ہی ختم کر دیتا۔ دو تین دن انتظار نہ کرتا اور پھر دوسری بات یہ کہ جب اس نے کرنل کو اتنے پُر اسرار طریقے پر ختم کیا تھا تو غائب کیوں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنی بچت ہی کے لئے اتنا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔“

”شاباش....!“ فریدی اس کے کاندھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔ ”واقعی تم نرے بدھو ہی نہیں ہو۔“

”جناب والا! اگر میں نہ ہوتا تو کوئی آپ کا نام تک نہ جانتا۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

اب کی بار وہ واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”کیوں؟“ فریدی اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”رفیق مل گیا۔“

”ہوں....!“ فریدی نے اتنی لاپرواہی سے کہا کہ حمید جھنجھلا گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فریدی اچھل

پڑے گا۔

”دولت گنج کے پولیس اسٹیشن پر آپ کو بلایا گیا ہے۔“

”خیر بھی چلیں گے۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”ناشتہ۔“

”اچھا اچھا جلدی کیجئے۔“ حمید نے پھر فریدی کے لہجے کی نقل اتاری۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ دولت گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ فریدی راستے میں خاموش ہی رہا۔ حمید نے کئی بار اُسے چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی نظریں ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیکھ رہا تھا۔

رفیق کو ابھی تک حوالات میں نہیں بند کیا گیا تھا۔ وہ سب انسپکٹر کی کرسی کے قریب زانوؤں میں سر دیئے زمین پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر قدیر اور کیپٹن اشرف بھی موجود تھے۔ شاید وہ رفیق کی شناخت کے لئے بلائے گئے تھے۔ فریدی کے پیچھے ہی ڈاکٹر قدیر نے ان لوگوں کی شکایات شروع کر دیں، جو پہلی کوٹھی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

”کہاں ملا...!“ فریدی نے سب انسپکٹر سے سوال کیا۔

”بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔“ سب انسپکٹر نے آہستہ سے کہا اور حمید کو بے اختیار ہنسی آگئی کیونکہ اس کے سامنے ایک ایسا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا جو شاید اس وقت دو قدم بھی نہ چل سکتا۔ رفیق ایک نحیف الجتہ آدمی تھا۔ چہرے پر مختصر سی فرنج کٹ ڈاڑھی تھی۔ گال اندر کودھنے ہوئے اور جھریوں سے پر تھے۔ آنکھوں میں کبر سنی کی وجہ سے دھندلا ہٹ لگتی تھی۔

”اب خود ہی سن لیجئے گا وہ داستان الف لیلٰی۔ میں کیا بتاؤں۔“ سب انسپکٹر فریدی سے کہہ رہا تھا۔

فریدی تھوڑی دیر تک غور سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور جب وہ اس کی روپوشی کی وجہ دریافت کرنے لگا تو رفیق بے اختیار رو پڑا۔

”میں ایک اندھے کنوئیں میں قید تھا۔“ اس نے کہا۔

سب انسپکٹر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”کس نے قید کیا تھا۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔ میں کرئل صاحب کے پیچھے دوڑا تھا۔ کسی نے میرے سر پر کوئی وزنی تیرماری اور میں.... پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک گڑھے میں پایا۔ دوسرے دن نگروشنی میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک کنواں ہے۔“

”آخر آپ اتنی لاپرواہی کیوں برت رہے ہیں۔“

”حمید صاحب۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاہل ہو جاؤں۔“

”تو آج کل آپ موڈ میں نہیں ہیں۔“

”ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، جو مجھے موڈ میں لاسکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید منہ سکود کر بولا۔ ”بھلا مردہ پرندوں کی بارش سے کیا ہوتا ہے۔ اگر

ہاتھیوں کی بارش ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔“

فریدی ہنس پڑا۔

”بھی اُسے تو میں ابھی تک بھی نہیں سمجھ سکا۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن حمید صاحب اس بار

آپ بہت چاک وچوبند نظر آرہے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”کیس ہی ایسا ہے۔“

”لیکن اس بار تو تم نے ایک مرتبہ بھی بھوتوں کا خوف نہیں ظاہر کیا۔ حالانکہ آسمان سے

مردہ پرندوں کی بارش بھی ہو رہی ہے اور وہ بھی صرف پہلی کوٹھی ہی میں ورنہ اُسے کسی قسم کی وبا بھی سمجھا سکتا تھا۔“

”کیا آپ مجھے ڈرپوک سمجھتے ہیں۔“ حمید اڑ کر بولا۔

”لیکن حمید صاحب اب آپ عالیہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

”آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں کہ میں ہی اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے

قلا بے ملاتا رہا ہوں۔“

”حمید صاحب بکواس بند۔ اب ہم ناشتہ کریں گے۔“

”ضرور ناشتہ کیجئے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ میں تو یہ رائے دوں گا کہ ایک داشتہ اور

ایک باقاعدہ بیوی کیجئے۔“

”شٹ اپ....!“

”اے ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”بیوی کے نام سے اس طرح لجاتے ہیں، جیسے ابھی چلو ہو

کہہ کر آنچل سے منہ چھپالیں گے۔“

”یار خدا کے لئے زخموں کی طرح مذکامت کر، ورنہ کسی دن چھری ادھیر دوں گا۔“

”پھر تم کس طرح نکلے۔“

”کل رات میری چیخ و پکار سن کر کسی راگبیر نے نکالا۔“

”کس طرح نکالا۔“

”رسی پھینکی تھی اُس نے جسے میں نے اپنی کمر سے باندھ لیا تھا۔ پھر اُس نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔“

”وہ کنواں دکھا سکتے ہو۔“

”جی ہاں.... وہ پیل کوٹھی سے زیادہ دور نہیں۔“

”کیوں صاحب۔“ فریدی ڈاکٹر قدیر کی طرف مڑا۔ ”کوئی اندھا کنواں ہے وہاں۔“

”مجھے تو علم نہیں۔“

”مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔“ رفیق بولا۔ ”وہ جھانڈیوں میں چھپا ہوا ہے۔ اتنی گنجان

جھانڈیاں کہ خدا کی پناہ اور کانٹے دار جھانڈیاں ہیں۔ ان لئے ادھر جانے کی کوئی ہمت ہی نہیں کرتا۔“

”تو کیا تم نے کل رات ہی کو غل مچایا تھا۔“

”جیتے جیتے میری آواز بیٹھ گئی ہے۔ کیا آپ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔“

”تو تمہیں کل رات کو اس کنوئیں سے نکالا گیا۔“

”جی ہاں۔“

”تو تم رات ہی کیوں نہیں حاضر ہوئے۔“

”یہ داروغہ جی سے پوچھئے کہ میں یہاں کس حال میں لایا گیا ہوں۔“

فریدی کے استفسار پر سب انسپکٹر نے بتایا کہ وہ آج صبح ایک کھیت میں بیہوش پڑا پایا گیا تھا۔

”اس راہ گیر نے تمہیں کھیت میں ڈال دیا تھا۔“ فریدی نے رفیق سے پوچھا۔

”جی ہاں! لیکن میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے کسی نے رسی کی

مدد سے نکالا تھا۔“

فریدی خاموشی سے اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”مجھے حیرت ہے کہ تم اس عمر میں اتنے دنوں تک بغیر کھائے پیئے زندہ کیونکر رہے۔“

رفیق نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہچکچا رہا ہے۔

”کیا اسے کر تل اور سلیم کی موت کا علم ہو چکا ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے سب انسپکٹر

چلا۔

”ہاں....!“

”خیر.... حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔“ فریدی نے کہا اور پھر رفیق سے مخاطب ہو گیا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کیا بتاؤں....!“ رفیق نحیف آواز میں بولا۔ ”اب جب کہ مجھ پر کر تل صاحب اور ان کے

ہائی کو مار ڈالنے کا شبہ کیا جا رہا ہے میری ہر بات سے مکاری ظاہر ہوگی۔“

”اس کا فیصلہ تم عدالت پر چھوڑ دو۔“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔ ”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے

لف کہو۔“

”اس کنوئیں میں روزانہ طوہ پھینکا جاتا تھا اور پانی سے بھری ہوئی بوتلیں بھی۔“

”دیکھا آپ نے۔“ اُس نے فریدی سے کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ یہ الف لیلیٰ کی ایک داستان

اے گا۔“

”حضور آپ اس کنوئیں میں اب بھی خالی بوتلیں اور وہ رومال دیکھ سکتے ہیں جن میں باندھ

طوہ پھینکا جاتا تھا۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔ کوئی بھی یقین نہیں

کے گا۔“ رفیق بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”مجھے یقین ہے.... خیر.... ہاں تو تمہارے مالک ننگے پاؤں بھاگے کیوں تھے اور انہوں نے

رُکس پر کیا تھا۔“

”ہو نہہ....!“ رفیق ایک زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”اب آپ مجھ سے وہ بات پوچھ رہے

ماضی کے اظہار پر شاید پاگل خانے بھجوا دیا جاؤں۔“

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر حمید سے بولا۔ ”آؤ چلیں! ہمیں وہ کنواں بھی دیکھنا

پڑے۔ پھر رفیق سے کہنے لگا۔ ”تم بھی چلو۔“

فریدی نے سہارا دے کر اُسے اٹھایا۔

”کوئی آدمی ساتھ کر دوں۔“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں ابھی اسے واپس لاتا ہوں۔“

پھر اس نے ڈاکٹر قدیر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ اس کی ضمانت لے رہے ہیں۔ بوڑھا آدمی ہے۔ حوالات میں مر جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”تو کیا واقعی آپ اُسے بے گناہ سمجھتے ہیں۔“ قدیر کے لہجے میں حیرت تھی۔

”یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“ فریدی بولا۔ ”میں اپنے پرانے تعلقات کی بناء پر اُسے یہ استدعا کر رہا ہوں۔“

”ضرور ضرور! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج ہی ضمانت کیلئے درخواست دے دوں گا۔“

اندھا کنواں

”میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔“ رفیق فریدی کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار

رو پڑا۔

”نہیں نہیں بھائی یہ کیا کرتے ہو۔“ فریدی اپنے پیر ہٹا کر اسے سیدھا بٹھاتا ہوا بولا۔ اُس

نے اسے انگلی سیٹ پر اپنے ساتھ ہی بٹھایا تھا۔ حمید کچھلی نشست پر تھا۔

فریدی نے رفیق کے بتائے ہوئے راستے پر کار لگادی۔

”ہاں تو میں نے تم سے کرنل کی بدحواسی کی وجہ پوچھی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

رفیق کے ہونٹ ہلے اور ایک ہزانی قسم کی ٹرٹراہٹ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے

خود سے باتیں کر رہا ہو۔ پھر یک بیک چوٹ کر فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ یقین کریں یا نہ کریں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”لیکن جو کچھ میرے علم میں ہے بتانے

کی کوشش کروں گا۔“

وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں سے

شروع کروں۔“

”تم یہ بھول جاؤ کہ پولیس والے کو بیان دے رہے ہو۔“ فریدی نے اُسے دلا سادیا۔

”وہ ایک عجیب و غریب جانور کے پیچھے دوڑے تھے۔“ رفیق آہستہ سے بولا۔ ”اگر میں آؤ

بلد نمبر 7

قاتل سنگریزے

اس کی شکل و صورت کے بارے میں بتاؤں تو آپ بے تحاشہ میرا مضحکہ اڑائیں گے۔“

”نہیں میں مضحکہ نہیں اڑاؤں گا۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”شائد میں بھی اس سوتر سے واقف

ہوں جس کے جسم پر چیتے کی سی دھاریاں ہیں اور جس کا سر....!“

”آپ جانتے ہیں۔“ رفیق فریدی کا بازو پکڑ کر پر جوش انداز میں بولا۔

”تم نے بھی اُس جانور کو دیکھا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں نے اندھیرے میں کوئی جانور دیکھا تھا۔ میں دو ٹوک کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہی تھا۔

بہر حال کرنل صاحب اس کے پیچھے دوڑے تھے۔“

”لیکن تم نے تو ابھی یہ کہا تھا کہ اگر میں اس جانور کے متعلق بتاؤں گا تو آپ میرا مضحکہ

اڑائیں گے۔“

”میں نے ٹھیک کہا تھا۔ کرنل صاحب کو اُسی جانور کی توقع تھی۔“

”کیوں تو قیاس کیوں تھی۔“

”انہیں تین چار دن قبل ایک خط موصول ہوا تھا۔ اس پر اُسی جانور کی تصویر بنی ہوئی تھی اور

اس میں انہیں غالباً جان سے مار دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔“

”تم نے وہ خط دیکھا تھا۔“

”جی ہاں کرنل صاحب مجھ پر اعتماد کرتے تھے اور پھر دوسری بات یہ کہ اس سے قبل بھی

ہمارا سابقہ اس جانور اور اُس کے مالک سے پڑچکا تھا۔“

”یعنی....!“

”میں اب داستان کے اسی حصے کی طرف آ رہا ہوں، جسے سن کر تھانے دار صاحب نے الف

لٹل والی پھبتی کہی تھی۔“

”تم کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”پڑھا لکھا خاک بھی نہیں۔ بس آپ جیسے بڑے لوگوں کی خدمت میں رہ کر بولنے کا سلیقہ

آگیا ہے۔“

حمید آگے سرک آیا۔

”یہ غالباً ۲۸ کی بات ہے۔ کرنل صاحب کی پارٹی افریقہ کے جنگلات میں شکار کھیلنے کے

لئے مومبارہ اتری تھی۔ ان کے ساتھ کئی انگریز بھی تھے۔ ان میں کچھ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گئے تھے۔ میں کرنل صاحب کے ہمراہ تھا۔ وہیں اُس پُر اسرار آدمی سے ہماری ملاقات ہوئی جو اس عجیب و غریب جانور کا مالک تھا۔ وہ تھا تو یوروپین ہی نسل کا آدمی لیکن اس کا رہن سن بالکل وہاں کے مقامی باشندوں کا سا تھا۔ اس کی شکل مجھے آج بھی یاد ہے۔ اتنا خوفناک آدمی اُس کے علاوہ پھر کبھی میری نظروں سے نہیں گذرا۔ اس کے دونوں شانے اس کے سر سے کچھ ہی نیچے رہے ہوں گے۔ اُن کے درمیان میں اس کا سر بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا جیسے کسی ٹوکری میں بڑا سائربوز رکھا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں یوں تو مزلیضوں کی سی نقاہت ظاہر ہوتی تھی لیکن حقیقتاً اس کی طاقت ہاں جواب نہیں رکھتی تھی۔ وہاں کے مقامی باشندے اُسے جادوگر سمجھ کر اُس سے خائف رہتے تھے۔ رفیق کھانسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔ ”مقامی باشندے یہ سمجھتے تھے کہ اس کے قبے میں خبیثت روحیں ہیں اور وہ اس عجیب و غریب جانور کو بھی کوئی خبیثت روح ہی سمجھتے تھے جو اس کے پیچھے پالتو کتوں کی طرح چلا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ کے انگریز اس کی معلومات سے فائدہ اٹھانے کیلئے اُسے اکثر مدعو کرتے تھے۔ مومبارہ میں ہم نے آبادی کے باہر قیام کیا تھا۔ یہ کرنل صاحب کی تجویز تھی، ورنہ دوسرے ساتھی تو کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال ہم خیموں میں مقیم تھے وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا جہاں ڈاگی ناہ رہتا تھا۔“

”ڈاگی ناہ کون۔“ فریدی نے پوچھا۔

”وہی پُر اسرار آدمی۔ اُسے وہاں کے باشندے ڈاگی ناہ کہتے تھے، جو غالباً ڈاکٹر کی گبڑی ہوئی شکل تھی۔ ہاں میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ وہ ڈاکٹر بھی تھا۔ ہمارے ساتھ بھی ایک انگریز ڈاکٹر تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک تجربہ کار ڈاکٹر معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو.... وہ تقریباً ہر روز ہمارے کیپ میں آتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہم بھی اس سے خوف محسوس کرنے لگے۔ اس کی موجودگی میں کم از کم مجھے تو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی درندہ انسان کی شکل میں ہمارے پاس آ بیٹھا ہو۔ خصوصہ ہمارے ساتھ کی عورتیں تو اس سے بہت زیادہ خائف رہا کرتی تھیں۔ اب سنئے اصل واقعہ یہاں سے شروع ہوتا ہے ایک رات ہم کھانا کھانے کے بعد کرنل وائسن کے خیمے میں جمع تھے اور دوسرے دن کے شکار پر بحث ہو رہی تھی کہ ہم نے کسی عورت کی چیخ سنی۔ عورتیں سب دوسرے خیمے میں تھیں۔ دفعتاً انہوں نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔ ہم سب گھبرا کر باہر نکل آئے۔

”سب ڈاگی ناہ ڈاگی ناہ چیخ رہی تھیں۔ کسی عورت نے جس کے اوسان بجاتے ہمیں بتایا کہ ڈاگی ناہ کرنل وائسن کی چودہ سال لڑکی لوسی کو اٹھالے گیا۔ ہم سب نے جلدی جلدی رانقلیں اور ہارچیں اٹھائیں۔ عورت نے ڈاگی ناہ کے فرار کی سمت بتائی اور ہم اسی طرف بے تحاشہ دوڑنے لگے۔ بدحواسی میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے جو بھی جہاں تھا ڈاگی ناہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اچانک میرے کرنل صاحب اس تک پہنچ ہی گئے۔ لڑکی خوف کے مارے بیہوش ہو گئی تھی اور وہ شیطان ڈاگی ناہ اپنا منہ کالا کرنے ہی جا رہا تھا کہ کرنل صاحب اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس سے شک نہیں کہ وہ کرنل صاحب سے کہیں زیادہ طاقتور تھا لیکن کرنل صاحب نے نہ جانے کس طرح اُسے بہت زیادہ زخمی کر دیا۔ مگر افسوس کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔“

رفیق کو پھر کھانسی آگئی۔ فریدی بہت آہستہ آہستہ کار چلا رہا تھا۔

”اور پھر....!“ رفیق تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”وہ افریقہ کے دوران قیام میں برابر ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ اُس نے کئی بار میرے کرنل صاحب پر چھپ کر حملے بھی کئے۔ لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کئی خطوط میں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ اُن خطوط پر بھی اس کے اس خبیث جانور کی تصویر بنی رہتی تھی، اور پھر جب اُس دن کرنل صاحب کو پھر اسی قسم کا خط ملا تو وہ بڑھاپے کی وجہ سے گھبرا گئے۔ آخر عمر میں دل و دماغ میں کمزوری آ ہی جاتی ہے۔“

”تو کیا افریقہ سے واپس آنے کے بعد بھی انہیں خطوط ملے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس سے قبل کے خطوط افریقہ ہی کے دوران قیام میں ملے تھے۔“

”گھر والے بھی اس واقعے سے واقف رہے ہوں گے۔“

”قطعاً نہیں.... گھر والے تو کیا پورے ملک میں میرے سوا اور کوئی اس سے واقف نہیں تھا۔“

”کیوں....!“

”نہ جانے کیا بات تھی کہ کرنل صاحب نے نہ تو خود ہی کسی سے اس کا تذکرہ کیا اور نہ مجھے

ہی کرنے دیا۔“

”وجہ تو بتائی ہوگی۔“

”نہیں اس کی وجہ نہیں بتائی۔“

”تو تم وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ گھر کا کوئی فرد اس واقعے سے واقف نہیں تھا۔“

”مجھے اس پر اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ اس وقت میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔“
”آخر تم اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو۔“

”اگر انہوں نے کسی کو بتایا ہوتا تو اس سے اس خط کا بھی تذکرہ کرتے جو انہیں اس دن ملا تھا۔“
فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

”کرئل صاحب اپنے جواہرات کہاں رکھتے تھے۔“

”اُنکے سونے کے کمرے میں ٹھیک ان کے سرہانے ایک تجوری ہے۔ اُسی میں رکھتے تھے۔“
”لیکن وہ غائب ہیں۔“

”ارے....!“ رفیق بے اختیار اچھل پڑا۔ ”میرا خیال ہے کہ ان کا علم بھی میرے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔“

”تجوری بالکل خالی ملی ہے۔“

”اور کاغذات....!“ رفیق نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”کاغذات بھی نہیں تھے۔“

”افسوس اس میں کئی اہم دستاویز بھی تھیں، بس یہ سمجھ لیجئے کہ لاکھوں روپے ڈوب گئے۔“

”تو تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ پُر اسرار آدمی یہاں آگیا ہے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”ایسی صورت میں میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اس پُر اسرار آدمی کی اس وقت کیا عمر رہی ہوگی۔“

”تقریباً ساٹھ سال۔“

”ہوں....!“ فریدی نے پر خیال انداز میں سر ہلایا اور مڑ کر حمید کی طرف دیکھنے لگا جو لاپرواہی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رفیق پھر کھانسنے لگا۔

رفیق نے کھانسنے کھانسنے ایک طرف اشارہ کیا اور فریدی نے کار روک دی۔ فریدی نے

پلٹ کر دیکھا۔ یہاں سے پہلی کو تھمی تقریباً ایک یا ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور اس کی پشت کا حصہ یہاں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تینوں کار سے اترے، چاروں طرف جھانپاں بکھری ہوئی تھیں۔ رفیق کچھ سوچنے لگا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ وہ کنواں کس جگہ ہو سکتا ہے۔“ اُس نے کہا۔

”کیا مطلب....!“ فریدی اُسے گھورنے لگا۔

”میں نے آپ سے بتایا کہ میں باہر نکلنے کے بعد زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہا تھا۔“

”تو پھر تم نے اس جگہ کا اندازہ کیسے لگالیا تھا جبکہ رات بھی اندھیری تھی۔“

”وہ پیل کا درخت۔“ رفیق نے ایک طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ ”اکثر پوچھا پٹھ کرنے والی عورتیں

اس پر چراغ چڑھا جاتی ہیں۔ میں نے اسی سے جگہ کا اندازہ لگایا تھا۔ مجھے سوچنے دیجئے۔ میں اس

سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں جدھر درخت دکھائی دیا تھا۔“

حمید کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی لیکن فریدی بہت زیادہ سنجیدہ

نظر آ رہا تھا۔

رفیق تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر دفعتاً ایک طرف چلنے لگا۔ فریدی اور حمید اُسی

جگہ کھڑے رہے۔ کچھ دور چل کر رفیق رک گیا۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر فریدی کو آواز دی۔

”میرے خیال میں وہ جگہ یہی ہے۔“ اس نے کانٹے دار جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف

اشارہ کیا۔

”صرف خیال ہی خیال ہے یا....!“

رفیق نے اپنے کرتے کا دامن اٹھایا جس کا ایک کونہ تھوڑا سا غائب تھا اور آہستہ سے بولا۔

”یہ یہیں کہیں الجھ کر پھنسا تھا.... وہ دیکھئے.... اس طرف آجائیے۔ یہ رہا۔“

جھاڑیوں میں ایک جگہ ویسی ہی دھاریوں والا تھوڑا سا کپڑا پھنسا ہوا تھا جیسا رفیق نے کرتا

پہن رکھا تھا۔ فریدی جھک کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے سر اٹھا کر رفیق کو دیکھا۔

”حمید! کار سے وائنگ اسٹک نکال لاؤ۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر وائنگ اسٹک۔“ حمید بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”وہ خط کیا ہوا تھا جو کرئل کو موصول ہوا تھا۔“ فریدی نے رفیق سے پوچھا۔

”وہ بھی اسی تجوری میں بند تھا۔“

حمید وائنگ اسٹک لے کر واپس آگیا۔ فریدی اس سے جھاڑیاں ہٹا ہٹا کر اندر گھس رہا تھا۔

کچھ دور چل کر وہ رک گیا۔ تھوڑی دیر تک سر جھکائے کچھ دیکھتا رہا پھر دفعتاً حمید اور رفیق کی

نظروں سے غائب ہو گیا۔

حمید نے اُسے آواز دی، لیکن جواب نہ دار۔ حالانکہ وہ جگہ جہاں وہ غائب ہوا تھا زیادہ دور نہ تھی۔ بمشکل تمام تیس یا چالیس گز کا فاصلہ رہا ہو گا۔ حمید اُسے پے در پے آواز دیتا رہا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ جھلا کر رفیق کی طرف پلٹ پڑا۔

”او بوڑھے! میں تیری بوٹیاں اڑا دوں گا۔“

”رفیق نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہا تھا۔“

”بولو....!“ حمید نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”حضور میں کیا....“ رفیق ہانپ رہا تھا۔

حمید اُسے گھینٹا ہوا کار کی طرف لے گیا۔

”حضور....!“ رفیق پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”حضور کے بچے۔“ حمید نے اُسے اندر دھکیل کر کھڑکیوں کے تالے بند کر دیئے اور انجن کو بھی مقفل کرنے کے بعد جھاڑیوں کی طرف چل دیا۔

وہ فریدی کو آواز دیتا ہوا کپڑوں کی پرواہ کئے بغیر جھاڑیوں میں گھس رہا تھا۔

اور پھر وہ اگر اچانک سنبھل نہ جاتا تو وہ خود بھی اس اندھے کنوئیں میں جا پڑا ہوتا۔

کنوئیں کی تہہ میں اُسے ایک آدمی دکھائی دیا۔ نیچے اندھیرا ہونے کی وجہ سے صورت صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

حمید نے پھر آواز دی۔

”کیوں مرے جا رہے ہو۔“ نیچے سے آواز آئی اور حمید نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن پھر

دوسرے لمحے میں اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ فریدی تہہ تک پہنچا کس طرح۔ کیا بے خیالی میں گر گیا؟ لیکن اگر یہ بات ہوتی تو وہ اتنے اطمینان سے اُسے جواب کس طرح دیتا۔

حمید جھک کر دیکھنے لگا اور پھر اس پر ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ کنواں پختہ تھا۔ اوپر سے

نیچے تک اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ لگاریں اتنی چوڑی اور قریب قریب تھیں کہ کوئی بھی بہ آسانی تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو۔“ نیچے سے آواز آئی۔ ”اُسے نگرانی میں رکھو۔“

حمید پھر کار کے قریب آ گیا۔ اُسے اپنے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔ رفیق کی آنکھیں ابھی

بھی بھٹی ہوئی تھیں۔ حمید نے کھڑکیوں کے تالے کھول کر اُسے باہر نکالا۔

”صاحب ملے۔“ اس نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

”ہاں.... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم خود ہی کنوئیں سے کیوں نہیں نکل آئے تھے۔“

”میں جانتا تھا کہ آپ اس کنوئیں کو دیکھ کر یہی سوال کریں گے۔“ رفیق آہستہ سے بولا۔

”اوپر سے دیکھنے میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی آسانی سے اس میں اتر سکتا ہے اور نیچے سے

اوپر آ سکتا ہے۔ مگر شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ غلی لگاکر بہت اونچی ہے اور مجھ جیسے بوڑھے....!“

فریدی کے قہقہے نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ وہ چپ چاپ ان کے پیچھے آکر کھڑا

ہو گیا تھا۔

”واقعی غلی لگاکر تک پہنچنا تمہارے بس کا روگ نہیں تھا۔“ اس نے یک بیک سنجیدہ ہو کر

کہا۔ ”مگر اس کنوئیں میں نہ وہ رومال ملے اور نہ وہ خالی بوتلیں۔“

رفیق کے چہرے پر ہوا بیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹ ہلے، لیکن وہ صرف تھوک نکل کر رہ گیا۔

”ڈرو نہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں شاید آج رات تک اور قید میں رہنا پڑے۔“

کل ضمانت ہو جائے گی اور ہاں ضمانت کے بعد جاؤ گے کہاں۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں جاؤں گا۔ پہلی کوششی کے علاوہ میرا کوئی گھر نہیں تھا اور اب

وہاں سب مجھ پر شبہ کر رہے ہیں۔“

”خیر تم عدالت ہی میں رک کر میرا انتظار کرنا۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔

پھر زہر

ایک ہفتہ گزر گیا۔ فریدی خلاف معمول بہت زیادہ خاموش تھا۔ وہ اس کیس کے متعلق بہت

کم گفتگو کرتا تھا اور حمید کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے تہیہ کیا کہ وہ خود ہی فریدی سے

الگ تھلگ تحقیقات شروع کر دے گا۔ سب سے زیادہ بیٹابی اُسے اس بات کی تھی کہ وہ کسی طرح

اُن پرندوں کی موت کے متعلق معلوم کر لے۔ فریدی نے رفیق کو کیوں حوالات سے سے نکلویا

تھا۔ یہ چیز ابھی تک اس کیلئے معمہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے اُسے اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرا

دیا تھا۔ اُس نے یہ سب کچھ اپنی خود اعتمادی کے ساتھ کیا تھا جیسے اُسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ رفتہ رفتہ اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حمید کو اس پر یقین نہیں تھا۔ بعض اوقات فریدی اصل مجرموں سے بھی دیدہ و دانستہ اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا تھا جیسے وہ یا تو بے گناہ ہوں یا بالکل ہی معصوم۔

دوسری طرف وہ نصیر سے دوستی بڑھا رہا تھا۔ پہلی کوٹھی میں آمد و رفت بڑھ گئی تھی اور وہاں کے سارے افراد اس سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا سچ فریدی کی عالیہ پسند آگئی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا خیال تھا جس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُسے اپنے الفاظ میں عورت پر وف کے نام سے یاد کرتا تھا۔ حمید نے ایک بات اور نوٹ کی تھی کہ فریدی پہلی کوٹھی جاتے وقت عموماً اُسے نظر انداز کر جاتا تھا۔

حمید اس وقت گھر میں تنہا تھا۔ فریدی دفتر سے آنے کے بعد ناشتہ کر کے فوراً ہی کہیں چلا گیا تھا۔ آج تو خصوصاً اس کے رویے پر اُسے بڑا تاؤ آیا تھا۔ مگر قہر و رویش پر جان درویش۔ آج تو اس نے اس کے اس سوال کا جواب تک نہیں دیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے اپنے کوٹ کے کارٹر میں بڑا سا گلاب کا پھول لگا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک حمید اس گلاب کے پھول کے متعلق غور کرتا رہا تھا۔ پھر دفعتاً اس کا ذہن پہلی کوٹھی کی طرف گھوم گیا جہاں پچھلی شام کو بھی کچھ مرد پرندے گرے تھے۔ وہ شروع ہی سے اُن کے متعلق سوچتا آیا تھا۔ کرئل اور اس کے بھائی کی پُر اسرار موت نے اُس کے دل سے یہ خیال نکال دیا تھا کہ وہ کوئی آسبی خلل ہے کیونکہ انہیں خم کر دینے کے لئے جو طریقہ استعمال کیا گیا تھا وہ اس پر اچھی طرح روشن ہو گیا تھا اس نے عرصہ ہوا ان پرندوں کے متعلق ایک تدبیر سوچھی تھی لیکن اسے آج تک عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا۔

اس کی کابلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فریدی بعض اوقات اُسے سچ مچ کھیاں ہی مارنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ جب ضرورت سمجھی کام لیا اور نہ پڑے پڑے باتیں بنایا کرو۔

حمید جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ کاندھے پر شکار کا تھیلہ لٹا کر انکلی اور گیراج سے موٹر سائیکل نکال کر پہلی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دولت گنج پہنچ کر اُس نے موٹر سائیکل راجروپ نگر والی سڑک کی طرف موڑ دی کیونکہ وہ پہلی کوٹھی کی پشت پہنچنا چاہتا تھا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ دھوپ کی تیزی کم ہو گئی تھی۔ لیکن دن بھر کی جھلسی ہوئی زمین ابھی تک تپ رہی تھی۔

پہلی کوٹھی کی پشت پر پہنچ کر حمید نے موٹر سائیکل جھاڑیوں میں چھپا دی اور خود ایک اونچے درخت پر چڑھنے لگا۔ گنجان ٹہنیوں کے درمیان اس نے ایک ایسی مضبوط شاخ تلاش کر لی جس پر وہ کچھ دیر تک بیٹھ سکے۔ درخت کافی اونچا تھا اور جہاں حمید بیٹھا تھا وہاں سے پہلی کوٹھی کا پائیں باغ صاف نظر آ رہا تھا۔

ایک بڑی سی میز کے گرد کئی آدمی بیٹھے تھے۔ حمید نے شکار کے تھیلے سے دو بین نکالی اور اس کا فوکس ٹھیک کر کے پائیں باغ کی طرف دیکھنے لگا۔ میز پر چائے دانیاں اور فواکھات رکھے ہوئے تھے اور وہاں نصیر کے علاوہ گھر کے سارے افراد موجود تھے۔ فریدی بھی نہا۔ وہ ٹھیک عالیہ کے سامنے بیٹھا تھا ہلا ہلا کر گفتگو کر رہا تھا۔ حمید دانت پیس کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پائیں باغ کی طرف سے بے تعلق ہو کر آسمان میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پرندوں کی کئی قطاریں گذر گئیں لیکن ان میں سے ایک بھی ہر کر نیچے نہ گرا۔ حمید مایوس ہو گیا۔ اُسے اپنی اس حماقت پر تاؤ آ گیا۔ آخر کیا تک ہے۔ خواہ خواہ تندرہ کی طرح درخت پر چڑھ بیٹھے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ کاندھے سے رائفل اتار کر پہلی کوٹھی کے پائیں باغ میں گولیوں کی بوچھاڑ کر دے۔

دفعتاً پرندوں کی ایک قطار پھر گذری اور ان میں سے کئی لہرا کر قطار سے الٹ ہو گئے۔ پھر وہ قلابازیاں کھاتے اور اپنے پر پھنپھناتے نیچے کی طرف جانے لگے۔ حمید نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر اس کا کیار د عمل ہوا۔ وہ خیر آمیز انداز میں پرندوں کی گذرتی ہوئی قطاروں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ ایک آدھ پرندے اب بھی گر رہے تھے۔

حمید نے جلدی جلدی ایک بار پھر دور بین کا فوکس ٹھیک کیا اور گردن کچھ ہنجی کر کے دیکھنے لگا۔ دو تین پرندے اور گرے۔

بہر حال اس نے جو کچھ بھی دیکھا اس کے متعلق اخذ کئے ہوئے نتیجے پر قطعی مطمئن تھا۔ پھر اُس نے دور بین کا رخ پائیں باغ کی طرف پھیر دیا۔ وہ سب گرے ہوئے پرندوں کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے لیکن فریدی ابھی تک اسی جگہ پر بیٹھا تھا۔ خود حمید کو پہلے ہی سے اتنی حیرت تھی کہ وہ اس پر مزید حیرت کا اضافہ کرنا فضول سمجھنے لگا۔

برآمدے میں داخل ہوتے ہی اُس نے محسوس کر لیا کہ فریدی گھر میں موجود ہے۔ اس لئے اس نے رائل اور تھیلا چپ چاپ سائیڈ کے کمرے میں رکھ دیئے۔

فریدی اندرونی برآمدے میں آرام کر سی پڑ لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ حمید نے چپ چاپ اوپری منزل میں نکل جانا چاہا۔

”ذرا ادھر تشریف لائیے۔“ فریدی نے اُسے آواز دی۔

”فرمائیے۔“ حمید رک کر مڑا۔ اس کے لمبے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”قرب آؤ....!“ فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”یہ کیا حرکت تھی۔“

”کیسی حرکت....؟“

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے یا نہیں۔“

”آخر آپ کہہ کیا رہے ہیں۔“

”تم نے درخت پر سے گولی کیوں چلائی تھی۔“

حمید بوکھلا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید فریدی نے اُسے دیکھ لیا تھا۔

”میری خوشی۔ میں اس کیس کی تفتیش الگ سے کر رہا ہوں۔“

”درخت پر چڑھ کر۔“ فریدی طنزیہ لمبے میں بولا۔

”جس طرح مجھے آسانی ہو گی کروں گا۔“

”صاحبزادے ہو۔“ فریدی نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔ ”خیر جو کچھ بھی ہوا برا نہیں ہوا۔ لیکن

میں پوچھتا ہوں کہ یک بیک تمہارے سر پر بھوت کیوں سوار ہو گیا تھا اور پھر ذرہ برابر بھی احتیاط

نہیں برت سکتے۔ حالانکہ تم نے واپسی میں بہت دور جاکر موٹر سائیکل اشارت کی تھی۔ لیکن پھر

گئی.... انہوں نے دولت گنج کے تھانے میں رپورٹ درج کرادی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم موٹر

سائیکل کے ٹائر بدل ڈالو۔ چلو یہ کام ابھی کئے لیتے ہیں۔ آئندہ ایسی حماقت نہ کرنا۔“

فریدی کھڑا ہو گیا۔

”مگر.... مگر....!“ حمید ہٹایا۔

”کیا....؟“ فریدی دروازے کی طرف جاتے جاتے رک کر بولا۔

”کچھ نہیں۔“

لیکن وہ انہیں ضرور متحیر کرنا چاہتا تھا۔ ذہن میں شرارت کے کیڑے کلبلا اٹھے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے رائل سیدھی کی، پبلی کوٹھی پر سے گذرتے ہوئے پرندوں کی قطار پر فائز کر دیا۔ ایک گرا اس نے جلدی میں یہ تک دیکھا ضروری نہ سمجھا کہ پبلی کوٹھی والوں پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہے، بس اس نے پھرتی سے رائل سیدھا کا ندھے پر ڈالی اور نیچے اترنے لگا۔ اچانک اس کی نظریں پبلی کوٹھی کی طرف اٹھ گئیں۔ کچھ لوگ وہاں سے پچھوڑے کی طرف آرہے تھے۔ حمید پھر اوپر چڑھ گیا۔ غنیمت یہی تھا کہ درخت کافی گنجائش تھا لیکن حمید مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والوں میں فریدی ضرور ہو گا۔ ایسی صورت میں آسانی سے بچ نکلنا معجزات میں سے ہو سکتا تھا۔

شوق کے رنگ گہرے ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ سارا جنگل دھند میں لپٹا جا رہا تھا۔ حمید ٹھیک اپنے نیچے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ فریدی کہیں دور سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر سر مارنے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ حمید تھوڑی دیر تک کسی کی آہٹ کا منتظر رہا لیکن جب کچھ سنائی نہ دیا تو وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ دفعتاً اس نے موٹر سائیکل اشارت ہونے کی آواز سنی۔ لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رہی کیونکہ یہ آواز بہت دور سے آئی تھی۔

لیکن نیچے آکر جیسے ہی اُس نے اُن جھاڑیوں میں قدم رکھا جہاں موٹر سائیکل چھپائی تھی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

قرب وجوار کی ساری جھاڑیاں چھان ماریں۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ سوچنے لگا کہ لے جانے والا اس سے زیادہ چالاک تھا۔ کیونکہ وہ اسے جھاڑیوں سے نکال کر کافی دور تک کھینچتا ہوا لے گیا تھا۔ پھر اشارت کر کے رفو چکر ہو گیا تھا۔

حمید نے سوچا کہ پبلی کوٹھی جائے۔ شاید فریدی وہاں موجود ہو لیکن پھر رائل اور شکار کے تھیلے کا خیال آتے ہی اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

دولت گنج تک پیدل آنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ شہر پہنچ کر موٹر سائیکل کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادے گا۔ وہ موٹر سائیکل اسے سرکاری طور پر ملی تھی اس لئے اُسے اور زیادہ الجھن تھی۔

”تو آؤ....!“

”بات کیا ہے....!“

”کیا بات ہے۔“

”ٹھہریے تو....!“

”ارے تو بول تا بابا۔“

”موٹر سائیکل کوئی اڑالے گیا۔“

”کیا....؟“ فریدی غصے میں پلٹا۔ ”میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“

”آپ میرا قیمہ کر دیجئے۔ اب غلطی تو ہو ہی گئی۔“

”تو تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔“

”جی ہاں۔“

”اچھا کان پکڑو۔“

حمید نے کان پکڑ لئے۔

”سرغ کی بولی بولو۔“

”یہاں نہیں....!“ حمید ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

”آہستہ سے بولو۔“

”نکڑوں کوں۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”شاباش....!“ فریدی نے قہقہہ لگایا۔ ”موٹر سائیکل گیرج میں موجود ہے۔“

”کیا....؟“ حمید اچھل کر بولا۔

”جی ہاں....!“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر میں انہیں باتوں میں نہ بہلاتا تو انہیں

موٹر سائیکل مل گئی ہوتی۔“

”لیکن آپ نے زبردست غلطی کی۔“

”کیوں....؟“

”اگر میں اندھیرے میں آپ کو گولی مار دیتا تو۔“

”آپ....!“ فریدی نے اس کے منہ کے سامنے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”آپ میں اتنی صلاحیت

ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔“

”میں دھوکا کھا گیا۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر آپ نے اسی جگہ اسٹارٹ کی ہوتی تو دیکھتا۔“

”مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”خیر تمہاری اس حرکت سے فائدہ ہی پہنچنے کی امید ہے۔ ورنہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہنر ہوتا اور تم خاک و خون میں لوٹے نظر آتے۔“

”آپ خواہ مخواہ اپنی طاقت کا رعب ڈالا کرتے ہیں۔“ حمید بگڑ کر بولا۔ ”کبھی.... او....“

”اف....“ حمید جملہ نہیں کر پایا تھا کہ فریدی نے اس کی گردن پکڑ لی۔

”ہاں کیا کہہ رہے تھے۔“ فریدی اس کی گردن دبوچے ہوئے بولا۔

”ارے ارے خدا کی قسم میں ابھی مر جاؤں گا۔“ حمید غصیلی آواز میں بولا اور فریدی نے ہنس کر اس کی گردن چھوڑ دی۔

حمید تھوڑی دیر کھڑا گردن سہلاتا رہا پھر بولا۔

”سچ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ ساری درندگی کافور ہو سکتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بشرطیکہ آپ شادی کر لیں۔“

”ضرور کروں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”بشرطیکہ کوئی پتھر یا فولاد کی عورت مل جائے۔“

”تاکہ گھبراؤں تو نکرا بھی سکوں مر بھی سکوں۔“ حمید نے احمد ندیم قاسمی کا مصرعہ پڑھ دیا۔

”خدا کی قسم بڑا پیارا شعر کہا ہے ندیم نے۔“ فریدی نے آہستہ سے شعر پڑھا۔

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا

تاکہ گھبراؤں تو نکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

فریدی تھوڑی دیر خاموش رہا پھر کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ حمید بول پڑا۔

”ان مردہ پرندوں کے متعلق آپ نے کیا رائے قائم کی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم اسی لئے درخت پر چڑھے تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”آپ تو روشن ضمیر ہیں۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”روشن ضمیر تو نہیں لیکن تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”خیر میں فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔“ حمید اکتا کر بولا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”تم کچھ بتانے کے لئے بیتاب ہو۔“

”جی ہاں....!“ حمید نے اکڑ کر کہا۔ ”وہ کسی قسم کے زہریلے پتنگے کھا کر مر جاتے ہیں۔“

فریدی بے اختیار ہنس پڑا اور حمید کا خون کھول کر رہ گیا۔ کیونکہ اس نے دور بین کے ذریعہ صاف دیکھا تھا کہ پرندے فضا میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو کھا کھا کر نیچے گر رہے تھے۔

”برخوردار انسان کے علاوہ اور سارے حیوانات میں ایک خاص قسم کی حس ہوتی ہے جس کے ذریعے انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی چیز ان کے لئے بے ضرر اور کون سی مہلک ہے۔ انسان میں بھی وہ حس موجود ہے لیکن دوسری شکل میں ہم اُسے حس نہیں بلکہ اور اک کہتے ہیں۔“

”آپ کا فلسفہ نہ انہیں موت سے بچا سکتا ہے اور نہ ان پتنگوں کو بے ضرر ثابت کر سکتا ہے۔“

حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے۔“

”میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے غلط دیکھا ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”پھر آپ کیا کہتے ہیں۔“ حمید جھلاہٹ میں تقریباً چیخ پڑا۔

”میں کہتا ہوں کہ وہ پتنگے بذات خود زہریلے نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب....!“

”مطلب یہ کہ ان کی قسم قطعی بے ضرر ہے۔ وہ پیدا کنشی زہریلے نہیں۔“

”پھر....!“

”اُن کے پیروں کو زہریلا بنایا گیا ہے۔“ فریدی نے کہا اور حمید متحیر ہو کر اس کی طرف

دیکھنے لگا۔

آخری حملہ

تھوڑی دیر کے لئے برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر آخر حمید ہی نے خاموشی توڑ دی۔

”تو آپ اُن کے متعلق پہلے ہی سے جانتے تھے۔“

”پہلے سے اگر تمہاری مراد زیادہ دن ہیں تو میں بھی تمہاری ہی طرح اندھیرے میں تھا۔“

فریدی نے کہا۔ ”یہ بات مجھے کل معلوم ہوئی ہے۔ میں نے بھی وہی درخت استعمال کیا تھا جس پر

تم آج تھے، لیکن تم نے اُن پتنگوں کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو گی۔“

”ٹھکانہ....!“ حمید پھر چونک پڑا۔

”ہاں.... وہ جگہ جہاں سے پتنگے برآمد ہوتے ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”میں ان کی خاصی بڑی

تعداد پکڑ لایا ہوں۔ اگر تم کو میرے بیان پر اب بھی شبہ ہو تو میرے ساتھ آؤ۔“

فریدی اسے اس کمرے میں لایا جہاں اس نے سانپ پال رکھے تھے۔ اس نے ایک بریکٹ

سے جالی کا ایک صندوق اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ اس میں ٹڈیوں کی شکل کے بے شمار پتنگے بھڑ بھڑا

رہے تھے۔

فریدی نے چٹنی سے پکڑ کر ایک پتنگا نکالا اور اُسے ایک سانپ کے آگے ڈال دیا۔ قبل اس

کے کہ پتنگا سنبھل کر اڑنے کی کوشش کرتا سانپ منہ مار کر اُسے چٹ کر گیا۔

پھر انہیں زیادہ دیر تک نتیجے کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ سانپ نے پہلے تو زمین پر سر رکھ دیا لیکن

دوسرے ہی لمحے میں اتنے زور سے اچھلا کہ وہ دونوں چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی دیر تک تڑپتے رہنے کے بعد وہ سرد ہو گیا۔

پھر فریدی نے دوسرا پتنگا نکالا اور اُس کے پر توڑ دیئے۔ وہ دوسرے سانپ کے آگے ڈالا

گیا۔ تقریباً دس منٹ انتظار کرنے کے باوجود بھی حمید نے اُس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ پائی۔

”تمہاری بے یقینی کی وجہ سے میرے ایک سانپ کا خون ہو گیا۔“ فریدی نے کمرے سے

نکلے ہوئے کہا۔

”آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے مرغا یا کبوتر کا خون ہو گیا ہو۔“

”غیر متعلق بات مت چھیڑو۔“

”ضرور چھیڑوں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”میں کہتا ہوں آخر یہ سب کبائڑ خانہ یہاں سے کب ہٹے گا۔“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ حمید دراصل غیر متعلق باتیں کر کے اپنی جھینپ مٹانا چاہتا تھا۔

”لوگ آپ کو خبیثی کہنے لگے ہیں۔“ حمید پھر بولا۔ ”میں نے تو آج تک کسی سنجیدہ اور

باہوش آدمی کو سانپ پالتے نہیں دیکھا۔“

”طوطا پالتے دیکھا ہے آپ نے۔“ فریدی بولا۔

دیکھا ہے.... پھر....!“

”وہ دودھ دیتا ہے یا اس کے انڈے کھائے جاتے ہیں۔“

”خوبصورت پرندہ ہے۔“

”مجھے سانپ خوبصورت لگتے ہیں۔“

”ارے صاحب خدا کرے آپ کو مینڈک اور کچھوے بھی خوبصورت لگیں میرے باپ کا

کیا جاتا ہے۔“

”فضول باتوں میں اپنی اس وقت کی شرمندگی چھپانے کی کوشش نہ کرو۔“

”آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔“ حمید ڈھٹائی سے بولا۔

”بکو مت۔“ فریدی نے کہا اور بیرونی برآمدے کی طرف چلا گیا۔

حمید تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہوا خود بھی برآمدے کی

طرف چلا گیا۔

”حمید....!“

”فرمائیے۔“

”ادھر آؤ۔“

”آگیا۔“

”بیٹھ جاؤ۔“

”بیٹھ گیا۔“

”جنم میں جاؤ۔“

”پاسپورٹ بنوادیتے۔“

”تم امریکی انداز میں سیٹی نہ بجایا کرو۔“

”آپ تو شاید میرے مرنے پر بھی تنقید سے باز نہ آئیں گے۔“

”اگر بد سلیقگی سے مرے تو اس کی توقع ضرور رکھو۔“

حمید تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

”آج کل بہت موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔“

فریدی جواب دینے کی بجائے سگار سلگانے لگا۔

”فرمائیے! آپ کا عشق کن منزلوں میں ہے۔“ حمید تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

”اگر بات کرنے کے لئے کوئی ڈھنگ کا موضوع نہ سوچے تو خاموش ہی رہا کرو۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پھانک پر ایک کار آکر رکی اور کوئی اتر کر پھانک میں داخل ہوا۔

رکھوائی کرنے والا لیسٹین بھونکنے لگا۔

”نیو۔“ فریدی نے اُسے ڈانٹا۔

آنے والا کیپٹن اشرف تھا اور بہت زیادہ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”آئیے! آئیے۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”سب خیریت۔“

”خیریت کہاں.... اب میں۔“ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ دھم سے ایک کرسی

میں گر گیا۔

”کیا بات ہے؟“ حمید اُس کی طرف جھپٹا۔

اشرف نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ حمید اسے

لے کر احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بوکھلا کر فریدی کو دے دیا۔

”اوہ....!“ فریدی لفافہ کھولتے ہی چونک پڑا۔ ”تو آپ کی بھی باری آگئی۔“

”کیا بات ہے۔“ حمید نے بیساختہ پوچھا۔

”وہی خط۔“

”ارے۔“

فریدی تھوڑی دیر تک اس عجیب و غریب جانور کی تصویر دیکھتا رہا پھر لفافے پر کی تحریر پر

نظریں جمادیں۔ اس پر کیپٹن اشرف کا نام لکھا ہوا تھا۔

”یہ خط آپ کو کب اور کس طرح ملا۔“ فریدی نے اشرف سے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر قبل کھانا کھانے کے بعد جب میں اپنے سونے کے کمرے میں گیا یہ میرے

تئے پر رکھا ہوا تھا۔“

”ہوں....!“ فریدی نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

”میں کیا کروں۔“ اشرف مایوسانہ انداز میں بولا۔

”ہمت کیجئے۔ آپ تو ملٹری کے آدمی ہیں۔“

”اگر آٹنے سامنے کا مقابلہ ہوتا تو بات بھی تھی۔“ اشرف نے کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ فریدی کچھ سوچنے لگا۔

”میں نے گھر میں کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔“

”آپ نے اچھا کیا۔“ فریدی نے کہا۔ ”رفیق کے بیان کے مطابق ہمارا مقابلہ ایک پراسرار شخصیت سے ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو اور زیادہ خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”پھر بھی.... مجھے اندھیرے میں نہ رکھئے۔“

”وہ آپ کے چچا کا ایک بہت پرانا دشمن ہے۔“

”کون....!“

”افریقہ کا ایک پراسرار باشندہ۔“

”کچھ اور بھی بتائیے۔“

فریدی نے رفیق کا بیان دہرایا۔ اشرف خوفزدہ آواز میں ہنسنے لگا۔

”اول تو مجھے اُس جانور کے وجود پر ہی شبہ ہے اور اگر اس قسم کی کوئی بات ہوئی تو چچا

جان مجھے ضرور بتاتے۔ انہوں نے اپنے افریقہ کے بہتیرے کارنامے بتائے ہیں۔“

”ممکن ہے کسی وجہ سے اس کا تذکرہ نہ کیا ہو۔“

”کسی نہ کسی سے تو ضرور کرتے۔“

”پھر آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔“

”رفیق اتنا ذہین نہیں معلوم ہوتا کہ قتل کے اتنے نادر طریقے سوچ سکے۔“

”پھر....!“

”مجھے اس کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔“

”تو کیا وہ پراسرار آدمی یہاں آگیا ہے۔“

”میں اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔“

”خیر وہ ہو یا نہ ہو۔“ اشرف گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ بتائیے کہ اب میں کیا کروں۔“

”احتیاط برتنے۔“

”کیا چچا صاحب نے احتیاط نہ برتی ہوگی۔ والد صاحب بھی کافی محتاط تھے۔ مگر۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ فریدی نے بچھا ہوا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”میں پیلی کو ٹھی

کی نگرانی کیلئے دس بارہ کانٹیل بھجوا دوں گا۔ ان میں سے دو آپکے کمرے کے سامنے رہیں گے۔“

”کیا یہ احتیاط مجھے بچالے گی۔“ اشرف کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

”مسٹر اشرف ہمت کیجئے۔“ فریدی نے اُسے پھر دلاسا دیا۔ ”میں ابھی فون پر ایس۔ پی کی

اجازت لے کر آپ کے یہاں کانٹیل بھجواتا ہوں اور میں خود بھی غافل نہ رہوں گا۔“

اشرف کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ اس دوران میں فریدی نے ایس۔ پی کو فون کر کے اجازت

حاصل کر لی۔

”آپ بے فکر رہئے۔“

اشرف جانے کے لئے اٹھا۔ اس کے قدم ڈمگنا رہے تھے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے

دونوں سے مصافحہ کیا اور برآمدے سے اتر گیا۔ السیشین پھر بھونکا اور فریدی نے اسے ڈانٹ کر

چپ کرادیا۔

تھوڑی دیر بعد کار اشارت ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک چیخ بھی سنائی دی۔ پھر کوئی

گرا۔ انجن کی آواز فضا میں منتشر ہو رہی تھی۔

السیشین بھونکتا ہوا پھانک کی طرف دوڑا۔ فریدی اور حمید بھی بڑھے۔

اور پھر انہوں نے ایک دل ہلا دینے والا منظر دیکھا۔ اشرف کی کار کی اگلی نشست کی کھڑکی

کھلی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پیر اندر تھے اور آدھا دھڑنچے زمین پر تھا۔ ہاتھ پھیل گئے تھے۔

کار کا انجن شور مچا رہا تھا۔ فریدی نے ہاتھ بڑھا کر انجن بند کر دیا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ پھر فریدی نے السیشین کا پٹہ پکڑ کر اُسے پھانک کے اندر دھکیل دیا۔

فریدی کے سارے نوکر بھی اکٹھا ہو گئے تھے۔

اشرف گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ فریدی نے کار کے اندر نظر ڈالی۔ بریکوں کے پاس

ایک انجن کش لگانے والی سرخ پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے اسے احتیاط سے اٹھالیا۔ اُس میں کوئی سیال

شے بھری ہوئی تھی۔

اشرف کو سڑک سے اٹھا کر اندر لایا گیا۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر کی بھی کوٹھی تھی۔ فریدی نے اُسے فون کیا اور وہ پانچ منٹ کے اندر ہی اندر وہاں پہنچ گیا۔
سب خاموش کھڑے تھے۔ حمید کبھی فریدی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اشرف کی طرف، جو ابھی تک گہری گہری سانس لے رہا تھا۔

”صرف بیہوشی۔“ ڈاکٹر نے سر اٹھا کر کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ بیہوشی محض خوف کا نتیجہ ہے۔“

فریدی نے پر خیال انداز میں سر ہلادیا۔

ڈاکٹر اشرف کو ایک انجکشن دے کر چلا گیا۔

”یعنی بالکل ہمارے سر پر۔“ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔

فریدی مسکرانے لگا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔

”میرا خیال ہے کہ اگر السیشین اس کی چیخ سن کر دوڑا نہ ہوتا تو وہ اپنا کام کر ہی گیا تھا۔“ حمید پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ اس کی نظریں اشرف پر جمی ہوئی تھیں جس میں اب ہوش کے کچھ کچھ آثار پیدا ہو چلے تھے۔ پھر اُس نے کراہ کر روٹ بدلی۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی آہستہ آہستہ کھلنے لگیں اور وہ یک بیک اٹھ بیٹھا۔

”میں بھی مرا.... ہائے۔“ وہ پھر دھڑ سے لیٹ گیا۔

”آپ بچ گئے ہیں۔“ فریدی مسکرایا۔

اشرف اس طرح فریدی کو دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اس کی بات پر یقین نہ ہو۔

”آپ واقعی بچ گئے ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

اشرف پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ دبا رہا تھا۔

”لیکن یہ واقعہ پیش کس طرح آیا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”اوہ.... میں۔“ اشرف رک رک کر بولا۔ ”میرا ہاتھ گیرز پر تھا کہ کوئی تیز چیز چسپی۔“

اس نے اپنا ہاتھ فریدی کی طرف بڑھا دیا۔

فریدی نے ایک جگہ انگلی رکھ کر اُس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔

”ہیں....!“ اشرف نے سر ہلادیا۔

”میرے ذہن میں میرے باپ کی موت گونج اٹھی۔“ اشرف آہستہ سے بولا۔ ”پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”اس کا حملہ کامیاب نہیں ہوا۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن.... اب میں۔“ اشرف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں خود آپ کو اس وقت واپس جانے کی اجازت نہ دوں گا۔“ فریدی نے کہا۔

اشرف کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

”بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ان سب کو بھی کچھ دنوں کے لئے یہیں بلا لوں۔“

فریدی کے اس جملے پر حمید کے خیالات کی رو عالیہ کی طرف بہک گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا فریدی سچ بچ عالیہ کو پسند کرنے لگا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اُن سب کو یہاں بلانے کا ارادہ کیوں ظاہر کرتا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دھمکی صرف کر تل اور اس کے وارثوں کے لئے تھی۔ کر تل کا آخری وارث حملے کے باوجود بھی بچ گیا تھا۔ پھر اب ان لوگوں کی اتنی حفاظت کیا معنی رکھتی تھی۔ ہاں اشرف کی موت کے بعد پھر ڈاکٹر قدیر وارث ہو سکتا تھا۔ مگر جب تک اشرف زندہ ہے اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں.... پھر؟

حمید کا ذہن عالیہ کے علاوہ اس الجھن کا کوئی جواز نہ پیش کر سکا۔

”ان لوگوں کو۔“ اشرف تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”میرے خیال سے انہیں تو کوئی خطرہ نہیں۔“

”شاید آپ وہ آج شام والا فارغ بھول گئے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اوہ! مجھے اپنی پریشانی میں اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔“

”اُس فارغ سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ دشمن کسی وقت کھل کر بھی سامنے آ سکتا ہے۔“

حمید کی الجھن اور بڑھ گئی۔ فریدی جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اور

پھر اس وقت اس فارغ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پھر تھوڑی دیر بعد فریدی پیلی کوٹھی والوں کو فون کر رہا تھا۔ ”ہیلو! ڈاکٹر قدیر! میں فریدی

بول رہا ہوں۔ کیپٹن اشرف کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ لیکن وہ بالکل بخیریت ہیں۔ کوئی گھبرانے

کی بات نہیں۔ آج رات وہ میرے مہمان رہیں گے.... نہیں نہیں واقعی وہ بخیریت ہیں.... اگر کہئے تو خود ان کو فون پر بلاؤں.... خیر.... بھی میں تو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ سب کچھ دنوں کے لئے یہاں آجائیے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ سب بہت خطرناک پوزیشن میں ہیں۔“

وہ مجرم

دوسرے دن بھی فریدی نے اشرف کو نہ جانے دیا۔ حمید الجھن میں تھا کہ آخر فریدی نے اشرف کو اس سیرینج کے متعلق کیوں نہیں بتایا تھا اس کے پوچھنے پر فریدی نے صرف یہ بتایا کہ وہ اسے اور زیادہ خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی دن دوپہر کو اشرف کو بخار ہو گیا اور شام تک پٹی کوٹھی کے سارے افراد فریدی کی کوٹھی میں اکٹھا ہو گئے۔ ان کے وہاں قیام کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر قدیر کے علاوہ اور سب متفق تھے اور وہ آخر تک اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر طے یہ پایا کہ قدیر پٹی کوٹھی ہی میں رہے گا۔ فریدی نے اس کے علاوہ اور سب کا انتظام کر دیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹر قدیر کی ضد پر متردد نظر آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے بہت زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس کی تاکید تھی کہ کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔ نصیر نے اس پر بڑی واویلا مچائی۔

”آخر کیوں؟“ فریدی نے پوچھا۔ ”اگر دو چار دن گھر ہی پر رہ جاؤ گے تو کونسی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔“

”میں بغیر پٹے نہیں رہ سکتا۔“

”بہت بُری عادت ڈال لی ہے تم نے۔“ فریدی نے کہا۔ ”خیر آؤ۔ میرے ساتھ میں تمہارا یہ عذر لنگ بھی باقی نہ رہنے دوں گا۔“

وہ اُسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا جہاں اعلیٰ درجے کا فرنیچر موجود تھا اور دیواروں کی مصوری کے نادر نمونے نظر آرہے تھے۔ فرش پر بہترین قسم کا ایرانی قالین تھا۔ فریدی ایک الماری کا پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ نیچے سے اوپر تک عمدہ قسم کی شراب بوتلیں چنی ہوئی تھیں۔

”گڈ لارڈ....!“ نصیر تجر آمیز آواز میں بولا۔ پھر فریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”آپ بہت اونچی شرا میں پیتے ہیں۔“

”میں نہ اونچی پیتا ہوں نہ نیچی۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”یہ صرف ان مہمانوں کے لئے ہیں جو اس سے شوق کرتے ہیں۔“

”آپ بہت گریٹ آدی ہیں۔“ نصیر فریدی کا شانہ دبا کر بولا۔

”لیکن پی کر ہلا نہیں چلاؤ گے۔“ فریدی نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ”پیو اور وہ سامنے کوچ ہے چپ چاپ سوتے ہو۔ کیا سمجھے، ورنہ میرے خطرناک کتے تمہیں نوچ کھائیں گے۔“

بیگم عارف، بیگم نواز اور عالیہ فریدی کی کوٹھی دیکھتی پھر رہی تھیں۔ حمید ان کے ساتھ تھا۔ سانپوں والے کمرے کے قریب سے گذرتے وقت حمید نے کہا۔

”اس میں فریدی صاحب کے بعض رشتے دار رہتے ہیں۔“

”اس کمرے میں۔“ عالیہ بولی۔

”ہاں آپ کو حیرت کیوں ہے۔“

”آپ نے کہا بعض رشتے دار.... کیا کئی ہیں۔“

”کئی نہیں درجنوں۔“

”بھلا اتنے سے کمرے میں۔“

”اگر یقین نہ ہو تو اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیجئے۔“

عالیہ کھڑکی کے قریب آگئی اور پھر چیخ کر لوٹ پڑی۔

”سانپ....!“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

دونوں عورتیں بھی بڑھیں لیکن انہیں بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا پڑا۔

کمرے کے اندر فرش پر کئی بڑے بڑے سیاہ رنگ کے سانپ رنگ رہے تھے۔

”یہ گھر نہیں مداری کا جھولا ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”لیکن سانپ کیوں۔“ بیگم نواز نے کہا۔

”بس شوق ہی تو ہے۔“ حمید بولا۔ ”لیکن گھبراہٹ نہیں۔ کمرے کی بناوٹ ایسی ہے کہ

باہر نہیں آسکتے۔“

”تمیں چالیس تو کتے ہی ہوں گے۔“ بیگم عارف نے بیگم نواز سے کہا۔

”کتے تو خیر سبھی پالتے ہیں، لیکن سانپ۔“ عالیہ بولی۔ ”انہیں کھلاتا پلاتا کون ہے۔“

”خود فریدی صاحب۔“

وہاں سے وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ عجائبات کے کمرے میں وہ تقریباً آدھ گھنٹے تک رہے۔

”اور وہ اپنی دولت اسی طرح برباد کر رہے ہیں۔“ بیگم نواز نے کہا۔

”کہیں ان کے سامنے یہی جملہ نہ دہرا دیجئے گا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”وہ اپنی دانست میں

بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔“

”شادی کیوں نہیں کرتے۔“ بیگم عارف نے کہا۔

”یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”ایک بار انہیں ایک نجومی نے بتایا کہ تمہاری دو شادیاں ہوں گی۔ جھلا کر بولے میں ایک بھی نہ کروں گا۔ تب سے اب تک اپنی بات پراڑے ہوئے ہیں اور میں اس نجومی کی تلاش میں ہوں۔“

”کیوں....!“ عالیہ بولی۔

”تاکہ میں اس بات پر کسی طرح اسے راضی کروں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے لے۔“

عورتیں ہنسنے لگیں۔

”نہیں واقعی کیوں نہیں شادی کرتے۔“ بیگم نواز نے کہا۔

”اگر کسی لڑکی سے آپ کو دشمنی ہو تو پھر میں کوشش کروں۔“ حمید بولا۔

”کیوں.... میں نہیں سمجھی۔“

”کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ کوئی شامت زدہ ہی فریدی صاحب کی تقدیر سے ٹکرائے گا۔“

”ارے اُسے یہ سارے کتے، سانپ بچھو اور بلاؤ نوج نہ کھائیں گے۔“

عالیہ ہنسنے لگی۔

”اور آپ.... آپ اپنے متعلق کیا کہتے ہیں۔“ بیگم عارف نے ہنس کر کہا۔

”ارے ہی ہی ہی۔“ حمید نے شرماتے کی بڑی عمدہ ایکٹنگ کی۔

وہ لوگ ایک اور کمرے کے قریب سے گزرے اور بیگم عارف چونک پڑی۔ اس کا لڑکا نصیر

ایک میز کے سامنے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔

حمید نے سوچا کہ وقت بڑے مزے میں کٹ جائے گا۔ فریدی نے اس کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ وہ اس کے ساتھ گھر پر رہے گا۔

حمید عالیہ وغیرہ کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اُسی کمرے میں لوٹ آیا جہاں نصیر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور حمید کی ہتھیلی سنبھلانے لگی۔

”آئیے آئیے.... پیارے بھائی۔“ وہ نسنے میں بڑبڑایا۔

حمید اسکے قریب بیٹھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر بوتل اٹھا کر دیکھی جو خالی تھی۔

”اور چاہئے۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”نہیں پیارے بھائی۔“ وہ رک رک کر بولا۔ ”فر.... فر.... فدائی صاحب نے کہا تھا....“

سوجاتا۔“

”واہ یار نرے اناڑی معلوم ہوتے ہو۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”سو گئے تو پھر پیٹنے کا مزہ ہی کیا۔“

نہیں اور پیو۔“

اس نے الماری سے دوسری بوتل نکالی اور میز پر رکھ دی۔

نصیر پھر پیٹنے لگا۔

”یار وہ تمہاری محبوبہ! ابھی اشرف کے کمرے میں تھی۔“

”کون عالیہ....!“ نصیر کھڑا ہو گیا۔

”ہاں....!“

”میں دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔“

”اب اس وقت جانے دو۔ وہ اس کے سر میں تیل لگا رہی ہے۔“

”خدا کی قسم مار ڈالوں گا۔“ وہ منٹھیاں بھینچ کر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

”نہیں یار بُری بات ہے۔“ حمید نے اُسے پکڑ لیا۔

”ہوگی سالی بوری بات۔ تم ہاٹ جاؤ۔“

”جانے بھی دو صبر کرو۔ واقعی تم پر ظلم ہو رہا ہے۔“

”مجھ پر ظلم۔ ہائے مجھ پر ظلم۔ پیارے بھائی۔“ وہ حمید کی گردن سے لپٹ گیا اور دھاڑیں

مار مار کر رونے لگا۔ ”ظلم.... ہائے ظلم۔“

کافی دیر تک متعدد قسم کے دلچسپ مشاغل جاری رہے تھے۔ پھر گیارہ بجے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن فریدی نے ڈاکٹر قدیر کو فون کیا اور اس سے استاد عاکی کہ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھائے۔

”آخر یہ قدر بھی کیوں نہیں آگیا۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”ڈرپوک آدمی نہیں ہے۔“ یہ فریدی کا مختصر جواب تھا۔

رات کو سب کھانے کے کمرے میں اکٹھا تھے اور ڈاکٹر قدیر کا انتظار ہو رہا تھا۔ نصیر اس وقت بھی نشے میں تھا لیکن نہ جانے کیوں فریدی کی موجودگی میں بہت زیادہ محتاط نظر آ رہا تھا۔ اگر کبھی کسی بات پر بے تحاشہ ہنستا بھی تو قہقہے کو ذرا دبائے ہوئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آواز کو زیادہ بلند ہونے سے روک رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد قدیر بھی آگیا۔ وہ پندرہ منٹ دیر سے پہنچنے پر معذرت طلب کر رہا تھا۔ کھانے کے دوران میں زیادہ تر تفریحی باتیں ہوتی رہیں۔ حمید نے لیفے شروع کر دیے تھے۔ عالیہ دل کھول کر ہنس رہی تھی اور نصیر دانت پیس رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ کبھی کبھی ڈاکٹر قدیر اور کیپٹن اشرف عالیہ سے گفتگو کرنے لگتے تھے وہ ان دونوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نصیر دوسری طرف ٹھیک اس کے سامنے تھا۔

کھانے کے بعد وہ سب تمباکو نوشی کے کمرے میں کافی کا انتظار کرنے لگے۔

ڈاکٹر قدیر نے اشرف پر حملے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ فریدی سے حملہ کا طریقہ پوچھ رہا تھا۔

”طریقہ وہی تھا جس کا اظہار میں بہت پہلے کرچکا ہوں۔ زہر کا انجکشن....!“

اشرف بے اختیار چمک پڑا۔

”آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی۔“ اس نے کہا۔

”میں آپ کو اور زیادہ خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ فریدی بولا۔ ”پھر اس نے جیب سے ایک

سریخ نکالی۔“

”یہ اشرف صاحب کی کار میں پائی گئی تھی اور ایک سرب الاثر زہر سے لبریز تھی۔“

قدیر نے ہاتھ بڑھا کر وہ سریخ فریدی کے ہاتھ سے لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

”صبر کرو.... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ حمید نے کہا اور دو تین تھکیاں دے کر اُسے چھوڑ دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر جانے لگا۔ فریدی آفس جا چکا تھا۔ اس لئے حمید مطمئن تھا۔

نصیر آگے تھا اور حمید پیچھے.... جیسے ہی وہ کارڈر کے سرے پر مڑے سامنے سے اشرف آتا دکھائی دیا اور حمید جھپٹ کر ایک کمرے میں چلا گیا۔

نصیر نے اشرف کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اشرف نے اُسے پرے جھٹک دیا۔

”یہ کیا بیہودگی۔“ وہ گرج کر بولا۔

”ہائیں یہ بیہودگی ہے.... تیل مالش ہوتی ہے.... میں صبر کروں گا.... صبر کا پھل....“

صبر کا پھل.... کیا ہوتا ہے.... پیارے بھائی۔“ اس نے حمید کو آواز دی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی۔“ اشرف اس کا گریبان پکڑ کر بولا۔ ”دوسرے کے گھر میں بھی وہی حرکتیں۔“

”یہ میرے باپ کا گھار ہے۔ ہائے.... ہائے.... تیل مالش.... تیل مالش.... بوٹ پالش.... آلو چھو لے.... آج کا تازہ اخبار.... خستہ کراری گزک۔“

”کیا بک رہے ہو۔“

”بارہ سالے کی چاٹ.... چرچرا کے ٹوٹی کھاٹ.... فرنج لے.... لے.... لپ۔“

اشرف نے بڑھ کر اس کا منہ دبا دیا۔ دونوں میں ہاتھ پائی ہونے لگی اور حمید بھی نکل آیا۔

”ذرا میری مدد کیجئے۔“ اشرف ہانپتا ہوا بولا۔ ”مجھے سخت شرمندگی ہے۔“

”سس.... سالے.... تیل مالش....!“ نصیر نے اشرف کے سر پر دو ہتھوڑے سید کر دیا۔

اشرف نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔

اشرف قابل تعریف حد تک اس کی حرکتوں کو برداشت کر رہا تھا۔ اُس نے اس دوران کوئی

ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جسے انتہائی اسپرٹ سے تعبیر کیا جاسکتا۔ اس کا انداز پند گانہ تھا۔

پھر حمید اور اشرف نے مل کر اُسے مہمان خانے کے ایک خالی کمرے میں بند کر دیا۔

حمید کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ کہیں بات بڑھ کر فریدی تک نہ جا پہنچے۔

اس لئے اس نے زیادہ چھیڑ چھاڑ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن صبح تک وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔ پچھلی رات کو

اس نے اپنے کمرے میں آکر میز کی دراز سے پستول نکالا اور جب میں ڈال لیا اور پھر تمباکو کا ایک خالی ڈبہ لے کر تمباکو نوشی کے کمرے میں لوٹ آیا اور ڈبے کو میز پر رکھتا ہوا بولا۔ ”ہاتھ کی صفائی پیٹ کے لئے۔ جو جس کے جی میں آئے تماشے کے بعد ڈبے میں ڈال دے۔ ورنہ ختی کا بول بالا اور سوم کامنہ کالا۔“

ایک بار پھر قہقہہ پڑا اور حمید فریدی کو آنکھ مار کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ خود اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور اس کی نظریں نصیر پر جمی ہوئی تھیں۔

فریدی نے ایک ذبیہ سے ایک سنگریزہ نکالا اور اسے چٹی سے پکڑ کر سب کو دکھاتا ہوا بولا۔ ”یہ آگ تو نہیں۔“

سب لوگ ہنسنے لگے۔ وہ پھر بولا۔ ”خوب غور سے دیکھ لیجئے۔“

پھر اس نے وہ سنگریزے گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کی ایک تلی سی لکیر اوپر اٹھ کر بل کھانے لگی۔

”قدیر صاحب۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”یہی وہ سنگریزہ ہے جس نے کرنل کی جان لی تھی۔ اُن کے زخم پر جلنے کا نشان تو آپ کو یاد ہی ہو گا۔“

”لیکن یہ ہے کیا بلا۔“ ڈاکٹر قدیر مضطربانہ انداز میں بولا۔

”پوائزڈوینا مچھلی کے سر کا سنگریزہ۔“

”پوائزڈوینا مچھلی۔“ اشرف نے دہرایا۔

”جی ہاں۔“ فریدی لا پرواہی سے بولا ”اور پوائزڈوینا مچھلی کے متعلق انہیں بتانے لگا۔“

اس کے بعد اس نے کرنل کے متعلق وہ داستان چھیڑی جو اُسے رفیق سے معلوم ہوئی تھی۔

”کیا آپ میں سے کسی کو اس کا علم تھا۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔۔!“ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

”کیا آج یا کل اشرف صاحب نے بھی آپ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“

قبل اسکے کہ کوئی جواب دیتا اشرف خود ہی بول پڑا۔ ”مجھے اس غپ پر یقین نہیں آیا تھا۔“

خیر بہر حال آپ نے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ یہ اچھی عادت ہے۔ میں اسے پسند کرتا

ہوں۔“ فریدی بولتا رہا۔ ”لیکن میرا پیشہ ایسا ہے کہ میں کسی بات کو سرے سے غپ ہی سمجھنے پر

فریدی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”یہ شاید میری ہی ہے۔“ قدیر نے لا پرواہی سے کہا اور سرخ فریدی کو واپس کر دی۔

سب لوگ چونک کر قدیر کو دیکھنے لگے۔ صرف فریدی کا چہرہ استعجاب کے اظہار سے عاری تھا۔

”مجھے اسی کی توقع تھی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اتنے میں کافی آگئی لیکن ان میں سے کوئی بھی کافی لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

سب کی نظریں قدیر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور اسکے چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی تھی۔

”آپ لوگ کافی پیجئے نا۔“ فریدی نے کہا۔ ”ڈاکٹر قدیر کی سرخ ہونے سے یہ بات ثابت

نہیں ہوتی کہ وہ حقیقتاً مجرم ہیں۔“

فریدی نے صرف عالیہ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھی اور وہ ڈاکٹر قدیر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مجرم نے انہیں پھنسانے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔“ اشرف

نے کہا۔

”میں تو یہی سمجھتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور پھر جھک کر کافی لانے والے نوکر کے کان میں

کچھ کہنے لگا۔ نوکر سر ہلا کر چلا گیا۔

وہ سب اپنی پیالیوں میں کافی انڈیل رہے تھے۔

”عالیہ صاحبہ نے غالباً اس گھر کو مداری کے جھولے سے تشبیہ دی تھی۔“ فریدی نوکر کے

ہاتھ سے گوشت لیتا ہوا بولا۔

”جی نہیں! میں نے حمید صاحب کا جملہ دہرایا تھا۔“ عالیہ نے مسکرا کر کہا۔

”بہر حال میں آپ لوگوں کو ایک شعبہ دکھانا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”ظہریئے۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں پیسہ اکٹھا کرنے کے لئے ڈبہ بھی لیتا آؤں۔ بڑے

بڑے صاحب لوگ موجود ہیں۔“

سب ہنسنے لگے اور حمید تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی،

لیکن اسے بہت دیر میں ہوش آیا۔ فریدی کی آنکھوں میں درندگی کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔ ”

اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وحشت خیز چمک کا کیا مطلب ہے۔

مضر نہیں ہوتا۔ ہاں تو مومبائے سے تحقیقات کرانے پر معلوم ہوا کہ وہاں اس قسم کا ایک آدمی موجود تھا۔ لیکن وہ تقریباً دس سال سے غائب ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ حقیقتاً ایک ایسا ہی عجیب و غریب جانور اپنے پاس رکھتا ہے۔“ فریدی خاموش ہو کر ان کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”مجرم بہت چالاک ہے اور زہروں کے متعلق اس کی معلومات اور استعمال کے طریقوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ مثلاً پرندوں کی موتیں۔“

”پرندوں کی موتیں۔“ سب بے اختیار چیخ پڑے۔
 ”جی ہاں.... منڈیوں کے شکل کے پتنگوں کے پروں کو زہر میں ڈبوایا گیا اور وہ پرندے انہیں کھا کر.... ہاں تو اشرف صاحب اُس پر اسرار آدمی کا وجود واہمہ نہیں تھا۔“
 ”لیکن چچا جان اس کا تذکرہ کسی سے تو کرتے۔“ اشرف ہر ایک کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا۔“ ڈاکٹر قدیر بولا۔

”پھر اس مجرم نے رفیق کو ایک کنوئیں میں قید رکھا۔“ فریدی نے کہا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر یک بیک عالیہ سے بولا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مجرم کون ہے۔“

”بھلا میں کیا جانوں۔“ عالیہ گھبرا کر بولی۔ لیکن فریدی کسی اور طرف دھیان دیئے بغیر بولا رہا۔ ”میں نے تقریباً ایک سال کا ریکارڈ چھنوا ڈالا ہے، لیکن رفیق کے بتائے ہوئے حملے کے کسی غیر ملکی کی آمد کا پتہ نہیں چلتا۔ مومبائے کی پولیس کا خیال ہے کہ وہ ایک سیلانی آدمی تھا کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔“

فریدی پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک انہیں فردا فردا گھورتے رہنے کے بعد مسکرا کر بولا۔ ”بہر حال مجھے یقین ہے کہ یہ اس کی حرکت نہیں۔ کوئی ایسا آدمی ہے جو ڈاکٹر قدیر سے خاص طور پر پُر غاش رکھتا ہے۔“

”کون ہے وہ۔ میں اس کا خون پی لوں گا۔“ نصیر ہاتھ ہلا کر چیخنے لگا۔
 ”خاموش رہو۔“ فریدی نے اُسے ڈانٹا۔ ”میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیپٹن اشرف تم سرخ کے معاملے میں دھوکا کھا گئے۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“

یک بیک کافی کی میز الٹ گئی اور اشرف اچھل کر بھاگا۔
 ”خبردار....!“ حمید نے ریوالتور نکال لیا لیکن اشرف دروازے سے نکل چکا تھا۔

عورتیں بڑی طرح چیخ رہی تھیں۔ حمید دروازے کی طرف جھپٹا۔
 ”ٹھہرو! اس کی ضرورت نہیں۔“ فریدی مسکرا کر پرسکون لہجے میں بولا۔ ”مہمانوں سے ہنگامہ مچتی نہیں کی جاتی۔“

دفعتاً باہر کتوں کے بھونکنے اور کسی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔

”اب جاؤ....!“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”ورنہ وہ اس کی بوٹیاں اڑا دیں گے۔“
 بیگم عارف فریدی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ حمید، قدیر اور نصیر باہر بھاگے۔

”مجرموں کو پکڑنا میرا فرض ہے۔“ فریدی نے بیگم عارف سے کہا اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
 تھوڑی دیر بعد وہ تینوں اشرف کو سنبالے ہوئے اندر لائے۔ اس کی کپڑے پھٹ گئے تھے۔
 چہرے پر کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ حمید نے اسے ایک آرام کرسی پر ڈال دیا۔

”یہ ایک سعادت مند بیٹا ہے۔“ فریدی تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ ”جس نے دولت کے لالچ میں باپ اور چچا کا خون کیا۔ عالیہ کو حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر قدیر کو پھنسانا چاہا۔“
 ”تم بار بار عالیہ کا نام کیوں لے رہے ہو۔“ بیگم نواز بگڑ کر بولی۔
 ”اس لئے کہ عالیہ بھی ڈاکٹر سے....!“

”فریدی صاحب۔“ ڈاکٹر جلدی سے بولا۔ لیکن فریدی اپنا جملہ پورا کئے بغیر پھر اشرف سے مخاطب ہو گیا۔

”تم نے شروع میں نصیر کو پھنسانے کی کوشش کی تھی اس لئے بیگم عارف کا رومال استعمال کیا تھا۔“

اشرف آرام کرسی پر پڑا ہانپتا رہا۔

”تم غلط کہتے ہو کہ تمہیں کرل اور اُس پر اسرار آدمی کی لڑائی کا حال معلوم تھا۔ کیا تم نے کرل کی زندگی ہی میں ان کی ڈائری نہیں چرائی تھی۔ کیا تمہیں اس ڈائری سے ان واقعات کا علم نہیں ہوا تھا۔ کل رات میں نے وہ ڈائری برآمد کر لی ہے۔ اشرف صاحب تم لوگوں کو یہاں رکھنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ میں اطمینان سے پہلی کونٹھی کی تلاشی لے سکوں۔ ڈاکٹر قدیر کا مسئلہ کلوروفارم نے حل کر دیا۔“

”کلوروفارم....!“ ڈاکٹر قدیر چونک پڑا۔

”میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو سوتے میں بیہوش کیا تھا۔ ہاں تو اشرف.... اُس ڈائری پر سے بھی آپ کی انگلیوں کے نشانات لئے گئے ہیں.... اور بتاؤں۔“ فریدی نے ایک الماری کھول کر اس میں سے جوتوں کا ایک جوڑا نکالا اور مسکرا کر بولا۔ ”اشرف صاحب کیا یہ جوتے آپ کے نہیں ہیں۔“

اشرف خاموش رہا اور فریدی تھوڑے توقف کے بعد بولا۔ ”ان میں سے ایک جوتے کی ایڑی غائب ہے اور وہ مجھے اس کنوئیں کی ایک کگار پر ملی تھی، ایسے کاموں میں زبر رسول کے جوتے مفید بھی ہوتے ہیں اور نقصان دہ بھی۔ تمہیں ان کی ایڑیوں کی مضبوطی کا اندازہ پہلے ہی لگایا چاہئے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے رفیق کو قید کر کے چھوڑ دینے کی اسکیم بنا کر اپنی انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اس طرح یقیناً پولیس چکر میں پڑ جاتی اور اس پر اسرار اجنبی کو پکڑنے کے لئے نہ جانے کہاں کہاں جال ڈالتی اور کون کون سے کنوئیں کنگھالتی لیکن تمہارے زبر رسول جوتوں کا بُرا ہوا۔ تمہیں وہ ڈائری بھی ضائع کر دینی چاہئے تھی اور آخری حماقت کم از کم میرے گھر سے دور رہ کر کرتے۔ ڈاکٹر قدیر کی سرینج ناقص استعمال کی تھی۔ اس طرح اگر اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات نہ بھی ملتے تو میں اس راستے سے ہٹ جاتا جس پر تم نے پولیس کو لگانے کی کوشش کی تھی۔ پس تم ہوس میں مارے گئے۔ جلدی میں تم نے اس کا بھی خیال نہیں رکھا کہ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات نہ پڑنے پائیں۔ بہر حال کرنل کی دولت تمہارے ہاتھ نہ لگ سکی۔ ڈاکٹر قدیر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔“

”یہ مبارک باد کا موقع نہیں۔“ ڈاکٹر قدیر گلوگیر آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”ہپ ہپ بُرا....!“ نصیر نشے میں بڑبڑایا۔

”چپ رہو۔“ بیگم عارف نے اُسے ڈانٹا۔

اور پھر کمرے پر قبرستان کی سی خاموشی مسلط ہو گئی۔

ختم شد